واجدہ تبسم کی نوکیلی، کسیلی اور چلبلی تحریروں کا افسانوی مجموعہ

واجدہ تبسم

کے 20 شاہکار افسانے

ایم عرفان علی

قوس خیال

میں ''پیش لفظ'' لکھنے سے بہت کتراتی ہوں۔ صرف اپنی پہلی کتاب ''شہر ممنوع'' میں ایک طویل مضمون اپنے حالات زندگی کے بارے میں لکھا تھا، چونکہ وہ میری پہلی کتاب تھی، اور لوگ میرے پیارے میں جاننا چاہتے تھے........ بہر حال میں نے یہ کہانیاں لوگوں کو خوش کرنے یا ناراض کرنے کے لئے نہیں لکھی ہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روشن پہلوؤں پر میں نے جو لکھا ہے وہ آنسو پونچھنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ بات سرے سے غلط ہے۔ میں صرف ایک بات جانتی ہوں کہ میں نے تو بس آئینہ دکھایا ہے۔ میں نے اپنے قلم کے ذریعہ ہمیشہ مظلوم طبقے کا ساتھ دیا ہے۔ میری توجہ کا مستحق ہمیشہ کچلا اور پسا ہوا نچلا طبقہ رہا ہے۔ وہی نچلا طبقہ جو دراصل سب سے اہم ہوتا ہے کسی بھی بلندی پر چڑھنے کے لئے سب سے پہلا قدم سب سے نچلی سیڑھی پر رکھا جاتا ہے۔ میں اس نچلی سیڑھی کی اہمیت کو جانتی اور مانتی ہوں اور میری ساری ہمدردی ان آنکھوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ جو آنسوؤں سے بھری ہوتی ہیں۔

مجھے یہ بتایا گیا ہے، یہ احساس دلایا گیا ہے کہ...... ''آج سے اگر تم ایک لفظ بھی نہ لکھو تو بھی اردو ادب تمہیں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ حیدر آبادی ماحول پر لکھی گئی یہ تمہاری کہانیاں اردو ادب میں تمہاری یاد ہمیشہ قائم رکھیں گی''۔

یہ تو لوگوں نے مجھے سنایا ہے:۔

لیکن میں آپ سے بڑے اعتماد سے یہ کہوں گی کہ اردو ادب مجھے فراموش نہیں کرپائے گا۔''

واجدہ تبسم

* * *

محبت

بیٹا گل بانو ذرا چائے کی پیالی تو دینا مجھے گل بانو چائے کی پیالی تھام کر یوں بل کھاتی، چکراتی اٹھی بانو انسان نہ ہو دھواں ہو دھواں بھی شاید اس قدر بل نہیں کھاتا۔ اماں نے لرز کر سوچا۔ اور جب گل بانو چائے کی پیالی سامنے رکھ کر چلی گئی تو اکدم اماں نے ایسا محسوس کیا جیسے ان کی آنکھوں میں واقعی دھواں بھر گیا ہو اور آنکھیں بھر سی گئی ہوں انہوں نے پھر سے گل بانو کی طرف دیکھا جو لچکتی مہکتی باورچی خانے کی طرف جارہی تھی ساڑی میں اس کا جسم کیسے کسا کسا لگ رہا تھا اور بلاؤز کیسے پھنس کر رہ گیا تھا اور کمر کمر تو اس قدر پتلی کہ اگر کوئی کوشش کرتا تو کلائی کی چوڑی اس کی کمر میں پہنائی جاسکتی تھی جو بھی کپڑا پہن لیتی یوں لگتا جیسے اب پھٹ کر ہی اترے گا جوانی تو سبھی پر آتی ہے مگر گل بانو پر جوانی یوں آئی کہ لگتا تھا اس کا جسم اپنی مار سے آپ ہی تڑخ جائے گا۔ پھٹ جائے گا۔''

حقیقت بھی یہی تھی کہ گل بانو کا جسم خطرناک حد تک خوبصورت تھا۔ اتنا خوبصورت کہ کوئی تشبیہ بھی نہ دی جاسکتی تھی چار بھائیوں کے بعد پیدا ہونے والی بہن ایسا بڑھتا جسم لے کر آئی تھی۔ کہ بڑے چاروں بھائی تو وہیں چھواروں کی طرح چرمرا کر رہ گئے تھے اور یہ چھوارے کے پیڑ کی طرح بس بڑھتی ہی چلی گئی۔ اور جب ایک حد پر رکی تو یوں رکی کہ سراپا خطرہ بن گئی جہاں خطرہ ہو لوگ اس کے آس پاس سرخ نشان لگادیا کرتے ہیں۔ یہ بذات خود سرخ نشان تھی۔ خطرے کی علامت۔ گل بانو کی صورت جو ایک بار دیکھ لیتا شائد بھول نہ پاتا۔ بیضوی چہرہ۔ چمپی رنگت کٹی کٹی آنکھیں، جیسے کسی نے کھٹی کیری کی قاشیں کاٹ کر سجادی ہوں۔ ناک ایسی تیکھی اور کھڑی کہ ذرا نتھنے اٹھا کر شوں کردے تو ساری دنیا جل کر بھسم ہو جائے۔ بال ایسے گھنیرے کہ نہا کر جب بال پیٹھ پر کھلے چھوڑ دیتی تو وہ آس پاس ادھر ادھر آگے پیچھے یوں جھول جاتے جیسے سیاہ فر کا کوٹ پہن

رکھا ہو۔ مگر بڑے تعجب کی بات تھی کہ جسم ایسا خطرناک ہتھیار اور حسن ایسی دھار دار تلوار پاس ہوتے ہوئے بھی اب تک کنواری تھی 19 تو کب کے پورے ہو چکے تھے۔ اور کوئی دن جاتا تھا کہ اب وہ بیس کی ہو جاتی۔ بیس چھوڑ پچیس کی بھی ہو جاتی تو کوئی بات نہ تھی بشرطیکہ وہ بھائیوں جیسی چھوار ہوتی۔ یہاں تو وہ عالم تھا کہ جیسے ندی نے سارے بند باڑھ توڑ دیئے تھے اور بس بہی چلی جارہی تھی۔ بہی چلی جارہی تھی۔ اماں ہول ہول کر اسے دیکھتیں۔

موا ہندوستان کیا تقسیم ہوا کہ سارے لڑکے اڑن چھو ہو گئے۔ اب تو دوانا طہ گھس کر لگانے کو بھی لڑکے نہ ملے ہیں۔ اب تو تعلیم چاہیئے ہے کہ نوکریاں کروائیں۔ پیسہ چاہیئے ہے کہ بزنس شروع کریں۔ خالی خولی صورت کو کون چاٹتا ہے

مگر خدا نے جسے بھی اتارا ہے جوڑے کے ساتھ اتارا ہے کیا چرند کیا پرند...... کیا جانور کیا حیوان کیا انسان جو بھی اس دنیا میں نر بن کر آیا ہے اپنی مادہ لایا ہے تو پھر گل بانو ہی کیوں کنواری رہ جاتی۔

محلے میں نئے کرائے دار آ کر اترے تھے ایک بڑی بی تھیں ایک ان کا بیٹا اور بس اللہ اللہ خیر سلا۔ لڑکا بے حد سیدھا سادا تھا۔ سائیکل پر سر جھکائے یوں پینڈل مارتا چلا جاتا تھا۔ مانو تلاوت ہو رہی ہے۔ جھوم جھوم کر نگاہیں نیچی، سر جھکا ہوا، کئی دفعہ بسوں موٹروں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ماں اس سے بھی زیادہ سیدھی تھیں کہ جب پہلی بار بیٹا شہر لایا اور نئے بجلی ریڈیو سے آراستہ مکان میں اتارا تو ریڈیو کو دیکھ دیکھ کر گھنٹوں اچھنبے میں رہتیں اور بھولے منہ سے پوچھتیں۔

”ائی بیٹا اتنے سے ڈبے میں آخر اتنے آدمی کیسے بیٹھ پاتے ہوں گے......“

گل بانو کے ہاں کا آنا جانا شروع ہوا کہ بڑے بھیا پردیس میں نوکری پر چڑھے ہوئے تھے واپس چھٹی پر لوٹے تو اپنے ساتھ ڈھیر ساری مٹھائیاں اور تحفے تحائف لائے اماں نے محلہ کے ہر گھر میں کچھ تو ریت ناطے اور زیادہ فخر ناطے حصے لگا لگا کر بھیجے ...... نئے کرائے داروں کے ہاں سے تھالی خالی واپس نہ آئی تھالی میں ہرے پان اور چکنی ڈلیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کہ یہی خوشیوں کا شگون ہوتا ہے کہ تھالی خالی نہ جائے...... اور اسی پر بس نہ ہوئی تو رات کو برقع اوڑھ کر خود بڑی بی مبارک باد دینے چلی آئیں۔

آئیں تو مبارکباد دینے مگر دے بیٹھیں [illegible] گل بانو بڑے بھیا کی لائی ہوئی سبز رنگ کی ساڑی پہنے پورے گھر میں اٹھلاتی پھر رہی تھیں [illegible] بلا کی لچک تھی کہ بڑی بی نے سوچا اگر ایک ناگن اور ایک گل بانو کو ساتھ ساتھ چھوڑ دیا جائے تو نامراد ناگن تو وہیں چپکی رہ جائے اور لس لس کرتی کرتی آگے ہی آگے بڑھتی جائے۔ پھر تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... آگاہ دیکھا نہ پیچھا بیٹے کی مرضی پوچھنے کا بھی کون تک تھا؟ کیا مائیں اسی دن کے لئے اولاد پیدا کرتی ہیں کہ ان کی اچھائی بھی کرنی ہو تو انہی سے پوچھ پوچھ کر کرو ماں ہونے کے ناطے کچھ ان کا حق بھی تھا نا......؟

ادھر ادھر کی غیر ضروری باتوں کے بعد انہوں نے پوچھ ہی ڈالا اے بہن میں پوچھوں ہوں کہ کیا بٹیا منگی ہوئی ہیں......“

ہوشیار بیوپاری وہی ہے جو دس سال پرانی چیز کو بھی گاہک کے روپے پر یوں پیش کرے جیسے ابھی ابھی پارسل کھلا ہو۔ انہوں نے دل ہی دل میں خوشی سے بے حال ہو کر مگر بظاہر بڑی ہی لا پرواہی سے کہا......“

اب بہن میں اپنے سے کیا کہوں بٹیا کی صورت ہی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ایسی صورت پر کون نہ مرمٹیا ایک ماں کے منہ سے، اپنی بیٹی کے لئے اس قسم کے الفاظ بڑی بی کو کچھ بھلے نہ لگے مگر وہ تو گل بانو پر سچ مچ ہی مرمٹ گئیں تھیں۔ گھبرا کر بولیں۔

”کس خوش نصیب کے نصیب جاگے ہیں“

اماں لا پرواہی سے بولیں ”ابھی تو میں نے کسی کو جواب نہیں دیا ہے۔ مگر اب اسی برسات کے بعد بیاہ دینے کا ارادہ ہے۔ ایک ہی تو بیٹی ہے، جتنے بھی دن مجھے اس کی محبت، اس کا ساتھ ملا جائے مل جائے“

بڑی بی نے اکدم ساسوں والی گفتگو شروع کر دی...... ”اے بہن آخر ایک نہ ایک دن تو بیٹیوں کو وداع کرنا ہی ہوتا ہے...... بادشاہوں نے بیٹیاں بٹھائیں، نہ پیغبروں نے۔ ہم آپ کس شمار قطار میں ہیں...... پھر وہ ذرا آگے کو کھسکیں اور شہد میں چپڑے ہوئے لہجے سے بولیں۔

میرا بیٹا سراج تو یہیں ہزار بار سڑک پر آتا جاتا ہے۔ بھائی صاحب نے تو دیکھا ہوگا...... تین سو ماہوار کماتا ہے۔ گھر میں بجلی ہے، ریڈیو ہے، گرم استری ہے (ان کا مطلب سراسر بجلی کی استری سے تھا) اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اب حکومت اسے موٹے پہیوں والی سائیکل کے لئے تین ہزار قرضہ بھی دینے والی ہے۔ اب آگے میں آپ سے کیا کہوں بہن......“

مگر اماں تو آگے بہت کچھ سننا چاہتی تھیں۔ اپنی دلی جذبات کو دباتی ہوئی پان پر چھپا چھپ چونا کتھا تھوپتی ہوئی بولیں۔ ”بہن صاحبہ“ معاف کیجئے گا...... میں آپ کا مطلب تو اب بھی نہیں

سمجھی...... ''بڑی بی نے ایک نظر گل بانو کو دلان میں سے بل کھاتے، گذرتے دیکھا...... پھر جلدی جلدی بولنے لگیں......

اوئی بہن...... کہنا سننا کیا ہے...... یہ چاند اب آپ کے آنگن میں روشنی نہ لٹائے...... میرے آنگن میں چاندنی بکھیرے تو زیادہ خوبصورت لگے......'' انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اماں کے ہاتھ تھام لئے......

پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہوں ہوں بہن...... ابھی جب آپ نے بٹیا کو گل کہہ کر پکارا تو مجھے لگا کہ جس گھر میں ایسا پھول مہکے اسے کون سے باغ بغیچوں کی ضرورت ہے...... بہن وہ گھگیائیں...... اللہ جانتا ہے......''

بیٹا بیٹی کے معاملے میں صرف محبت کو دیکھنا چاہئے...... اور میں اتنا یقین دلاتی ہوں کہ بٹیا کو ہمارے گھر سے بھرپور محبت ملے گی......''

شادی ہو کر جب وہ سسرال پہنچی ہے تو وہاں سے یہاں تک آتے آتے میں اسکے کانوں میں ریکارڈ کی طرح ہزار بار یہ جملہ سن ڈالا...... ''دلہن تو پری ہے پری......''

''سراج کی تو قسمت کھل گئی......''

لڑکے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''یار مجھے تو شبہ ہے یہ شوکیس میں سجنے والا ماڈل نہ ہو بے جان...... ورنہ یار اتنا مکمل حسن!''

''بھئی دلہنوں کی چال تو کپڑوں پھولوں گہنوں میں سمجھی نہیں پڑتی...... مگر یہ لڑکی...... کیسی چلتی ہے۔ اف جیسے دودھا گوں کو کوئی بانٹ دے کر مروڑی دے کر چھوڑ دے اور وہ بل کر کھا کھار کر اینٹھے......''

سراج نے گھونگھٹ اٹھایا اور بڑے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

''گل ایک لمحے کو کھڑی ہو جائیو ذرا...... پلیز۔ میں تمہارے حسن کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں......''

گل بانو اپنے بدن کو جھٹک کر، لال سرسراتے کپڑوں، گہنوں، پھولوں، خوشبوؤں اور لانبے لانبے بالوں کو جھٹکاتی یوں اٹھی کہ سراج چکرا کر رہ گیا۔ پھر اس نے لمبوتری آنکھوں سے یوں دیکھا کہ سراج مٹ گیا...... فنا ہو گیا...... بڑی دیر بعد وہ ہوش میں آیا...... اس کی سدا جھکی رہنے والی نگاہیں اب جھکنے اور گل پر سے ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں......۔

بڑی مشکل سے بہت ہی مشکل سے سراج نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ دھیرے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا...... میز پر دو گلاس رکھے تھے۔ دودھ سے بھرے ہوئے...... اس نے ایک اٹھا کر گل کی طرف بڑھایا اور دوسرے...... ایک ہی سانس میں خود چڑھا لیا......

گل نے انکار میں سر ہلایا اور ایسی آواز میں جیسے شیشے کے گلاس میں کانچ کے موتی بجیں...... کھنکھناتی جھنجھناتی بولی۔

''اوں ہوں...... تم پی لیو......''

ایسے پیارے گھریلو لہجے میں اس نے اتنی چھوٹی بات کہی کہ سراج اب تو زندہ رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

مرتے مرتے وہ بولا...... ''میں پی چکا ہوں......''

گل بانو نے سراج کی دنیا ہی بدل دی...... وہ خاموش خاموش سالڑکا جسے سوائے سر جھکائے جھکائے آفس جانے اور آنے کے اور کوئی کام نہ سوجھتا نہ تھا...... اب مسلسل بتجار ہتا......

گل...... واقعی تیری آنکھیں کتنی پیاری ہیں...... کیسی لمبوتری...... کیسی کیکی...... اگر دستر خوان پر اچار نہ اور صرف تو بیٹھی رہے تو تیری آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر اچار کی کمی پوری کی جا سکتی ہے......

گل کو ایسے پیارے، ایسے تعریف بھرے، ایسے لبھا لینے، ایسے نرم، ایسے محبت والے انداز میں کسی نے آج تک تو کہہ کر نہ پکارا تھا۔ کبھی ایسے دلار سے بات نہ کی تھی...... ان تمام باتوں کا جواب ہوتا تھا بس ہلکی سے مسکراہٹ جس سے سراج کی رہی سہی زندگی بھی ختم ہو جاتی...... وہ حسن کے بے پناہ احساس اور خوبصورتی کے نشے مین چور تھی۔ وہ اب صرف یہ چاہتی تھی کہ سراج اس کو پوجتا رہے اس کے حسن کے گن گاتا رہے۔

سراج کی بے پناہ تعریفوں نے اسے بھلا دیا تھا کہ وہ حسن سے ہٹ کر بھی کچھ اور ہے بیوی ہے، بہو ہے، گھر والی ہے جس کے ذمے کچھ کام ہوتے ہیں۔ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ سراج کو بس اب یہی دھن تھی کہ جیسے بھی گل کو خوبصورت سے خوبصورت چیزیں لا لا کر پہنائے اوڑھائے تا کہ وہ خوب سے خوب تر ہوتی جائے......

سراج کے آفس کے اوقات صبح ۱۰ بجے سے ۵ بجے تک تھے۔ اب وہ مزید دو گھنٹے کام کر کے ۷۵ روپے زیادہ کمانے لگا تا کہ اتنے روپوں سے وہ گل کے لئے خوبصورت صورتیاں خرید سکے۔ خوبصورت ساریاں...... چمکیلے ایرنگ...... بالیاں، نیکلس، سینٹ، پاؤڈر۔ لپ اسٹک...... جب

بھی وہ آفس سے آتا لدا پھندا آتا۔ گل بانو ایک جادو بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی اور سراج کا کوئی تولے خون بڑھ جاتا۔ مگر حقیقت اپنی جگہ یوں تھی کہ کام کے اتنے دباؤ سے اس کی صحت دن بدن گرتی جارہی تھی اور پھر غذا کا کوئی مخصوص اہتمام نہ تھا۔ اس نے یہ سوچ کر کہ گل بانو کی گل بانو کی پھول سی جوانی گرمی ارو آنچ سے کمی نہ جائے اسے چولھے چکی کے بکھیڑوں سے بالکل ہی الگ رکھا تھا۔ بس بوڑھی ماں جیسے بھی بنے پکا کر سامنے لا دھرتیں۔ نوکر دستر خوان اٹھاتا تو بولتا۔

ارے صاحب آپ نے کیا کھایا۔ سب تو ویسے کا ایسا ہے سراج ہنس کر بیوی کی طرف دیکھتا اور بولتا۔

کھانے کی ضرورت ہی کسے ہے۔ اپنی تو بھوک پیاس سب ختم ہو کر رہ گئی ہے۔

گل بانو صرف ہنس کر رہ جاتی۔ اور کبھی کبھار اس کے سدا یوں تعریف کرتے رہنے پر بڑی زخمی نگاہوں سے اسے دیکھتی اور چپ رہ جاتی۔

کام کے بار اور عشق کے پھیر میں سراج تو آدھا رہ گیا اور گل بانو جو تھی وہ پونم کا چاند بن کر جگمگانے لگی۔

ایک دن چھٹی کے روز دونوں پکچر دیکھنے کے ارادے سے تیار ہوئے۔ سراج نے گہرو ٹین کا سوٹ پہنا ٹائی لگائی۔ چم چماتا جوتا پہنا اور جب باہر نکلا تو قیامت خیز منظر پایا۔ گل بانو نے شلوار۔ لمبی سی قمیض اور چنا ہوا لگا دوپٹہ پہن رکھا تھا۔ بال سمیٹ کر اوپر جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے جو کانوں کو ڈھک کر کچھ گردن پر آتے تھے۔ اور کچھ اوپر اوپر رہتے تھے۔ قمیض جہاں تنگ تھی وہاں تو تنگ ہی تھی۔ پوچھنا ہی کیا ہے اور جہاں ڈھیلی تھی وہاں بھی کیا پوچھنا تھا سراج تباہ ہو کر بولا۔

خدا کی قسم گل...... میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ تجھ ایسی بیوی ملی۔ گل بانو بے حد ہی کم باتیں کرتی تھی۔ بولتی تھی تو اسی وقت جب ضرورت سمجھتی تھی۔ اس کی اس بات پر اس نے سراج کو دیکھا جو اپنا دبلا پتلا ڈول لئے بانس کی طرف مرجھلا مرجھلا سا لگ رہا تھا...... اور بولی۔

تم تو ہو مگر میں؟ اور خود ہی ہنس دی سراج سناٹے میں آگیا پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا...... گل...... واقعی تمھارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اکدم اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ آج پکچر کی بات گل کی طرف سے اٹھی تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح رنگ میں بھنگ ڈال کر گل

کی خوشی کرکری کردے۔

پکچر دیکھ کر دونوں لوٹ بھی آئے مگر سراج کے دل پر ایسا کاری تیر بیٹھا تھا کہ وہ ہنس نہ سکا۔ ضبط نے سرور کی شکل اختیار کرلی اور رات گئے اسے سن سنا کر بخار چڑھ گیا۔ ایک دن گیا دوسرا دن بھی گیا۔ تیسرے دن بھی بخار نہ اترا تو اماں بی بی کے مسلسل بولنے پر گل اٹھی۔ اسٹینڈ پر لٹکتی لہریے دار جارجٹ کی ساری اٹھا کر لپیٹی اور ڈاکٹر کو بلانے چل دی۔

ڈسپنسری میں مریضوں کی دھوم تھی مگر ڈاکٹر کی نگاہیں آپ ہی آپ ادھر کو اٹھ گئیں جدھر سے کہ ایک لڑکی...... لڑکی کاہے کو ناگن چلی آرہی تھی...... لچکتا بدن، لچکتی ساری، لچکتی چال۔ ڈسپنسری میں تو بھونچال ہی آگیا۔ ڈاکٹر نے بڑی شفیق اور مہربان سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

کہیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟

”جی“ وہ پریشانی کے ساتھ بولی...... میری تو نہیں ہاں میرے شوہر کی خدمت کردیں تو مہربانی آپ کی......“

کیا ہوا ہے انہیں......

”تین دن سے بخار ہے...... ٹوٹتا ہی نہیں...... اور اس نے بے چین سی نظر مریضوں پر ڈالی...... اتنا ہجوم جانے آپ کو کب چھٹکارا ملے؟

کوئی بات نہیں...... وہ جیبیں ٹٹولتا ہو کھڑا ہوا...... میں ان سبھوں سے بعد میں نپٹ لوں گا...... آپ ضرورت سے زیادہ پریشان معلوم ہو رہی ہیں...... چلئے......؟

ڈاکٹر کی کار میں بیٹھتے بیٹھتے گل بانو کو پسینہ آگیا کیا بات ہے......؟ ڈاکٹر سراسیمہ ہو کر بولا

”آپ کچھ وحشت زدہ سی لگ رہی ہیں......

اس نے بڑی سچائی سے اعتراف کیا...... جی ہمارے پاس کار نہیں ہے...... یہ پہلا اتفاق ہے کہ کسی کی کار میں بیٹھی ہوں......

اس سے کیا فرق پڑتا ہے...... ڈاکٹر مسکرایا۔ اس نے صرف دیکھنے پر اکتفا کی...... ان آنکھوں سے جن کے بارے میں سراج کہتا تھا...... اچار کی پھانکیں دستر خوان پر نہ ہوں تو بھی کام چل جاتا ہے......

ڈاکٹر شفیق احمد مریض کو دیکھ کر واپس جانے لگا تو گل بانو اسے چھوڑنے کار تک آئی...... فیس کے پندرہ روپے اس نے بڑھائے تو ڈاکٹر بولا۔

ابھی رہنے دیجئے ...... مریض کی حالت ایسی ہے کہ شائد مجھے اور بھی آنا پڑے ...... اچانک وہ بولا

''آپ کا نام ......؟'' حالانکہ غیر ضروری سوال ہے ......

''گل بانو ......''

''ہونا ہی چاہئے''

''جی ......؟'' وہ حیرت سے بولی ...... کیا کہا آپ نے ......؟

جی میں نے یہ کہا کہ اگر آپ کی اماں یہ نہ رکھتیں تو بھلا اور کیا رکھتیں ...... آپ کا نام بس گل بانو ہی ہونا چاہئے ...... اور کار تیزی سے دوڑ گئی ......

تیسرے دن ڈاکٹر شفیق اپنے آپ سے چلا آیا ...... کار رکنے کی آواز کے ساتھ گل بانو نے کھڑکی سے سر نکال ...... شفیق اپنا بیگ سنبھالتا ہوا اتر رہا تھا۔ وہ لپک کر دروازے میں آ گئی

''آپ ......''

جی ہاں میں ...... وہ ہنسا ڈاکٹر کو مریض کی جتنی فکر ہوتی ہے۔ اتنی تیمادار کو نہیں ہوتی ...... کیا خیال ہے آپ کا ......؟

گل بانو محجوب محجوب سی شرمندہ شرمندہ سی آگے آگے ہولی ...... مریض کے کمرے میں آئے تو دیکھا پلنگ پر سراج یوں پڑا تھا جیسے جان دار نہ ہو ...... شفیق آگے بڑھا۔

معاف کیجئے سراج صاحب ...... آپ کی حالت سے ایسا نہیں لگتا کہ بخار نے آپ کو زیر کیا ہے۔ صرف بخار اتنی تباہی نہیں مچا سکتا۔ کوئی اندرونی صدمہ ہے جو شائد آپ مجھ سے بتانا نہیں چاہئے ......''

گل بانو اور سراج نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دوسرے لمحے دونوں پرسکون تھے مگر سراج کہہ رہا تھا۔

نہیں ڈاکٹر اللہ کا فضل ہے کہ میری زندگی قابل رشک ہے۔ میرے آگے پیچھے آس پاس کوئی غم، کوئی دکھ، کوئی صدمہ نہیں جس کی اتنی پیاری بیوی ہو اسے غم ہو بھی کیا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ...... بس میری تمنا تو یہ ہے کہ گل بانو سکھی رہے خوش رہے۔ البتہ میں اس صدمے سے ضرور نڈھال ہوں کہ یوں پلنگ پر پڑ جانے سے میری گل بانو کو میری تیمار داری کرنی پڑ رہی ہے۔ جس کی وجہ سے اسے تکلیف ہو رہی ہو گی ...... گل بانو بڑی حیرت اور ڈاکٹر بڑے صبر سے اس کی بات سنتے رہے۔

آپ کو اپنی بیوی سے بہت محبت ہے سراج صاحب ...... ڈاکٹر ہنسا ......''

سراج نے بے چینی سے پہلو بدلا ...... آپ محبت کا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر ...... اور میں کہتا ہوں کہ مجھے وہ اتنی عزیز ہے کہ میں اس کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں ...... یہ شاعروں والی بات ہے ڈاکٹر ...... ہاں میں اپنی جان ...... اپنی خوشیاں۔ اپنا سب کچھ اسے دے سکتا ہوں۔ میں بہت خوش نصیب ہوں ڈاکٹر کہ گل بانو جیسی بیوی مجھے ملی ......

''ہاں سچ تو ہے ...... ڈاکٹر نے انجانے میں جیسے تیر چلایا سچ مچ آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ ایسی بیوی ملی۔ ہمارے ہندوستان میں مرد ہی عموماً خوش نصیب رہتا ہے کہ اچھی سے اچھی، حسین سے حسین بیوی اسے مل جاتی ہے اور عورت کے سلسلہ میں یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ اونہہ مرد کی صورت کیا دیکھنا ...... اس کی پرسنلٹی، صورت، سیرت کچھ نہیں دیکھا جاتا اس لئے کہ وہ مرد ہے۔

سراج نے جیسے درد سے بے چین ہو کر کہا ...... ڈاکٹر ...... یہاں بہت درد ہوتا ہے ڈاکٹر بہت درد ہوتا ہے ...... اس نے اپنا دل پکڑ رکھا تھا ...... ڈاکٹر تیزی سے آلہ لے کر اس پر جھک گیا۔

گل بانو ڈاکٹر کو چھوڑنے آئی تو اس نے بڑے نرم بڑے بے تکلف لہجے میں کہا۔

''واقعی مسٹر سراج بہت ہی خوش نصیب ہیں''

گل بانو نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا ...... بولی تک نہیں۔ ڈاکٹر ہنسا افوہ ...... آپ کس قدر کم سخن ہیں۔ میری تو آپ سے بہت ہی مختصر ملاقات ہے لیکن میں نے محسوس کر لیا ہے کہ آپ اپنی زبان سے بہت کم کام لیتی ہیں ...... جانے آپ نے مسٹر سراج سے اب تک کتنی باتیں کی ہوں گی ...... صرف دو چار باتیں ہی نہیں ......؟''

گل بانو نے ڈاکٹر کو بہت ہمدرد کے روپ میں پایا تو جیسے کھل اٹھی۔ دراصل میں میرا دل ان سے ملا ہی نہیں''

''ہائیں ......؟'' ڈاکٹر سچ مچ چونک اٹھا ......

ہاں ...... وہ مسکرائی ...... بقول آپ کے مرد کی صورت پرسنلٹی وغیرہ کو تھوڑا ہی دیکھا جاتا ہے ...... بس پیام آیا۔ شادی ہو گئی کیونکہ سراج کی تنخواہ تین سو تھی۔

ڈاکٹر نے بڑا منہ بنایا۔ انجانے میں تیر چلا کر بولا۔

''خیر ...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے مگر میں اپنی حد تک کہہ رہا ہوں کہ ۳ ہزار ماہانہ میری آمدنی

ہے۔ مگر پھر بھی جب تک میں یہ پتہ نہ لگوالوں کہ میری ہونے والی بیوی مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں، میں ہرگز شادی نہ کروں گا۔''

تو آپ غیر شادی شدہ ہیں......؟ گل بانو چخنے کے انداز میں بولی......

وہ ہنسا...... کیوں کیا بہت معمر لگتا ہوں......؟''

ڈاکٹر کو جیسے ہار کر بولی...... تو سراج بھی کون ینگ...... لگتے ہیں......

ڈاکٹر کو جیسے یقین نہ آیا کہ گل بانو اس حد تک آگے بڑھ سکتی ہے۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر بولا...... کاش آپ ایک آدھ بار ہی بیمار ہوئی ہوتیں اور ایک آدھ بار ہی کبھی میری ڈسپنسری آئی ہوتیں۔''

گل نے عورت بن کر پوچھا...... اس سے کیا فرق پڑ جاتا......؟''

ڈاکٹر نے جھک کر اسے دیکھا...... اور ذرا غصے سے بولا...... تم صورت سے تو اتنی نادان نہیں لگتیں گل بانو...... اور وہ تیزی سے مڑ کر کار میں گھس گیا......

وہ کمرے میں لوٹی تو سراج کی دوا کا وقت ہو چکا تھا...... اس نے بے دھیانی سے پیالی میں الٹی اور قریب آ کر بولی......

''سراج...... دوا پی لیو......''

اس کا وہ گھریلو لہجہ...... وہ اکدم گہری محبت دلا دینے والا انداز...... دوا پی لیو...... وہ تڑپ کر بولا۔

''تمھارے ہاتھ سے تو مر جانا بھی قبول ہے گل...... لاؤ میں یہ اسپرٹ بھی پی سکتا ہوں......''

وہ چونکی اور اکدم آگاہ ہوئی کہ واقعتاً بے دھیانی میں اس نے اسپرٹ کی شیشی انڈیل دی تھی جو انجکشن لگاتے وقت ڈاکٹر یوز کیا کرتا تھا......

''اوہ...... مجھے معاف کر دیو سراج...... وہ پلٹی اور دوسری پیالی انڈیلنے لگی......

گل...... سراج نے بے حد محبت سے پکارا۔

''ہوں......''

''میں تمیں تمھاری خوشی کی خاطر طلاق بھی دے سکتا ہوں...... تم ڈاکٹر سے شادی کر لو کیونکہ وہ تمہیں پسند ہے''

گل بانو اس بری طرح چونکی کہ دوا کی شیشی پیالی اور وہ خود سب کچھ ایک زوردار چیخ کے

ساتھ زمین پر آ رہا......

سراج...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو...... اس کا سینہ شدت وحشت سے اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ جس کے بارے میں سراج کہتا تھا...... خدا کی قسم گل...... تجھے ہزار بار چھو چکا ہوں پھر بھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ تیرا یہ حسن مصنوعی ہے......''

مگر سراج سطح سمندر کی طرح پر سکون تھا...... اسی ٹھنڈے انداز میں بولا......

''گل...... صرف ایک نظر محبت کی کافی ہوتی ہے۔ میری جان...... اگر غلط سمجھا ہو تو...... مگر نہیں میں سمجھ ہی نہیں سکتا...... مگر ڈر یہ ہے کہ وہ تمہیں خوش نہ رکھ سکا تو...... وہ رکا...... اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا...... گل میں نے غلط نہیں کہا ہے کہ میں تمھاری خوشی کی خاطر اپنی جان تک دے سکتا ہوں...... تم میری زندگی نہیں تو اور کیا ہو گل......؟''

دوا بہہ چکی تھی...... سارے کمرے میں کرچیاں بکھر گئی تھیں۔ گل وہیں فرش پر گھٹنوں پر سر دیئے بیٹھی تھی۔ سراج کے اس طرح کہنے پر سر اٹھا کر بے بسی سے بولی۔

''خوب بدلے لیو سراج...... خوب بدلے لیو...... آخر میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟''

ڈاکٹر روز آتا انجکشن لگاتا دوا پلانے کی تاکید کر کے چلا جاتا...... سراج کی طبیعت سنبھل گئی۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا تھی ورنہ سراج خود بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ جانے کتنے دن ابھی طبیعت سنبھلنے میں لگ جائیں۔ ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو وہ آفس بھی جانے کے لئے تیار ہو گیا...... گل بانو نے اسے روکنا چاہا...... مگر جیسے ہی وہ کپڑے پہن کر باہر نکلا، گل کے احساسات پھر سرد ہو گئے...... ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں اس کا دبلا پتلا جسم اور زیادہ ہونق لگ رہا تھا۔ بس ایسا لگ رہا تھا۔ بس ایسا لگ رہا تھا کھیتوں پر سے کوے چڑیاں اڑانے کے لئے ''ڈمی'' بنا کر کھڑی کر دی گئی ہو اور پھر اس کا اپنا جسم کہ جس میں چٹکی بھرنا بھی مشکل تھا...... تنا ہوا...... کسا ہوا کھال ایسی چکنی کہ کبھی گردن پر سے پسینہ کی بوند پھسلے تو سیدھی ٹخنی پر ہی آ کر رکے...... اس نے بمشکل پوچھا۔

ابھی سے آفس بھی جانے لگے......؟

سراج نے کوئی جواب نہ دیا...... صرف ہنس کر رہ گیا......

دوپہر میں جبکہ گھر میں کوئی بھی نہ تھا...... نوکر اپنے ساتھیوں سے گپ شپ لڑانے کہیں چلا گیا تھا۔ اماں تو مدت ہوئی بیٹی کے ہاں گئی ہوئی تھیں...... اس نے اس تنہائی کا شکریہ ادا کیا...... اپنا بکسا کھول کر سب سے جاذب نظر ساڑی نکالی...... بالوں کو ڈھیلے جوڑے کی شکل دی...... تباہ کن سنگار

کیااور گھر سے نکل پڑی......’’

ڈاکٹر آخری مریض سے بس نپٹ ہی رہا تھا کہ سامنے سے قیامت آتی نظر آئی......خوش ہوکر پوچھا۔

‘‘کہیے آپ کے مریض کے کیا حال ہیں......’’

‘‘وہ تو اچھے ہیں......اور وہ رک گئی......

آپ کا جُملہ قطعی ادھورا ہے......وہ عاشقوں کے سے انداز میں بولا۔

قطعی ادھورا نہیں ہے......وہ رکی...... ویسے جملے کا کیا ہے، اپنی زندگی ہی ادھوری ہے......

وہ جلدی سے پرس ٹٹولتی ہوئی بولی......‘‘اب تو آپ کو ایک ساتھ روپے لینے میں اعتراض نہیں......کتنے ہوئے......؟’’

‘‘بس بس ابھی رہنے دیجئے......میں کہاں بھاگا جاتا ہوں’’

گل بانو نگاہ اٹھا کر بڑے تپے ہوئے لہجے میں بولی..........’’

‘‘اور جو میں ہی بھاگ گئی تو......؟’’

ڈاکٹر ہنسا......

گل بانو کے ہاتھ سے پرس چھوٹ گیا......وہ تیزی سے کچھ بولنے کو ہوئی مگر پھر چپ رہ گئی......

‘‘برا لگ گیا......’’وہ بڑی چاپلوسی سے بولا۔

گل بانو کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا جواب دے......

ڈسپنسری خالی ہو چکی تھی۔ لیب بوائے اور کمپونڈر بھی جا چکے تھے۔ ڈاکٹر اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھا اور بہت سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔

‘‘اگر آپ کی ازدواجی زندگی واقعی ناخوشگوار ہے تو کیوں نہیں کوئی فیصلہ کر لیتیں......؟’’

گل نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن وہ کہے گیا......مسٹر سراج آپ کو طلاق دینے پر راضی ہیں اور میں......وہ رکا......اور میں آپ کو اپنانے......تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں......؟’’

‘‘نہیں نہیں......وہ چیخی’’ ایسی بات نہیں۔ مجھے یہ ڈر ہوتا ہے آپ یہ نہ سوچنے لگیں کہ میں آپ کے پیسے پر مرمٹی ہوں......’’

حمیدی

‘‘توبہ......آپ بھی کن باتوں کو لے بیٹھیں...... یہ باتیں تو بڑی نیچی ذہنیت والے سوچا کرتے ہیں۔ روپیہ پیسہ تو آنی جانی چیز ہے اصل چیز محبت ہے......آپ مجھے چاہتی ہیں، میں آپ کو چاہتا ہوں۔ بس ہمارے لئے یہی کافی ہے۔’’

‘‘مجھ میں دو قدم بھی چلنے کی سکت نہیں ہے......’’

وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی......کیا آپ مجھے اپنی کار میں گھر پہنچا دیں گے......

‘‘اپنی کار......؟’’ وہ ہنسا......‘‘وہ آپ کی کار ہے......تشریف لائیے......’’اور وہ خوشی میں جھومتا چلنے لگا۔

شام کو سراج دفتر سے آیا تو گل بانو اتنی حسین نظر آ رہی تھی کہ آج تک کبھی نہ آئی تھی سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھوں میں رچا ہوا کاجل تھا۔ کپڑے بدل کر ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ گل بانو ایک سفید کاغذ لے آئی اور بولی......

‘‘آپ اس پر یوں لکھ دیں کہ میں نے اپنی خوشی سے گل بانو کو طلاق دے دی......’’

اس کا لہجہ جذبات سے بالکل عاری تھا......

سراج نے اپنی ہمیشہ کی نرمی سے...... یوں جیسے چائے کی پیالی تھاما کرتے ہیں۔ کاغذ تھاما......قلم کھولا اور سر جھکا کر بڑی متانت اور بڑے سلجھے ہوئے نرم انداز میں لکھنے لگا......

‘‘میں سراج محمد اپنی بیوی گل بانو کو طلاق دیتا ہوں...... مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے مگر صرف اس کی خوشی کی خاطر......’’

لکھتے لکھتے پتہ نہیں سراج کو کیا ہوا......اس نے تیزی سے پن کو میز پر پٹخا......میز کو پاؤں سے دھکیلا اور لڑکھڑا کر اٹھا......اٹھ کر اپنی پوری طاقت سے گل بانو کو اٹھا کر نیچے پٹخ دیا اور تابڑ توڑ گھونسوں اور لاتوں کی بارش شروع کر دی...... ہاتھوں اور پاؤں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چلی جا رہی تھی......

‘‘کمینی عورت......میں تیری خوشی کی خاطر کیا کیا نہ کیا......اپنی جان کو جان نہ سمجھا......اپنی صحت تباہ کی......اپنی زندگی خراب کر لی تیرے پیچھے میں زن مرید کہلایا۔ لوگوں نے ہیجڑہ تک کہدیا...... تیرے لئے میں مر مٹ گیا اور اب مجھے تباہ کر کے طلاق لے رہی ہے...... لے طلاق......اور وہ ایک مشتاق کھلاڑی کی طرح گل بانو کو گیند جان کر کک پر کک لگانے لگا......

جب مارتے مارتے سراج کا دم الٹ گیا...... ہاتھ پاؤں بے دم ہو گئے تو وہ پلٹا اور دھم سے

کرسی پر گر پڑا...... اس کا سانس پھول رہا تھا۔ جسم پسینے پسینے ہو کر بھٹی کی طرح سلگ رہا تھا۔ آنکھیں ابل رہی تھیں...... مگر اب ان تمام جذبوں پر سب سے بھاری جذبہ یہ حاوی تھا کہ اس نے گل بانو کو مارا ہے...... کیونکر مارا ہے...... اور اب وہ اس سے کیسے آنکھیں چار کر سکے گا۔ اس کی پیٹھ گل بانو کی طرف تھی یہ بہت اچھا تھا۔ مگر پھر بھی گل بانو کی کراہیں...... دبی دبی سسکیاں اور آنسو پونچھنے کے ساتھ ساتھ ناک سڑکنے کی آوازیں اس کے کانوں میں سچ مچ کا جلتا جلتا تیل انڈیل رہی تھیں...... یہ بہت اچھا ہو گیا تھا کہ اب اسے گل بانو سے نظریں چار کرنے کی ضرورت بھی نہ رہ گئی تھی...... اور یہ کہ وہ اسے طلاق بھی دے چکا تھا۔ ورنہ اس ذلیل حرکت کے بعد تو وہ کبھی بھی اس سے آنکھیں چار نہ کر سکتا تھا...... اکدم اس نے محسوس کیا کہ اس کہ پیروں کو کسی ٹھنڈی ٹھنڈی چیز نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر دیکھا تو گل بانو اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے پسیجے ہوئے ہاتھوں میں اس کے پیروں کو لئے ان پر گدرے گدرے گال رگڑ رہی تھی اور سسک سسک کر کہہ رہی تھی......

"مجھے کیا پتہ کہ تم مجھ سے اس قدر محبت کرتے ہو...... آج سے پہلے تو تم نے کبھی اس محبت کا اظہار نہ کیا تھا...... اگر...... اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تم مجھے اس قدر بے پناہ چاہتے ہو تو میں کاہے کو یوں بھٹکتی......؟" وہ اس کی آنکھوں میں اپنی زخمی نین ڈبو کر بولی میں صرف تمھاری ہوں سرجو...... صرف تمھاری ہوں...... خدا کی قسم تمھاری......"

* * *

نتھ کا غرور

"اللہ انوں کچھ کرتے کیوں نئیں؟"

دلہن، خون کی طرح سرخ سرخ کپڑوں میں لپٹی لپٹائی۔ لمبے چوڑے سجے سجائے چھپر کھٹ پر سر نیہوڑائے یوں ہی بیٹھی کی بیٹھی تھی اور اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

"اللہ انوں کچھ کرتے کیوں نئیں۔" بار بار اس کا دل اس سے سوال یہ کئے جا رہا تھا۔

سہاگ رات کے بارے میں اس نے ایسی ایسی لرزہ خیز داستانیں اپنی سکھی سہیلیوں سے سن رکھی تھیں کہ خوف اور ڈر کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا جوش و خروش بھی اس کی رگ رگ میں سنسنا رہا تھا

"ایو کوئی کوئی دولہا تو لتے تکا بوٹی کر ڈالتا......" ایک بولتی......

"آئی چل ہٹ...... جیسی اس کی شادی اچ ہو کر گئی......" دوسری اپنی رائے پیش کرتی...... "نئیں وہ، اب ایسا بھی ہوتا کی انسان جنور اچ بن جائے......"

"ہو میرے کو سب مالوم ہے...... شادی نئیں ہوئی تو کیا ہوا...... صابرہ بولی تھی نئیں کی اس کے دولہے نے اس کو گالاں ہور ہونٹاں پو خوب کاٹا تھا......"

شادی سے پہلے سب سہیلیوں کی پلٹن جمع ہوتی تھی تو سر جوڑ جوڑ کر ایسی ہی بے سر و پا باتیں ہوتی تھیں...... لڑکیوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں...... ایک جن کی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ دشمن بنانے میں ماہر ہوتی ہیں۔ اپنے ہی ساتھ کی سکھی سہیلیاں جب سہاگ رات کی باتیں کرید کرید کر پوچھتی ہیں تو انمیں ایک اکڑ سی آجاتی ہے...... اب جو غیر شادی شدہ ہیں انہیں اپنے دولہے کے ساتھ گزاری راتوں اور وارداتوں کا حال کیوں بتایا جائے؟ وہ یوں ہی ٹال مٹول سے کام لیتی ہیں۔

”چل ہٹ بے شرم...... کچھ بھی نیں ہوا...... ہور تیرے کو کیا...... کنواری ہو کو ایے باتاں پوچھ رئی......“

ایسی لڑکیوں کی اپنی ساتھ کی سہلیاں ہی ان کی فوراً دشمن بن جاتی ہیں......

ایک دوسری قسم کی وہ لڑکیاں ہوتی ہیں کہ ان کی بھی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ دشمن بنانے میں زیادہ ہی ماہر ہوتی ہیں...... اپنی ساتھ کی کنواری سہیلیوں کو بنا پوچھے ہی، ایسی ایسی بائیں بتاتی ہیں کہ وہ بے چاری ترسنے لگتی ہیں اور دل میں دشمنی کی گرہیں پڑ جاتی ہیں......

”اللہ تیکو کیا بتاؤں...... انوں کے موچھیاں تھے...... مجھ آ کو پیار کرنے تو بالاں ناک میں گھسے ہور ایسی زور کی چھینک آئی کہ انوں کے امنی دروازہ ٹھوک کو پوچھنے لگے کی دولن کو سردی ہو گئی کیا؟؟......“

دیکھونا...... کتا اچھا نگوں کا جوڑا بری کے دخت چڑھاوے میں آیا تھا۔ اجاڑ ایسے ہاتھاں دبا کو میرے گھچے کی کتے سونا بائی چوڑیاں ٹوٹ گئے، ہور رنگاں بھی گوٹاں کے کدھر کے کدھر......“

”ہور تیرے کو مالوم...... ہمارا باوا جان کتا بولے کی ابھی لڑکی پڑھ رئی، گرمیاں کے چھٹیاں میں شادی دیں گے پن وہ لوگاں نیں مانے...... ہور مالوم...... سردیاں میں اچ شادی لئے...... ہور پہلی رات کو انوں ہنس ہنس کر میرے کو کیا بولے مالوم؟ بولے، گرمیاں کی شادیاں بھی اجاڑ کوئی شادیاں رہتے کی گرمی کے مارے جاناں بوکھلا دے رہے...... سردیاں میں شادیان کرے تو پاس میں گھس گھس کو سونے کا مزہ بھی آتا......“

اس کی بھی دونوں قسم کی لڑکیوں سے بیک وقت دوستی، دشمنی، دونوں تھیں جنہوں نے جان بوجھ کر چھپانا چاہا، ان سے بھی، اور جنہوں نے جان جان کر بتانا چاہا اور بتایا بھی، ان سے بھی...... بہر حال اسے پتہ چک چکا تھا کہ سہاگ رات ہوتی ہے بڑے معرکے کی چیز...... اور یہ کہ وہ زندگی میں، عورت شریف ہو تو صرف ایک ہی بار آتی ہے...... اور اس کی شرافت میں کسے شک تھا؟......

مشاطہ جب ان کے اوسط درجے کے گھر میں داخل ہوئی تھی تب ہی امنی نے اسے فوراً اندر والے کمرے میں چلے جانے کا حکم دے دیا تھا۔

حیدر آبادی مشاطاؤں میں جو خاندانی ہوتی تھیں، وہ تو گھر والیوں کی چال دیکھ کر ہی چلن کا پتہ چلا لیا کرتی تھیں اور شریف نوابوں کے لئے حق نمک ادا کرتے ہوئے واقعی شریف خون چھان

کرلاتی تھیں۔ ہاں جب کٹنیوں اور دلالہ قسم کی مشاطاؤں نے اپنے گھر بھرنے کی خاطر داس معزز پیشہ ہی کو بدنام کر دیا ہو تو الگ بات ہے...... لیکن جمیلہ بی مشاطہ نے مولوی صاحب کے گھر میں قدم رکھا تو قدم رکھتے ہی ان کی پہلی نظر تو بٹیا بی بی پر ہی پڑی تھی جو لپک جھپ، ماں کا حکم سنتے ہی اندر بھاگ گئی تھی،

وہ تب ہی جان گئی تھیں کہ لوگ شریف ہیں، ورنہ تو حیدر آباد میں مشاطہ بی کو حویلیوں میں ڈیوڑھیوں میں گھروں میں داخل ہوتے دیکھائیں کہ بیگمات نے جان جان کر بیٹوں کو کام بتانا شروع کیا ئیں...... حالانکہ گھروں میں، حویلیوں میں، نوکرایوں خواصیوں کی فوج پڑی ہے۔ لیکن مشاطہ بی کو چائے، شربت، پان تمبا کو نواب زادیاں ہی لا لا کر پیش کریں گی......

پھر مشاطہ کو زور کا زناٹا اس وقت بیٹھا جب انہوں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا......

”اپنی بی بی کو متھا برس لگا اچ ہوئیں گا اب تو...... نیئیں ماں؟......“

”کس کو...... میری شکو ماں کو...... نئیں ماں...... اب یہ سال میں اٹھارہ بھر کر انیسواں سال لگیں گا......“

پچیس پچیس برس کی عورتیں نما لڑکیوں کو پندرہ پندرہ برس کی بتانے والی مائیں بھی مشاطہ بی کی نظروں سے گزری تھیں...... انہوں نے لڑکی کا پچھانواں دیکھا تھا ہاتھ پاؤں سے گوری نظر آتی تھی...... شرافت تھی، اسکول میں پڑھ رہی تھی، گوری تھی صورت بھی اچھی ہی ہوگی...... انہوں نے اطمینان سے برقعے کے اندر سے اپنی تلے دانی نکالی...... کالا دھاگا بندھا چشمہ نکال کر آنکھوں پر چڑھایا...... کچھ سٹر پڑ کی اور ”شجرہ“ نکال کر بیگم صاحبہ کے سامنے رکھ دیا......

”آپ بولے تو میں بچے کی تصویر بھی لا کو دیوں گی...... بھوت بھی بھوت اچھا بچہ ہے، نواب لوگاں ہئیں، پن شریف بھی ہئیں...... ہو میں اس واسطے یہ بات بولی کی کوئی کوئی نواباں رانڈ رنڈنیاں رکھ کر اپنی عاجت بگاڑ ڈالے...... خانداناں تباہ کر لئے...... پن انوں ایسے نئیں...... آپ لوگاں بھی شریف، انوں بھی شریف ہو وہ میں گھروں گھر، حویلی حویلی رشتہ ڈھونڈھنے پھری سو اس کا، محنت کا پیسہ دیں گے پن میں کھوٹ کا پیسہ نئیں لیتی...... دے دیو بیٹی ایسے لوگاں پھر نئیں ملیں گے......“

اور یہی باتیں انہوں نے دولہے والوں سے بھی کہیں اور رشتہ بھی طے ہوا اور بات بھی پکی ہو گئی اور شادی بھی ہو گئی...... شکو ماں لال حویلی کی بھاگ بھری بہو بن کر سسرال آ گئیں......

لال حویلی میں جو بھی بہو قدم رنجہ فرماتی ، اسے خطاب ضرور دیا جاتا......افشاں دلہن ...... حسین دلہن...... گوری دلہن...... ہیرا دلہن...... موتی دلہن..............''

شکو ماں کے گھرانے اور خود ان کی اسی تعریفیں مشاطہ بی نے کی تھیں ، اور بعد میں ریتوں رسموں میں جانے آنے میں بھی اندازہ ہو ہی گیا کہ واقعی بے حد ہی نیک اور شریف گھرانہ ہے، اور بڑی شریف اور بے مثال بہو ملی ہے تو ، بری پاشا نے زیادہ ہی جوش ہو کر ''شرافت دلہن......'' کا خطاب، نئی دلہن کو دیا......

ڈھائی تولے کی وزنی نتھ ، جس کے بیچوں بیچ سفید سانچے پانچ موتی اور آزو بازو سرخ لاڈلیاں پڑی ہوئی تھیں، انہوں نے بہو کی ناک میں کھچ سی ڈال دی۔ دلہن کے مونہہ سے بے حد ضبط کی کوشش کے باوجود ''سی'' نکل گئی۔

''ابھی آگے تو اس سے بھی برے برے وخت آئیں گے......'' کوئی سسرال والی گھونگھٹ میں مونہہ ڈال کر بے شرمی سے، لیکن سرگوشی میں بولی......

لیکن اچھا نہ برا، کوئی وقت آ ہی چک رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی کمر درد کرنے لگی...... جسم کا جوڑ جوڑ فریاد کر رہا تھا...... شاید خدا نے اس کی سن لی تھی......

کمرے میں کچھ چلنے پھرنے کی سی آوازیں آئیں...... شاید دولہا میاں، سہرا اتار کر لٹکا رہے تھے۔ کپڑے ، جامے دار کی شیروانی ، دستار نما کلاہ ، سلیم شاہی جوتے ، سب بڑھا رہے تھے......ایک نئے تجربے سے روشناس ہونے کی گھڑی آ گئی تھی۔

دھک......دھک......دھک

وہ خود تو کیا، ایسا لگ رہا تھا کہ پورا حیدرآباد اس کے دل کی دھڑکن سن رہا ہے......

وہ آ کے اس کے چھپرکھٹ کے پاس رکے...... بیٹھے نہیں...... گھونگھٹ اٹھا کر آہستگی سے پیٹھ پر ڈال دیا...... آنکھیں کھولنے کی درخواست بھی نہیں کی...... بڑی ہمت سے رک رک کر، اٹک اٹک کر بولنے لگے......

''شرافت محل...... آپ کے ناک میں امنی حضور یہ نتھ پہنائے سو آپ کو اس کا مطلب معلوم ہے؟؟؟؟......''

وہ اپنے آپ میں بے چین سی ہوئی...... بولی کچھ نہیں...... کان بنی سنتی رہی۔

''نتھ خالی زیور نئیں ہوتا...... ہمارے لال حویلی میں جب ایک دولہن کو نتھ پہنائی جاتی ہے تو

اس کے ساتھ ساتھ سہاگ کا سارا مان، ساری عزت گویا دولہن کو سونپ دیتے...... آپ ایسا بھی سوچ سکتے کی یہ نتھ ایک طرحوں سے عزت ہور غرور کی رکھوالی کرتی......''

دلہن کا سر چکرا سا گیا...... میکے سے وداع ہوتے وقت امنی نے کہا تھا......''بی بی سسرال والے نتھ چڑھائے سو اس نتھ کی شرم رکھنا...... دکھ میں، سکھ میں، اب ہمیشہ سسرال کو اچ میکہ سمجھنا، ہور ڈولی میں بیٹھ کو جارئیں وہاں سے ڈولے میں سو کو نکلنا...... انے دولہئے میاں کی عزت سنبھالنا...... انے ڈھائی تولے کی چھوٹی سی نتھ دکھتی پن تمے اس کو نئیں خبر سمجھنا...... اس کی شرم رکھنا بیٹی...... اس کی شرم رکھے سو سمجھنا کی اپنے ماں کی شرم ہور عزت رکھے......''

''نتھ نہ ہوئی اجاڑ جی کا جنجال ہو گئی...... میکے والے اس کو بول رئے یہی اچ عزت ہور شرم ہوتی ہور دولے والے ہور دولے میاں خود بول لے رئیں کی یہ غرور ہوتی......''

''ہم کو معلوم ہے کہ ہم آپ کو یہ بتا کو کوئی بڑی خوشی نئیں دے رئے۔ مگر آپ اتے شریف ہیں ہور اب تو ہماری دولن بھی ہیں ، ہماری عزت بھی ہمارا غرور بھی، تو ہم آپ کو بھوت سچائی سے بتا رئے کی ہم آپ کے لائخ نئیں......''

اسکول کی طرف سے ایک بار وہ گولکنڈہ کا قلعہ دیکھنے گئی تھی...... شہر سے دور جا کر حیدرآبادی چٹانوں اور گول پتھروں کا سلسلہ شروع ہوا تھا...... بڑے بڑے گول گول، چٹان نما پتھر، ایک کے اوپر ایک اس قدر ادھر رکھے ہوئے کہ لگتا تھا کہ ایک دھکا لگا، یا ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور وہ دھڑ سے زمین پر......

''اللہ...... وہ آپس میں ہنس بول رہی تھیں...... کبھی اتی بڑی چٹن کسی کے سر پر آ کو پڑ گئی تو وہ مراچ جائیں گا ہلو......''

اب اسے ایسا لگا کہ ایسی ہی ایک بڑی ءچٹان نے اچانک گرا کر اسے کچل دیا ہے کیوں کہ وہ کہے ہی جا رہے تھے......

''آپ کے کیا...... ہم عورت ذات کے خابل اچ نئیں رہے...... ہم اپنی جوانی ہور زندگی غلط کاماں کر کے تباہ برباد کر ڈالے......''

''اپنی زندگی تباہ کرے بہوت اچھا کرے مگر میں کیا خصور کری تھی کی یہ سزا میرے کو دیئے......'' اس نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا لیکن لب خاموش ہی رہے۔

''آپ ہمارے ہئیں تو ہم آپ سے بتا رئے کی اتی بڑی دنیا میں یہ بات خود سوائے

ہمارے کسی کو نئیں معلم۔ ہور کسی کو معلوم ہو بی کیسے سکتی؟...... کتے اشتہاران پڑھتے رہتے ہم...... پر سوب بے کار کے باتاں ہئیں...... کسی سے فائدہ وادہ نئیں ہوتا بول کے......‘‘

اچانک اس نے تیزی سے آنکھیں کھول کر چہرہ اوپر اٹھایا......

کاجل...... مسی...... افشاں جھمکے، جھومر، سرخی، غازہ...... سب ایک طرف، اور تپے ہوئے گورے گورے جوان چہرے کی، سوکھے ہونٹوں کی پیاس ایک طرف...... آنکھیں جو زبان نہیں تھیں، لیکن زبان کی طرح بول رہی تھیں......

گورے، تپے ہوئے اور سرخ چہرے کے نیچے گوری گردن تھی...... گردن سے نیچے کرتے کی بٹن پٹی تھی جس میں سونے کے گھنگھرو لگے بٹن جھک رہے تھے، اور جب اس نے تیزی سے چہرہ اوپر اٹھایا تو بٹن چھنک اٹھے تھے اور کرتے کے اندر ایک طوفان سا مچل اٹھا تھا......

’’آپ ہم نا ایسے نظران سے مت دیکھو...... ہم واقعی آپ سے شرمندہ ہیں......‘‘

وہ تو انہیں یوں دیکھ رہی تھی کہ واقعی اس کے چہرے میں کیا ہے؟...... جسم کی خبر تو خود انہیں رہی ہوگی، لیکن چہرہ مردوں سے بدتر تھا...... اسے یا آیا مشاطہ جب ان کی تصویر پہنچا گئی تھی تو چہرے پر مونچھیں ہونے کی وجہ سے سب سہیلیاں اسے گندے گندے مذاق کر کے چھیڑ رہی تھیں۔ لیکن ایک دو نے جب جبر کر کے اس کو زبردستی تصویر دیکھنے پر مجبور کر ہی دیا تھا تو اسے تب ہی لگا تھا کہ یہ چہرہ بیمار سا کیوں لگتا ہے...... آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے کیوں ہیں......

وہ اس کے چہرے کی زبان سمجھ کر اپنے آپ سے بولنے لگے، ’’ہمارا نام وجاہت نواب ہے...... ہم واقعی وجاہت...... مردانہ وجاہت کی زندہ تصویر تھے...... آپ کو سننے میں برا ضرور لگیں گا کیوں کہ کوئی عورت، دوسری عورت کا ذکر نیں سننا چاہتی۔ مگر ہم آپ سے بتا رئے کی ہم کوئی پارسا نئیں تھے...... ایکو ایک عورت ہمارے خواب گاہ کی زینت بنی...... مگر ہمارا یہ حال کری ایک کمینی طرار رنڈی۔ اسی لال حویلی کی ایک پوٹی......‘‘

وہ نفرت سے سنتی رہی......

’’وہ بہوت ہی بہوت حرام زادی تھی...... آپ سیدھے سادے گھرانے ایک مدرس صاحب کی بیٹی...... آپ کو ڈیوڑھیاں ہور محلاں کے اندر کے باتاں کیا معلوم...... یہاں ایک اچ چھوکری اگر والد صاحب کو پسند آ گئی تو کچھ فرض نئیں پڑتا کی بیٹے صاحب بھی اس کو اچ پسند کر لئے تو...... رشتے کے ممیرے پھپھیرے بھایاں بھایاں یک اچ پوٹی سے رنگ رلیاں مناتے...... یہ بات

سوب کو آپس میں معلوم رہتی ہور وہ پوٹی کو بھی معلوم رہتا...... محل کے مرد لوگاں کیا بولتے معلوم...... کی ’’ایک نل سے کتے بھی لوگاں پیاس بجھا لے سکتے...... سو ایک چھوکری بہوت حرامی تھی...... ہمارے سوب بھایاں دوستاں اس سے گندے مذاخاں کرتے ہور وہ بھی ایسے اچ جواباں دیتی...... وہ بہوت تن درست بھی تھی...... وہ جدھر سے بھی جاتی چھوکرے پوچھتے......

’’کرتے کے اندر کیا ہے تیرے؟......‘‘

کسی کو بولتی...... ’’کرتا اٹھا کو بتا دیوں کیا، کیا ہے بول کے......‘‘

کسی کو جواب دیتی...... ’’تیرے سے میرے کو بچہ ہوئیں گا نا؟...... اس کا دودھ ہے کرتے کے اندر......‘‘

ایک دن ہم بھی شرارت کی ترنگ میں تھے۔ ہم بولے ’’اتا سارا دودھ بچے کو اچ پلا دیں گی کیا......‘‘ تو اس حرافہ نے کیا کری ہم کو کپڑے کے اپن ماندی پر لٹا لی ہور بولی، ’’چبہ اچ خالی کائے کو...... بچے کا باپ بھی پئیں گا...... ہور ایسا بول کو سچ میں ہمارے مونہہ میں دودھ گھسیڑ دی...... ہور وہ ئی اچ لمحہ ہم بے بس ہو کر رہ گئے۔!

’’اس کے بعد ہم نا نئیں معلوم انے کیا زہر ہماری جوانی میں گھولی کی ہم کسی کام کے نئیں رہ گئے...... ہماری بہادری، ہماری مردانگی کہاں چلی گئی، ہم خود حیران ہیں۔

’’ہم عورتر کے خابل اچ نئیں رہے...... بس اپنی مدد آپ کر لیتے ہور اب وہ بھی کیا......‘‘

دلہن ہانپ رہی تھی...... کانپ رہی تھی...... ’’آپ یہ سوب باتاں میری کو کائے کو سنا لے رئیں...... میں بھی آخر عورت ہوں...... میرا تو کچھ خیال کریئے آپ......‘‘

وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

وہ اسی لہجے میں کہے گئے......

’’آپ آج ایک اچ بار زندگی بھر کا رونا رو لیو، کیوں کی پھر تو آپ سوب لوگاں کے سامنے رو بھی نئیں سکیں گے......‘‘

انہوں نے ٹیبل پر سے چابیوں کا ایک وزنی گچھا اٹھا کر اس کی گود میں ڈال دیا۔

’’یہ ہماری ذاتی تجوری کے چابیاں ہیں۔ آپ نا اس محل میں سب کچھ ملیں گا...... کوئی چیز کی کمی نئیں رہیں گی۔ کمی جس چیز کی رہیں گی وہ ہم خود بتائے دیتے ہور اس لئے بتا دیئے کی ہم نا معلوم ہے کی دنیا میں کوئی بھی مرد، اگر حالات کا شکا ہو کر نامرد بن جاتا تو اپنے آپ سے بھی وہ یہ

بات چھپاتا۔ مگر ہم آپ کو اپنا ہمدرد جان کو اس لئے بتا دیئے کہ امنی حضور بابا حضور ہماری جان شادی کے واسطے کھا لئے کیوں کی انوں کو جائیداد کا وارث ہونا کتے...... دوسرے چچا تایا کے اولا واں پور اولا داں ہوتے جارئے اس واشطے ......ہم اگر چہ بولتے کی ہم نا شادی کرنا ہئی اچ نئیں تو کوئی نا سنتا...... کیوں کی شادی نئیں کرنیکے واسطے بھی کوئی نہ کوئی مخول وجہ ہونا پڑتا......اب اپنے مونہہ سے مر بھی جاتے تو یہ کیسا بول دیتی کہ ہم عورت کے خابل نئیں رہے؟ ہور اب جو اولاد ہوئیں گی اچ نئیں تو یہ خذرت کی بات سمجھی جائیں گی...... کیوں کی عورتاں میں بھی تو کوئی کوئی بانجھ رہتے نا؟ ......دلہن نے تڑپ کر چیخ ماری...... ''خدائے واسطے ایسا ایسا نکو بولو آپ......'' وہ چھپر کھٹ کی پٹی پر سر پٹخ پٹخ کر رونے لگی......وہ بے چارگی سے کہے گئے ......

''اسی واسطے ہم مشاطہ بی کو خاص طور سے جتاتے تھے کی ہم کو خود اللہ پاک نے حد دولت دیا، ہم کو خالی انگ کے جوڑے سے دولن لا دیو مگر شریف ہونا...... کیوں کی شرافت ایسی دولت ہے کی اس کا کوئی مول اچ نئیں ...... آپ کو معلوم نا یہ حیدر آباد کے مشاطہ رانڈاں کیسے کیسے اپنے دلاں سے بائیں بناتے، جھوٹ کا سچ ہور سچ کا جھوٹ بنا کو، گھر گھر گھوم کو رشتے تلاش کرتے، مگر ہم انوں کو بول دیئے تھے کہ ہم کو خالی شرافت ہونا...... پھر جب مشاطہ بی آپ کے گھر ہور خاص طور سے آپ کے امنی ......کی تعریفاں کرے تو ہم ایک دم سمجھ گئے کی شریف ماں کا خون ہے تو بیٹی بھی بے حد شریف ہوئیں گی...... ہمارے امنی حضور تو نواب خاندان میں اچ رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر محل بھرے میں ہمارا اچ حکم چلتا......بس لوگاں ہم سے خوف کھاتے......''

دلہن نے انہیں غور سے دیکھا......وہ اپنی کہے گئے...... ''اپنے حیدر آباد میں مشہور ہے کی یہاں کی کتی میں وفا ہو یا مت ہو پر بیوی میں لگی کے جیسی وفاداری ہوتی......''

انہوں نے آگے بڑھ کر کھونٹی میں ٹنگا زرتار کلاہ دستار سمیت اتارا اور اس کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیا...... ''ہم آپ سے التجا کرتے، ہمارا غرور کبھی مت توڑنا......

اس نے گھبرا کر پیر سمیٹ لئے......

''کتنا مبور ہوئیں گا یہ آدمی جو عورت کے پیر پو اپنا سر رکھ رہا ہے......اللہ نے قسمت اچ ایسی بنایا تو چلو میں بھی یہ سوچ کر چھاتی پو پتھر رکھ لیوں گی کی جیسے میری شادی اچ نئیں ہوئی......جیسی اماں باوا کے یہاں رہتی تھی ویسی یہاں...... کنواری اچ سمجھتی رہوں گی خود کو......''

لیکن سوچ لینا اور بات ہے اور سہن کر لینا قطعی اور...... جب نئی نئی شادی ہوتی ہے تو مہندی،

اگر، عود، عطر پھول اور مسالوں سے ہٹ کر خود لڑکی اپنے آپ میں خوشبو دینے لگتی ہے، اور اپنے ہی تن بدن سے پھوٹری ہوئی جوانی کی یہ مہک، ہرن کی طرح خود کو پاگل پاگل بنا دیتی ہے......ایسے میں بدن کی رگیں ایسا کسا دا مانگتی ہیں کہ چٹختے بدن کو جو کچکچا کر رکھ دے......اور یہی سب کچھ نئی نویلی دلہن پر گزر رہی تھی۔

پھر لال حویلی درجن بھر بیاہی ان بیاہی چچیری، تائری، ممیری، پھپھیری بہنیں بھاوجیں...... دیورانیوں، جٹھانیوں میں تو ویسے ہی جتنی دشمنی، اتنی ہی دوستی......اپنے اپنے میاؤں کی باتوں کے دفتر کھول کر جب سب بیٹھیں تو شرافت دلہن کی خود ساختہ شرافت کی دھجیاں بکھیرنے کو آجاتیں......

آئے دن کسی بچے کی بسم اللہ ہو رہی ہے، کسی کی ختنہ کی تقریب ہے، کسی کی سالگرہ کا دھوم دھڑکا ہے تو کسی کا چھلہ......کوئی بھی تقریب پو، محل والیوں کو تو سنگھار پٹار کا موقع اللہ دے......ایک سرے سے بس ہی دلہن بن جائیں اور ساس د کو پہننے اوڑھے بعد سلام کرنے جانا تو محل کا دستور ہی تھا......

''اللہ سدا سہاگن رہو...... گود بھر کو بچے دیو......'' یہ دعا سنتے ہی شرافت دلہن کا کلیجہ ہل جاتا...... یہ لمبا سارا دستر خوان بچھتا تو امنی حضور، کھٹی میٹھی چٹنیاں اور اچار دلہن کے سامنے سرکو اتیں......

''ائی اس کے سامنے رکھو جی......شرم کے مارے مونہہ سے کیسا تو بھی منگیں گے انے......''

وہ دستر خوان پر چاتے لرزنے لگی تھی۔

نمازوں کی عورتوں کی صف، لال حویلی کی مسجد میں سب سے پیچھے لگتی تھی......اتنی بڑی حویلی تھی، دل بھی بڑا تھا، پیسہ بھی خدا نے خوب دیا تھا، نام بھی تو سخاوت یا جنگ تھا وجاہت نواب کے باپ کا...... مسجد حویلی کے اندر ہی بنوا رکھی تھی، جہاں پانچ وقت موذن اذان دیتا اور پابندی سے نمازیں ہوتیں۔ نمازوں سے شرافت دلہن غائب ہوتیں تو ساس کے جی کو پنکھے لگ جاتے۔

''ائی دولن کی اس مہینے کی نماز بھی قضا ہو گئی؟......''

شادنگر میں بھی سخاوت یار جنگ کی بے حساب، زمینات تھیں......وجاہت نواب اکثر موضع پر ہی رہتے......امنی حضور چڑ چڑ کر بیٹے کو سناتیں......

''اب دولن کے پاکی کے دن آرئیں......اب تمے پھر موضع کو گئے تو دیکھو ذرا......اگے مہینے

کے بعد تو ابست کر کے اللہ کھیتی ہری کرتا......"

لیکن مہینوں پہ مہینے نکلتے گئے اور شرافت دلہن کی گود سونی کی سونی ہی رہی۔

جب بھی موضع پر سے وجاہت نواب آتے، پوری لال حویلی میں ہنگامہ مچ جاتا...... نوکر لرز رہے ہیں...... نوکرانیاں ڈر کے مارے کونوں میں چھپ رہی ہیں...... چچیاں، تائیاں، بھائی بہنیں مونہہ چھپاتے پھر رہے ہیں......

یہ حویلی کی کب سے صفائی نئیں ہوئی......" وہ خواہ مخواہ جالے تلاش کرتے......

"موتیا کے پھولاں اتنے کم کیوں کھلے...... مالی کدھر مر گئے......" گھوڑوں کی مالش کرتے کیا نئیں کم بختے سائیں لوگاں...... کتے مریل ہو گئے......"

"راہ داری کا خالین کتا میلا ہو گیا...... ابا حضور کے کتے ملنے جلنے والے آتے...... کیا سوچیں گے لوگاں؟......"

"خوانہ سرا حرام کے روٹیاں توڑتا کیا...... فانوساں پو کتیگر د جم گئی......"

چلا چلا کے وہ اپنا گلا بٹھا لیتے...... بس اب سے تھر تھر کانپتے...... صرف شرافت دلہن سمجھتی تھیں یہ سب پردہ ہے۔...... ڈھکوسلہ ہے...... اپنے ہاتھوں جوانی گنوائی تھی۔ لیکن اس وقت تو وہ مجبور تھے...... وہ بھی مجبور تھیں...... لیکن انہیں اس مجبوری میں پوری لال حویلی کے مکینوں کا بے پنا پیار میسر آیا تھا...... نوکران پر جان چھڑکتے...... مالک تو خیر تھے ہی فدا...... ان کی ذرا سی تکلیف پر ماما بی سے لے کر خواصوں تک، خواصوں سے لے کر انا بی تک، انا بی سے لے کر مغلانی اماں تک، اور مغلانی اماں سے لے کر خواجہ سرا تک سب تڑپ اٹھے......

اس دن بھی وہ وجاہت نواب کے موضع پر چلے جانے کے بعد سر کے درد سے بے حال پڑی تھیں تو خواجہ سرا فانوس جلانے ان کے کمرے میں آیا......

"دولن پاشا میں سر دبا دیوں؟......"

یہ کبھی چوڑی محمود بی اب کے سرہانے کھڑی پیار سے پوچھ رہی تھی۔

انہوں نے تکلیف میں بھی مسکر کر کہا......

"شبراتین، چنبیلی، صنوبر، کیاری، مہندی۔ گلشن ایک چھوڑ دس سر دبانے والیاں ہیں...... تو جا اپنے چراغوں میں تیل ڈال۔"

"وہ تو میں روز اچ کرتی...... پن آپ ایسا پڑ گئے تو اچھا نئیں دکھ را...... دبا دی ذرا سا تو میرا

کیا کام بڑھ جائیں گا...... آپ کو تو آرام آجائیں گا......"

انہوں نے اپنے ڈھیر سارے بالوں کا جوڑا کھول دیا۔ بال سیاہ آبشار کی طرح چھپر کھٹ سے فرش تک پھیل گئے......

"آئی ماں دولن پاشا...... بالاں گلے ہئیں بول کے بھی سر دکھ را ہوئیں گا......"

خوانہ سرا نے دونوں ہاتھوں سے انکے بالوں کا گیلا پن محسوس کر کے کہا......" میں ٹوکری میں عود دان ہور گر بڑیاں دال کو لاتی ہور دھواں دیتی ابھی سوکھ جاتے بول کے......"

"رہئے دیو محمود بی اپنے دل کا خود کا دھواں بہوت کافی ہے......"

خواجہ سرا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی ان کی پیشانی پر رکھ کر ذرا بوجھ دے کر دبائی ہی تھی کہ وہ ایک دم ہڑبڑا گئیں...... کیسا مضبوط ہاتھ تھا یہ!!

"محمود بی......" انہوں نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا، "تمہے خواجہ سرا ہوتے؟......"

خواجہ سرا سہم کر اٹھ کھڑا ہوا......

"دولن پاشا...... آپ پڑھے لکھے سو بی ہمیں اس لئے بولتاؤں کسی کو آج تک یہ بات نئیں ہولا نئیں تو مارا جاؤں گا...... میں اچھا خاصا مرہوں پاشا، پن اس پیٹ کی خاطر یہ ڈھونگ رچا کر بیٹھا...... لال حویلی میں تنخواہ، کھان سوب بہوت بھی بہوت ملتا پاشا...... ہو اپر سے انعاماں، عید سنخر عید پولین دین......"

"ہور یہ عورت ذات کا بھیس بدل کو رہتے وے تم نا ذرا سی شرم بھی نئیں آتی؟......"

اس نے ندامت سے سر جھکا لیا......

"شادی ہو گئی تمہاری......"

"ابھی کاں سے پاشا......" وہ ذرا شرما کر بولا، "ابھی گھر میں میرے سے چھوٹیت ہئیں پن دو جوان بہناہئیں...... امنی کو بول کے رکھا ہوں۔ پلے انوں کے شادیاں کروں گا، پھر اپنی...... امنی کو مالوم نئیں پاشا میں یہاں خویلی میں ایسے رذیل کاماں کرتاؤں بول کے...... گھر کو جاتے وخت میں چوڑی دار پیجامہ، ململ کا کرتا ہور سلیم شاہی جوتی پہن لیتا پاشا......"

انہوں نے اس کے لمبے چوڑے قد بت کو دیکھا اور ایک بے حد ہی واہیات سا خیال ان کے ذہین مین رینگ گیا......" پیجامے، ململ کے کرتے اور جوتوں کے بغیر تو انے ہور بھی اھا لگتا ہوئیں گا......"

''لال حویلی سے تم نا شرافت دلہن کا خطاب ملا ہے......'' ان کے دل نے انہیں سمجھایا......

وہ توبہ استغفار کر کے کروٹ ہو گئیں......

''تو جا...... میرے کو اب نیند آرئی......''

یہ سب کچھ کبھی نہ ہوگا، ہرگز نہ ہوگا، لیکن اب جب کہ ان کی شادی کو دو سال گذر چکے تھے۔ اور ان کے بعد ہونے والی دو شادیوں نے پھل دینے شروع کر دیئے تھے...... ماں بے چاری بہر حال ماں تھیں...... بیٹے کی اولاد دیکھنے کے ارمان میں ختم ہوئی جا رہی تھیں۔ اس لئے اپنی جیٹھانی اور ان کے بال بچوں میں بیٹھ کر غم سے بولیں......

''آئی دیکھو نا ماں...... وجاہت پاشا کے بعد تمہارے شوکت پاشا اور رضا پاشا کی شادیاں ہوئے...... دونوں باپ بن گئے...... بس میرے وجاہت پاشا کے نصیب میں اچ اولا کا سکھ نئیں......''

''تو دوسری بہو بیاہ کو لے آؤں؟...... اولا کے واسطے تو لوگاں چار چار چھ چھ بھی کر ڈالتے......'' امنی حضور بے حد کھلے دل سے بولیں...... ''اب ایسا تھوڑی ہے کہ اللہ نہ کرے دولت کی کوئی کمی ہے...... میرا بیٹا پچاس بھی بیویاں کرا تو پیسے کی کمتی نئیں پڑنے والی......''

''تو کر دیو بسم اللہ......'' جٹھانی بولیں......

''بس آکری بار یہ مہینہ ہور دیکھ لیتوں...... پھر مئیں تو عصمت یار جنگ کی پوتی کو کر کے لالیتوں...... پہلے بھی میرا دل وہیں اچ تھا......''

''ائی تو وہ اب سوکن پو کائے کو دیں گے......''

''ائی بول دیں گے اصلی بیگم پاشا انوں رہیں گے۔ یہ انے پہلی والی بچے کھلا کو ڈخت کالیں گی......''

سر سر سر سر آگ کے شعلے اس کے تن بدن سے اٹھنے لگے۔ وہ دوسرے ہی کمرے میں چھت کی کڑیاں گنتی ہوئی پڑی تھی...... اتنی بڑی حویلی، اتنے نوکر چاکر، بال نہ بچہ، میاں دیکھو سو سدا موضع پر...... سوائے چھپر کھٹ پر لیٹے رہنے اور کڑھتے رہنے کے کام ہی کیا تھا؟؟...... ساری باتیں اس نے اپنے کانوں سے سنیں......

''شرافت دلہن......'' انہوں نے اپنے آپ کو سنایا...... ''تم کتے بھی گنہ گار سہی...... خدا اس سے بھی بڑا رحم کرنے والا ہے...... تم گناہ کرتے کرتے تھک بھی گئے تو بھی اللہ رحم کرتے کرتے

نئیں تھکتا......''

عشاء کی نماز کے بعد انہوں نے کیاری کو بلوا بھیجا...... ''خوانہ سرا اپنے گھر نئیں گیا ہوئیں گا تو اس کو جا کے بول میں بلا رئی......''

محمود حیران سا، ناوقت کی طلبی پر اندر چلا آیا...... وہ اپنے لمبے چوڑے چھپر کھٹ پر پڑے پڑے بولیں...... ''محمود آج فانوس میں تیل ڈال دے......''

محمود بی نے چھت پر لگے جگر مگر کرتے فانوسوں کو دیکھا جو کھلا پڑا تھا...... اس نے دولن پاشا پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر، پیچھے قدم قدم چل کر، بغیر مڑے دروازے کے کھٹکے کو ایک جھٹکے سے بند کیا اور چیتے کی سی تیزی سے اچھل کر ''دولن پاشا'' کے چھپر کھٹ میں کود گیا......

صبح گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سے شرافت دلہن کو پتہ چل گیا کہ وجاہت نواب زمینات پر سے لوٹ آئے ہیں۔ بستر آج سے زیادہ پیارا نہیں کبھی نہ لگا تھا...... رضائی، گدا، تکئے چادر...... سب ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ کبھی وہ رضائی سے لپٹیں...... کبھی گدے کو خود پر لپیٹنے کی کوشش کرتیں...... کبھی تکیوں پر اوندھ جاتیں کبھی تکیوں کو خود پر رکھ کر دبائیں۔ اور چادر نے تو زندگی میں جیسے بہادروں کے پھول بھکیر دیئے تھے...... ویسے وہ ہمشہ وجاہت نواب کے آنے کی ہلچل سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ جاتی تھیں لیکن آج ان کا دل بستر چھوڑنے کا نہیں ہو رہا تھا...... پھر بھی انہیں وجاہت نواب کے آنے سے بڑی خوشی ملی......

''بڑے اچھے موضعے سے آئے......''

نوکرانیوں کی فوج ہونے کے باوجود انہوں نے طے کیا کہ ''اپنی چادر آج میں خود اچ دھوؤں گی......''

اس بار وجاہت نواب جو موضع پر گئے تھے تو پورے دس ماہ بعد آئے۔

خط پتر تو وہ لکھتے ہی نہیں تھے، ہاں خادموں کی زبانی حویلی کے حالات، کسی کی بیماری، کسی کی موت، کسی کی شادی، کوئی تقریب، سب حال احوال معلوم ہو جاتا تھا......

اب کی بار خاص خادم حیدرآباد سے موضع واپس پلٹا تو شرما شرما کر مگر ادب سے بولا......

''نباب پاشا...... سوا سو روپے کی سونے کی زنجیر لیوں گا آپ سے۔''

وہ اپنے گھوڑے کی مالش کا معائنہ کر رہے تھے، بے خیالی میں ہولے:

''لے لینا......'' پھر اچانک چونکے...... ''مگر کائے کو رے بٹے......''

”اگے سرکار...... چھوٹے سرکار پیدا ہوئے بول کے......“

انہوں نے چکرا کر خادم کو دیکھا، پھر تیزی سے سائیس کے ہاتھوں سے گھوڑا اچھینا اور پھر جور کے بیچ [illegible] لال حویلی میں......

یہاں تو وہ دھوم دھام تھی کہ ان کی شادی پر بھی کیا ہوئی ہوگی...... ماں کی دعائیں سمیٹتے، چچیوں، تائیوں، بہنوں کی بلائیں جھیلتے ہوا اپنے کمرے میں پہنچے تو شرافت دولہن بے حد مامتا بھرے فخر سے اپنے بیٹھے کو دودھ پلا رہی تھیں......

”ذرا دروازہ بیند کرلیونا آپ......“ انہوں نے بے حد اپنائیت سے کہا ”بچے کو دودھ پلاریوں، کسی کی بھی نظر پڑی تو نظر لگ جائیں گے......“

”یہ؟...... وہ اپنی گود میں پڑے بچے کی طرف اشارہ کرکے بولیں...... ”انے آپ کا بچہ ہے......“

وہ دانت پیسنے ہوئے آگے بڑھے...... لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا......

”ذرا صبر سے کام لیو آپ...... میں خوب سمجھاتیوں آپ کو...... میرا نام شکو...... شاکرہ تھا، صابرہ بھی ہوسکتا تھا، زاہدہ بھی، شکر کرلیتی، صبر کرلیتی، زہد کرلیتی، آپ کے واسطے سوب کرلیتی، کیوں کہ آپ بولے تھے نا کی نتھ ایک طرحوں سے عزت ہور غرور کی رکھوالی کرتی...... ہور یہ بھی بولے تھے کہ اس عزت کو سنبھال کر رکھنا اب میرا اچ کام کیوں کی میں ”شرافت محل“ کا خطاب آپ کے حویلی سے پائی......

”پھر ادھر ادھر اماں باوا بھی بولے تھے کہ نتھ کی شرم رکھنا، سو یہ نتھ غرور ہور شرم کے بوجھ سے اتی بھی اتی وزنی ہوگئی کی میں اچ لچک کو رہ گئی...... پھر بھی میں آپ کے غرور کی رکھولی کرتی رہی......

”پن اب کیا ہوا آپ کو نئیں معلوم...... امنی حضور بولے کی میں بانجھ ہوں سو دوسری بہو بھی کرکولاتے...... اب آپ اچ سوچو آپ اپنا اتا بڑا راز میرے حوالے کرے، خالی یہ سوچ کو کی میں شریف ہوں، اب آپ یہ بھی سوچو کی اگر دوسری آنے والی آجاتی تو وہ آپ کے جیسی نواب گھرانے کی رہتی...... وہ کائے کو آپ سے دبتی یا آپ کی بات مانتی، جیسا میں مانی...... وہ تو دوسرے اچ دن ساورں میں بومابوم کریتی کہ آپ ویسے ہیں...... پھر بولو آپ کی کیا عزت رہ جاتی، کسی جگہ، کسی محفل میں آپ مونہ دکھانے کے خابل نہ رہ جاتے...... ہور پھر آپ کو اولاد نہ ہوتی تو سارا مال جائیداد تیرے میرے کو بھک میں چلا جاتا...... یہ سوب تو ہوا سو ہوا...... ایک بات ہور بولوں کیا؟؟؟؟...... آپ تو دنیا کے سوب مزے لوٹ کو بیٹھے، پھر ہتھیلی سے اپنی شادی رچالئے...... میں کون سا خصور کری تھی کی اتنی لمبی سزا ملی...... بی بی حوا گندم کا دانہ کھائے تھے...... میں بھی کھائے...... جنت سے نکالے گئے پر یہ نیا کیا کم جنت ہے...... میرے کو بھی اگر آپ اپنی جنت سے نکالے دیئے تو باہر کی دنیا جنت سے اب کم نئیں لگیں گی میرے کو...... مگر میرے کو معلوم ہے آپ ایسا نئیں کریں گے۔ کیوں کہ اگر آپ میرے کو نکال دیئے تو امنی حضور پھر آپ کو دوسری شادی کرنے کو بولیں گے، ہور. یسا آپ دیکھو تو میں آپ کا اچ غرور سنبھال کو رکھنے کو یہ سب کری..........“

اور انہوں نے بڑی ادا سے ناک سکوڑ کر وجاہت نواب کو دیکھا...... تیکھی سی ناک میں ڈھائی تولے کی نتھ جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔

نواب وجاہت کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس غرور کو اس طرح سنبھالے رکھنے پر شرافت دلہن کی لاتوں اور گھونسوں سے تواضع کریں یا انہیں شاباشی دیں......“

◆

نصیبے والی

نواب صاحب خط پڑھ کر بے حد خوش ہو رہے تھے۔

''……سلطان میاں حویلی والا مخدمہ ہار گئے۔ بی پاشا اپنے میاں پر جو پاندان کے خرچے کا دعویٰ دائر کئے تھے، وہ انوں جیت لئے۔ اس واسطے اج کل انوں بے حد خوش ہیَں۔ ہزار روپے مہینے کے حساب سے جوڑو تو سمجھو کی اب انوں اپنے میاں کی پوری جائیداد ہی ہتھیا لئے جیسا کہ ہیَں …… ہور میں آپ کو لکھی تھی کہ نئیں …… (اجاڑ دماغ پو مٹی پڑ کو جاؤ، یاد چ نئیں رہتا کی پہلے خط میں کیا لکھی تھی کیا نئیں۔ اس واسطے کبھی ایک بات دو دفعہ لکھ دیا کروں تو آپ ہنسی نکو اڑایا کرو) …… کی مبارک بیگم کو اٹھ لڑکیوں کے بعد خداوند تعالیٰ لڑکا بھی عنایت فرما دیئے۔ چھٹی کی دعوت ہم سوب کو بھی آئی تھی …… میں ہاتھوں کو سونے کے کڑے دی، بس …… پوچھو نکو کتی ہنسی ہوئی۔ سب بولنے لگے کی اب تو بیٹا ہوا۔ اب تو تم سے کم کڑے چوڑیاں مت دینا تھا۔ مگر میں بولی سونے کی ہتھکڑی خوش نصیباں وہی پہنتے۔ ایک مزے کی بات آپ کو بتانا بھول چ گئی …… آٹھ بیٹیاں ہونے سے مبارک بیگم اب لڑکی خبر کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ ٹیبل پو پڑے پڑے انوں ڈاکٹرنی سے پوچھتے بھی نئیں تھے کی میرے کو کیا ہوا …… خود ہی بول لیتے تھے۔ ''اونہہ لڑکچ ہوئی ہوئیں گی ……'' اسی مارے ابھی ابھی نئیں پوچھے، جب ڈاکٹرنی خود اٹھا کو بتائی کہ لڑکا ہوا ہے تو انوں دو گھنٹہ کی زچہ اٹھ کو کھڑے ہو گئیں۔ پھر ڈاکٹرنی خود پکڑ کو لٹا دی ……''

ایسا مزے کا خط تھا اور یہ تیسری بار تھی کہ خدمت گار کھنکار کھنکار کر انہیں مخاطب کرنے کی جرات کر چکا تھا۔ مگر وہ بری طرح خط میں الجھے ہوئے تھے …… ''آپ کو شاید یہ بات پتہ چلی کی نئیں کی ممانی اماں کی چھوٹی بیٹی کی نسبت طے ہو گئی …… ''اللہ اپنے کو خود اتا نوازا کی کسی کا دیا لیا آنکھوں میں نہیں بھرتا، پر سمدھیانے والے پیروں میں سونے کے سوا سیر کے پازیباں لائے تو

یہاں سب پٹاپٹ دیدے مارنے لگے …… میں تو ہلو اٹھ کو گرمی کے بہانے آنگن میں چلی گئی …… اب یہ نکو پوچھو کی کیوں …… ایک بات ہور لکھنے کی رہ گئی۔ میں ایسا سنی کہ بڑے چچا اپنی کنواری بیٹی کو ڈاکٹرنی بنانے کے واسطے حیدرآباد بھیج دیئے۔ کیسا خراب زمانہ آ گیا مولیٰ۔ اب ذرا سوچو انے کنواری چھوکری کتے برے برے باتاں شادی سے پہلے اچ دیکھ لیں گی …… خیر اپنے کو کیا …… ہور تو گاؤں میں سب خدا کا فضل ہے، کتے فصلاں اب کی خوب بہار پو ہیں۔ خاص طور سے چاول، پھلی، دھان تو خوب پھلا ہے میں تو بھوت دناں ہوئے ڈیوڑھی سے باہر خدم بھی نئیں نکالی۔ گھٹیا کے مارے جان عذاب میں۔ ہے اجاڑ۔ آپ کیسے ہیں، لکھنا۔ ہور یہ بھی لکھنا کی آپ کو میرا یہ ''روزنامہ اخبار'' پسند آیا کی نئیں …………''

آپ کی تابعدار
بیگم صاحبہ''

یہ بڑے مزے کی بات تھی کہ تابع دار لکھنے کے باوجود بڑی نوابن ہمیشہ خود کو بیگم صاحبہ لکھتیں۔ نواب اپنی ان بیگم کی تحریر کے دیوانے تھے …… ہنسی سے ان کے خط کو ''اخبار'' کہا کرتے تھے کہ دنیا جہاں، بھرے خاندان کی خبریں ان کے خط سے مل جایا کرتی تھیں۔ وہ بے چاری کوئی ایسی بوڑھی نہیں ہوئی تھیں، یہی پینتیس، چالیس کے پیٹے میں تھیں لیکن گھٹیا نے مار رکھا تھا …… انھوں نے اپنی بیماری کی وجہ سے گاؤں آباد کر لیا تھا اور نواب کو کھلی چھٹی دے گئی تھیں، یہی ساتویں تک تعلیم پائی تھی۔ اس تعلیم کا بدلہ اب یوں چکا رہی تھیں کہ مار خط پہ خط پورے خاندان میں دوڑائے جاتیں۔ نواب صاحب تو کہتے کہ شراب کا نشہ ایک طرف اور بڑی بیگم کے خطوں کا سرور ایک طرف۔ جب بھی گاؤں سے ان کا خط آتا وہ بار بار پڑھتے اور لطف اٹھاتے۔ مگر آج …… کم بخت پھر کھنکارا۔

انہوں نے سر گھما کر غصے سے دیکھا اور کہا …… ''یہ کیا نامعقولیت ہے؟'' مگر گردن گھماتے ہی جیسے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ لمبی قطار سوکھے مارے قحط زدہ کسانوں کی …… خیر قطار کو مارو گولی۔ قطار کے کونے پر کوئی اٹھارہ سال کی جوان اور بھرپور فصل لہلہا رہی تھی۔ سچ مچ کے گیہوں کا چمکتا رنگ، نئی کوری صراحی کی طرح سنسناتا بدن کہ جس پر پانی کا پہلا چھینٹا گرے تو سن سن بولنے لگے۔ کمر ایسی کہ کروٹ سے لیٹے تو جسم میں ایسا گڑھا بیچ میں پڑ جائے جیسے اس میں چوڑی بھی ڈھیلی خلخیل ہو جائے گی اور کم بخت کے بال …… ساری زندگی حیدرآباد میں گزری، عمر بھر دیکھتے

رہے، یہ مامائیں، اصلیں ......خواصیں، کنیزیں، چاول کے ساتھ املی کا کھٹا ‘‘کٹ’’ کھا کر عمر گزارنے والی مخلوق کٹ پکاتے سمے، جو املی کے پھوک بچ رہے تھے اسی میں گیہوں کا تھوڑا آٹا ملا کر لئی جیسی ‘‘اٹکل’’ بنا لی اور سر میں تھوپ کر نہا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہی ان کا شیمپو ٹھیرا اور اسی نامراد شیمپو سے کیا جھکا جھول بال بڑھے تھے۔ مگر یہ بھی تو انہیں میں کی ایک نظر آ رہی تھی اور اس کا شیمپو بھی یہی املی کے پھوک کا ‘‘اٹکل’’ رہا ہوگا۔ لیکن یہ بال تھے کہ چڑھتی ندی ...... ماتھے سے شروع ہوئی تو سیدھی ایڑیوں تک جا اتری۔ تیل سے بیگانہ، الجھے ہوئے، خاک دھول میں اٹے، مگر اف ! اف ! سرد موسم کے باوجود انہیں اس قدر شدید گرمی لگنے لگی کہ وہ پنکھا پنکھا چلا اٹھے۔ خدمت گار نے ہڑ بڑا کر فرشی جھالر دار پنکھے کی زرکار ڈور تھام لی...... دھیرے دھیرے ان کے حواس واپس آنا شروع ہوئے۔ حوصلہ پا کر خدمت گار نے عرض کی۔ ‘‘حضور کی خدمت میں مختار صاحب حاضر ہونے کو پوچھ رئیں......’’

مختار عام اپنی سنہری کلاہ سر پر جماتے ہوئے برآمد ہوئے اور بے حد شائستگی سے، آواز کو اس قدر سریلا بنا کر کہ زنخوں کی سی ڈھب آ گئی ...... سر جھکائے جھکائے بولے ...... ‘‘ہر سال کی طرح اس سال بھی ویگن بھر کر قحط زدہ ...... کاشتکار حضور کے در پہ مالی امداد کے بھروسے آئے ہیں......’’

نواب صاحب نے ذرا کی ذرا سر اٹھا کر نگاہ ملا کر دیکھا۔ مونہہ سے کچھ بولے نہیں، مطلب یہ تھا کہ بیان جاری رہے اور بیان جاری رہا۔

‘‘ان میں چند ایک تو حضور کے دولت کدے پر سال بھر غلامی کے عوض صرف پیٹ بھر کھانے اور تن بھر کپڑے کے طلب گار ہئیں اور چند......’’

‘‘ہور چند......’’ نواب صاحب نے اچانک بات کاٹ دی۔

‘‘اور چند زمینات چاہتے ہیں، بہت ہلکی شرائط پر......’’

تنی ہوئی گردن ایک ‘‘ہم’’ کے ساتھ نیچے جھک گئی۔ تین بار چٹکی بجی اور مطلع صاف ہو گیا ......اب وہاں صرف مختار عام رہ گئے تھے جو شائستگی کی حدود کو اس قدر شدت سے پہنچ چکے تھے کہ دوہرے ہو کر رہ گئے تھے۔

‘‘زمینات مانگنے والوں کو زمینات دے دیجئے’’

‘‘بہتر...... !’’

‘‘اور حفت ایک بات بتائیے۔’’

‘‘جی سرکار۔’’

‘‘سال بھر غلامی کرنے والوں میں عورتاں زیادہ ہئیں یا مرد ؟’’

‘‘جی حضور، عورتیں تعداد میں بڑھ کر ہیں۔’’ مختار عام نفیس لکھنوی لہجے میں فرما رہے تھے، لیکن چند خواتین اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ہیں۔’’

ایک لمحے کے توقف کے بعد نواب صاحب نے پوچھا۔ ‘‘اور وہ جو کوری صراحی کی طرح سنسنا رہی تھی، کیا وہ اپنے کمہار کے ساتھ آئی ہے؟’’ لیکن یہ جملہ مختار عام نے نہیں سنا۔ کیونکہ یہ جملہ دراصل صرف حضور کے ذہن نے سوچا تھا۔ زبان سے ادا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لئے اونچی آواز سے انہوں نے پوچھا۔ ‘‘اور وہ گندی سی چھوکری جس کے لٹوریاں اس کے ایڑیوں کو چھو رہے ہیں......انے ؟’’

مختار عام کجلجے لہجے میں گھگیائے۔ ‘‘حضور خادم کو ابھی اتنی تفصیل معلوم نہیں ہے، اجازت ہو تو یہاں بلوا لوں ؟’’

تھوڑی دیر میں بھاری پردہ اٹھا اور بجلی سی لہرا کر رہ گئی۔ پھر ایک پیلے سوکھے مارے چوبیس پچیس سال کے مرد نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا اور دوہرا کر سلام کیا۔ لڑکی کھس کھس کر کے ہنسنے لگی۔ مرد نے دھیرے سے اسے ڈانٹ کر پوچھا ؟ ‘‘تو نے سلام کری گے ؟’’

وہ بے باکی سے بولی ‘‘میں کائے کو کروں؟ کیا میرے کو انام ملا کی جھک جھک کو سلام ٹھونکوں ؟’’ پھر کھن کھناتی ہنسی کے ساتھ بولی۔

‘‘چپ کے چپ !’’

مرد ڈر کے مارے ساری جان سے پیلا پڑ گیا۔ مگر نواب کی یہ شوخی لے ڈوبی ...... مسکرا کر بولے۔ ‘‘انعام بھی مل جائے گا......’’ اور جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے اسے کھا ڈالا۔

تفصیل سن کر نواب صاحب کو پتہ چلا کہ دھان کی فصل کی کٹائی کے بعد روز مزدوری کرنے والوں کی ‘‘کھیپ کی کھیپ’’ جو ہر سال بیکار ہو کر اضلاع سے حیدرآباد دکن کا رخ کرتی ہے، ان ہی میں یہ جوڑا بھی آیا ہے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو نصیبوں سے فصل اچھی ہو یا بری، سدا قحط زدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔

مرد اب اس بات کا طلبگار تھا کہ چھوٹی موٹی زمین کا ایک ٹکڑا اسے گاؤں میں نواب بدر یار جنگ کی جاگیر سے عطا کر دیا جائے اور چونکہ زیور گہنا رہن رکھنے کے لئے کچھ پاس ہے نہیں، اس

لئے زمین کے عوض سال بھر کے لئے اس کی جورو کو غلامی میں لے لیا جائے یعنی محل میں اس سے جھاڑو لگوائی جائے یا پودوں میں پانی ڈلوایا جائے، یا چاول کٹوائے جائیں یا مرچ مسالہ پسوایا جائے۔ سال بھر کی آمدنی سے پھر وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرے گا۔

نواب صاحب نے ذرا اچھنبے سے پوچھا...... ''میاں خالی زمین کا ٹکڑا لے کو تم چاٹیں گے کیا......؟''

''جی نہیں حضور۔'' وہ ہاتھ ملتا ہوا بولا۔ میں ترکاریاں بولیوں گا...... حضور کو شاید نہیں معلوم کہ بھنڈی کی فصل بہت جلدی جلدی اترتی......''

''ایک شکل یہ بھی ہوسکتی تا کہ دونوں مرد جورو ادھرچ کوئی کام کرلیو۔''

وہ معذرت کے لہجے میں بولا ''نہیں حضور مرد آدمی ہو۔ کبھی ایسا گھر دار کا کام میں نہیں کرا، کی روٹیاں تھوپ بیٹھا، یا مرچی کوٹ لیتا بیٹھا۔ میرے کو تو سرکار باہر کے کام اچ اچھے لگتے۔ ہور سرکار اصل بات یہ کی عمر بھر سے کھیتوں میں کام کرنے کی عادت پڑی وی ہے۔''

بیچ میں وہ پٹاخہ بول پڑی ''مرد ذات گھر کے اندر کاماں کریں گا تو کیسا لگیں گا؟'' اور ساتھ ہی کھس کھس کے کرکے زور زور سے ہنسنے بھی لگی۔ سرکار مرد وے تو دھڑم دھس کاماں کرتے اچ بھلے لگتے......'' اور اس نے بڑے غرور اور پیار سے اپنے مرد کی طرف دیکھا۔ اچانک اس کے لہجے میں غم سمٹ آیا۔ ابھی تھوڑے وناں پہلے دیکھتے سرکار اس کو...... ایسا موٹا کٹا تھا کہ پوچھو نکو۔ شیر چیتا ڈر کو پیچھے ہٹ جانا، پن انے نہیں ہٹنا۔ اب کھانے کو نہیں تو کیسا سوکا پڑ گیا۔''

مرد کے کاٹو تو بدن میں شاید دو چار قطرے خون نکل پاتے...... جو محفلوں اونچی جگہوں پر جانے آنے کا ذرا عادی ہو تہذیب آداب سے بھی کچھ واقف ہو۔ وہ تو کئی بڑی بڑی ڈیوڑھیوں، حویلیوں میں آیا تھا، اسی لئے اسے پتہ تھا کہ صدر دروازے سے داخل ہوئے بعد آنکھوں کا کام صرف زمین دیکھتے رہنا ہے...... اس کم بخت نے کبھی ایسی جگہ قدم رکھا ہی نہیں تو جانتی بھی کیسے کہ بڑے لوگوں سے بات کرنے کے بھی چند آداب ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ اپنے ساتھ کام کرنے والیوں کی طرح نواب حضور کو سمجھ لیا اور لگی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے...... مگر اس وقت تو اس کی اتنی ہمت بھی نہیں ہو پا رہی تھی کہ اسے ٹوک ہی دیتا۔ لیکن اس کے خدشات کے برخلاف نواب صاحب اس پٹاخہ کی باتوں سے بے حد محفوظ ہو رہے تھے۔

''سرکار آپ ہمنا اتا بڑا زمین کا تکڑا دیو کی ہمارے سارے دلدراں دور ہو جانا۔ اجاڑ دہ

برساں شادی کو ہوئے ایک سکھ بھی نہیں دیکھی۔'' پھر ایک ہاتھ سے اپنے گھور گھنگور بال جھلا کر جھلا جھٹ سے بولی۔ مہینہ بھر بھر تو سر کو تیل نصیب نہیں ہوتا۔''

اب کی مرد بھی تاؤ کھا گیا۔ ''پاؤ بھر تیل تو ایک دفعے میں اس کے سر کو ہونا سرکار۔ اتی دفعے بولا کی اتے بالاں رکھ کو کیا کرتی۔ کاٹ ڈال، کاٹ ڈال، سنتی بھی تو نہیں۔''

وہ ناک چڑھا کر بولی ''عورت کو پالے جتنا حوصلہ نہیں تھا تو شادی کائے کو کیا رے کنجڑے......؟'' اور ایک دم ہنس پڑی۔ مرد بھی ہنسنے لگا۔ نواب صاحب کے لئے یہ سب کچھ بڑا انوکھا، بڑا عجیب، بڑا حسین سا تجربہ تھا...... ان کی ساری زندگی بری طرح مصروفیات کا شکار تھی۔ زمین، کورٹ کچہری، مقدمے، اپنے پرایوں کے جھگڑے...... دوسری طرف دعوتیں، پارٹیاں، خاطر مدارت، رت جگے، رات گئے تک مجرے، طوائفیں، ناچ گانے۔ بڑی بیگم گاؤں بسائے بیٹھی تھیں...... اس کے بعد دو تین شادیاں منہ کا مزہ بدلنے کو کیں...... جو اچھی شکل نظر پر پڑی اسے داشتہ رکھ لیا۔ سارا ''حرم'' پٹا پڑا تھا۔ یہ پیار محبت، یہ نوک جھونک جو ازل سے ابد تک کے لئے خدا نے مرد عورت کو خوش ہوکر ودیعت کی ہوگی، اس کا ان کی زندگی میں دور دور پتہ نشان نہ تھا۔ ایک عجیب و غریب خواہش نے ان کے سینے میں سر سرا ابھارا...... اس تن تنائی جوانی کی نوک جھوک کا شکار **اگر میں ہوں جاؤں تو......؟''**

''**تم اپنا نام ہمیں بتائے اب تک۔**'' انہوں نے لڑکی سے اچانک سوال کر ڈالا۔

''**چھجو۔**'' وہ بڑے فخر سے بولی۔

''چھجو......؟ نواب صاحب حیرت سے بولے۔ یہ کوئی نام ہوا بھئی۔

مرد حوصلہ پا کر بولا۔ سرکار اس کا نام تو شہزادی ہے۔ سب لوگاں پیار سے بگاڑ کو چھجو کر دیئے

''سوب نہیں۔ ایکلا (اکیلا) تو اچ بگاڑا......'' وہ پھر لڑائی مول لینے پر تل گئی......

مرد کے چہرے پر وہ پیار بھری خجالت چھا گئی، جو صرف ایک مرد کو ہی جچتی ہے...... جیسے زیر ہو کر بولا...... ''سرکار آپ اس کی باتاں پو کان نکو دیو۔''

(کان میں دینا بھی نہیں چاہتا، کیونکہ میں دل دے چکا ہوں) نواب صاحب نے ہڑبڑا کر مختار عالم سے کہا ''دل شاد پور کی نہری پانی والی زمین کا وہ بڑا کھیت...... کیا نام ہے میاں تمہارا؟''

''جی سرکار......عزیز۔''

’’ہاں، انوں عزیز میاں کو دلوا دیو، بیج وغیرہ کے واسطے اوپر سے سو روپے بھی دلوا دیو ……‘‘

عزیز بے ہوش ہوتے بچا۔ لیکن اگر اسے پتہ ہوتا کہ نواب بدر یار جنگ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر وہ جانتا کہ ان کے پرکھوں نے کبھی کسی سائل کو سفید دھات یعنی چاندی تک خیرات میں نہ دی …… جب دیا سونے کا سکہ ہی دیا، تو شاید اسے اتنی حیرت نہ ہوئی۔ ہر سال کی طرح امسال بھی جتنے گاؤں اور اضلاع سے دیہاتی آئے تھے دیوڑھی میں کھپ گئے۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی، بچے بھی۔ مردوں میں سے کوئی خان ساماں کی مدد کو لگ گیا۔ کسی نے جھاڑ فانوس کی صفائی اپنا لی …… جتنی بڑی دیوڑھی اتنے ہی پھیلے ہوئے کام۔ عورتیں میں سے کچھ پاشا لوگوں اور صاحب زادیوں کے ذاتی کاموں پر لگائی گئیں …… چند باورچی خانوں میں، مسالے مرچ، سبزی، ترکاری بنانے پر جٹ گئیں …… کوئی نواب صاحب کا حقہ بھرنے پر، کوئی ان کے پیر دبانے پر، کوئی انہیں جگانے پر، کوئی سلانے پر مامور ہوئی۔ جاموں کی طرح سب کی سب گردش میں آگئیں ……

لیکن شہزادی نہ تو ساقی بنی نہ جام …… نواب صاحب نے زنانخانے میں حکم بھجوا دیا تھا کہ شہزادی عرف چھجو نام کی ایک لڑکی کا کسی سے متعلق نی کیا جائے …… وہ کھاتی پیتی، مزے میں دنداتی ساری دیوڑھی میں ہرنی بنی پھرتی ……

سر سر کرتے اتنے سارے دن نکل گئے۔ نواب صاحب کن حالات کو پہنچ گئے۔ کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ بڑی نوابن کے لمبے لمبے اخبار نما خط آتے پڑے سڑتے رہتے۔ وہ انہیں چھو کر بھی نہ دیکھتے۔ مجرے …… رت جگے، ناچ گانوں کی محفلوں جیسے سب ساتھ چھوڑ گئیں …… بس جان بوجھ کر خود کو کاموں میں غرق کئے رہتے …… زنانے میں بھی کم ہی جاتے …… اتنے دن بعد ایک بار کسی کام سے گئے، بیچ کا دروازہ اندر سے بند تھا، اس لئے نوکر خانے سے ہوتے ہوئے گئے …… سامنے ’’پرچھتی‘‘ میں شہزادی کھڑی نہا کر بال سکھا رہی تھی، انہیں ایسا لگا کہ ان آنکھوں کی بینائی زائل ہو جائے گی …… جسم سچ مچ کانچ بن کر، جھل جھلا رہا تھا کم بخت کا۔ بالوں میں وہ سیاہی پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے اپنے نصیب کی سیاہی بھی ماند تھی …… پیٹ بھر کھانا، کام نہ فکر، کھلی ہوا۔ وہ روپ نکھرا تھا کہ تنا ہوا گوشت آپی آپ تڑ تڑ بول رہا تھا۔ وہ جیسے بغیر کسی بندش کے خود کو ازمائے کا رہے تھے …… ابھی نہیں …… ابھی نہیں ……‘‘

……………………………………

چھٹے مہینے عزیز آیا …… کوئی دیکھتا تو نہ پہچان پاتا کہ یہ وہی چھ ماہ پہلے کا سوکھا مارا سڑیل چوزہ ہے، جواب یوں اصل مرغ کی طرح سینے کو تانے اکڑا اکڑا پھرتا ہے۔ وہ اور چھجو دونوں آزاد پونڈوں کی طرح جونچ میں جونچ ڈالے اس حوض کی منڈیر پر بیٹھے پہلیں کر رہے تھے، جو نواب صاحب کی خواب گاہ کے نیچے والے باغ میں تھا۔

تو کتا خوبصورت ہو گیا رے۔ چھجو بے حد بے تکلفی سے بولی۔

’’ہور تو تو سونے چاندی کے جیسی جھل جھلا رہی …… ہاتھ لگانے کو ڈر لگ را کی میلی ہو جائیں گی۔‘‘

وہ انگوٹھا دکھا کر ہنسی …… ’’ہور جیسا میں تیرے کو ہاتھ لگانے ای تو دیوں گی نا …… وہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔

عزیز نے اسے لپک کر گود میں بھر لیا، اری تیرا مرد ہوں کتی۔

اور …… یہ سب …… نواب صاحب نے کھڑکی میں سے دیکھا …… مرد …… مرد …… مرد ……

جس پھل کے پکنے کا وہ خود انتظار کر رہے تھے، ایسا پک جائے …… اتنا پک جائے کہ ٹپ سے جھولی میں گر پڑے، وہ کسی اور کی جھولی میں بھی تو گر سکتا ہے، پھر کیا کریں؟

’’مرا دیں؟ مزہ نہیں

’’زہر کھلوا دیں؟‘‘ یہ کوئی کارنامہ نہ ہوا۔

’’کہیں پھنکوا دیں؟ کوئی نئی بات نہیں۔

پھر …… مرد …… مرد …… اس مرد کو آخر کیا کریں۔

ایک خوف ناک منصوبہ ان کے ذہن میں ابھرا …… تالی بجا کر خدمت گار کو بلایا …… خدمت گار مختار عالم کو بلا لایا …… مختار عالم کو حکم ہوا …… ’’جراح کو بلوائے ……‘‘

جراح آگیا تو پوچھا …… کبھی کسی بکرے کو آپ کسی بکری کے ناخابل کئے ہیں؟‘‘

جراح تیور دیکھ کر کچھ سمجھ گیا …… ہاتھ جوڑ کر بولا …… حضور ری عمر اسی میں گزاری ہے ……‘‘

مگر اتا یا ر رکھو کی جان نی جانے پائے،

’’بہت بہتر حضور۔

مختارِ عام کو کھڑکی کے پاس بلوا کر عزیز کا چہرہ دکھایا ......اور تاکید کی ......سب کا کام اس پہرے میں ہور راز داری سے کرنا۔......

جراح الٹے پیر سر جھکائے واپس ہو گیا ......

تین ہفتے بعد نواب صاحب بہ نفسِ نفیس نوکر خانے میں تشریف لے گئے۔ عزیز کے ’’غسل صحت‘‘ کا حکم صادر فرمایا۔ بڑی مغلانی کو بلوا کر ہدایت کی کہ ایک کمرہ میں چنبیلی، موگرہ، موتیا، گلاب اور خوشبوؤں سے بسا دیا جائے۔ کچے اگر اور لوبان کے پیالے بھر بھر جلائے جائیں۔ شہزادی کے لئے سرخ رنگ کا کام دار جوڑا تیار کرایا جائے اور اسے دولہنوں کا سا روپ سنگھار دینے کے بعد عزیز کو ایک دولہا کی طرح اس کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔

ہر کام حسب حکم عالی انجام دیا گیا......لیکن دوسری صبح کمرے کا دروازہ جب باہر والوں نے پیٹ پیٹ کر توڑ کر کھولا تو عزیز سرخ کام دار دوپٹے کو گلے میں باندھے چھت سے لٹکا ہوا تھا اور دولہن بنی شہزادی بے ہوش پڑی ہوئی تھی......

ابھی نہیں......ابھی نہیں......دراصل وقت ابھی تک بھی نہیں آیا تھا۔ ہر کام مذہب اور شریعت کی رو سے ہونا چاہیئے......اس لئے عدت کی مدت ختم ہونے کا مزید انتظار کیا جائے۔ ایک نہ دو پورے تین ماہ دس دن......یعنی لگ بھگ کوئی چار مہینے......آخر خدا کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔

چوتھے مہینے کے خاتمے پر......‘‘

ساری ڈیوڑھی میں نئے سرے سے قلعی کرائی گئی ......ملازموں کی نئی پوشاکیں بنیں ......خواصوں، ماماؤں، کنیزوں کو ایک ایک نئے جوڑے کے ساتھ ایک ایک تولہ سونے کا زیور انعام دیا گیا۔ پوری ڈیوڑھی میں چراغاں کیا گیا۔ قالین، پردے، فرنیچر بدلے گئے۔ نواب صاحب کا کمرہ جگ مگ کرنے لگا۔ دروازوں پر سانچے موتیوں کی لڑیوں کے پردے لٹکائے گئے ......چھتوں پر جگر مگر کم خواب کی چھت گیریاں ٹانگی گئیں۔ ایسے قالین فرش پر بچھائے گئے کہ پاؤں گھٹنوں تک دھنس جائیں......مالیوں اور پھلاریوں کو حکم ہوا کہ ایسے سہرے اور بدھیاں گوندھیں کہ سارا حیدر آباد خوشبو سے مہک اٹھے۔ باورچیوں کو دعوت عام کے لئے منہ مانگی جنس دی گئی۔ ہزاروں سیر اصلی گھی، بریانی، متنجن، پلاؤ، میٹھوں میں انڈیلا جانے لگا......ڈیوڑھی کے کنوؤں میں کئی سو تھیلے شکر ڈالی گئی کہ پانی شربت کی طرح میٹھا ہو جائے اور لوگ پانی کی بجائے شربت پی پی کر دعائیں دیں۔ اور یہ سب اس لئے ہو رہا تھا کہ نواب صاحب ایک باندی کو اپنانے جا رہے تھے......یہ ساری تیاریاں اور ہنگامے اور چونچلے اس لئے تھے کہ نواب صاحب کو آج تک زندگی میں کوئی شکل اس شدت سے نہیں بھائی تھی۔

ادھر ڈیوڑھی کے زنان خانے میں کئی کئی مغلانیاں بیک وقت ایک شہزادی پر جتی ہوئی تھیں۔ خالص شمامۃ العنبر، حنا اور گلاب کے عطر سے اس کے بدن کی مالش ہو رہی تھی۔ لمبے لمبے بالوں کو مٹی کی سوراخ ہنڈیاں میں لوبان اور عود سے چٹختے انگاروں کے دھوئیں میں بسایا جا رہا تھا۔ شہزادی کے لئے جو جوڑا اسلا تھا اس میں سچے یاقوت ٹانکے گئے تھے اور مانگ میں بھرنے کے لئے جو افشاں بنائی گئی وہ تولہ بھر سچے ہیروں کو پیس کر تیار کی گئی تھی۔

رات چڑھی تو پیاس بھی بڑھی......‘‘

پھر کوئی رات کے دس، گیارہ بجے نواب صاحب بغیر نکاح، بغیر گواہوں، بغیر وکیل، بغیر مہر، بغیر کسی پابندی کے دُلہن کی خوابگاہ میں داخل ہو گئے کہ اس خداوند تعالیٰ نے، جس نے یہ دنیا، یہ مرد زن بنائے ہیں، اسی نے صاحب حیثیت مردوں پر باندیاں، لونڈیاں بھی حلال کر دی ہیں۔

اندر صحن گھی سے تر تراتی بریانی کھاتے ہوئے مالن، تمبولن سے بولی......‘‘

’’اجاڑ ماری کیا نصیبے والی ہے سچ مچ شہزادی بن گئی......‘‘

* * *

نولکھا ہار

پچھلی رات کو...... ''رت جگا''...... تھا اور اب اسی لئے سارے میں سوتا پڑا ہوا تھا۔ بیبیاں، باندیاں سب پاؤں پسارے، کھلے ڈھکے سے بے خبر ساں ساں سوئی پڑی تھیں۔ بس ایک دولہن پاشا کی آنکھیں تھیں کہ نیند سے دشمنی مول لئے بیٹھی تھیں۔

سجے دالان میں چھالیہ کترتی کوئی بی بی نوکرانیوں پر چلائیں...... ''اگے چھنالاں، کب تک سوئیں گیاں۔ رات کو مہندی ساچق آنے والی ہے کہ نہیں۔ دولہے والوں کے استقبال کی کوئی فکر چ نہیں مال زادیوں کو''...... اور وہ کھٹا کھٹ سروتا چلانے لگیں۔

سونے والیوں میں ذرا بھی تو ہلچل پیدا نہ ہوئیں۔ دولہن پاشا نے نرم سی آواز میں پوچھا ''مغلانی اماں، بی بی تارا کے دوپٹوں پو لچکا تو ٹنک گیا با؟......''

''وہ تو ٹنک گیا پاشا، پن نہ پوٹیاں اٹھیں گے تو ہور بھی ہزار کاماں کرنے کو پڑے، سو وہ تو مر کو گیاں۔'' وہ ذرا رک کر بولیں، پن پاشا آپ تو ذرا بھی نیند نئیں لئے ایسے سے صحت خراب ہو جائیں گی۔ آپ جا کر ذرا تو آرام کر لیو۔''

دولہن پاشا چپ رہی تو مغلانی اماں ذرا دکھ بھرے لہجے میں بولیں۔

ہو ماں، بیٹی بیاہنا بھی کوئی معمولی کام تو ہے نئیں۔ اجاڑ دل کیسا بھاری ہو جاتا کی پہاڑ بن جاتا۔ بیاہے سو مصیبت، نئیں بیاہے سو مصیبت۔''

دولہن پاشا اک کرب ناک ہنس ہنسیں...... نہیں مغلانی اماں میری صحت کو کچھ بھی نہیں ہونے والا...... میں اچھا خاصا تو سوئی...... پوری نیند لے کر اٹھی ہوں......

پوری نیند؟ اس مفید جھوٹ پر انہیں خود ہنسی آ گئی۔ ان کی نیند تو آج سے نہیں اس گھڑی سے ہی ان سے ہی روٹھ گئی تھی، جس رات وہ بیاہ کر اس وسیع و فریض حویلی میں آئی تھیں...... کیسی جگمگاتی رات تھی وہ بھی، یہاں سے وہاں تک چراغاں ہی چراغاں...... پہلی بیٹی اور اکلوتی بیٹی۔ بیٹے تو تین تین تھے۔ اصل ارمان اور ٹھاٹ باٹ تو بیٹی ہی کی شادی میں ابا حضور کو نکالنے تھے۔ رات کو دن بنتے تو بہنوں کی شادیوں میں دیکھا ہوگا، مگر دولہن پاشا کی شادی میں رات جو دن بنی تو کئی ہفتے تک دن ہی دن بنی رہی۔ نہ جہیز کا کوئی حساب تھا نہ اوپری دین لین کا...... کہنے والے کہتے ہیں کہ ایک بیٹی کی شادی میں بڑے نواب نے اتنا اٹھایا کہ حیدرآباد کی ساری بیٹیوں کی شادی کی جا سکتی ہیں۔ اور داماد بھی کیا چن کر ڈھونڈا تھا کہ دیکھو تو بس دیکھتے رہ جاؤ۔

سر پر ستار کلاہ، جامے اور چم چماتی شیروانی اور رول دار اطلس کا جھم جھماتا پنڈلیوں پر کسا ہوا پاجامہ پہنے، سر سے ٹخنوں تک جھولتا سہرا باندھے جب وہ دولہن کو گود میں اٹھانے آئے ہیں تو ساری محفل ہکا بکا رہ گئی، جیسے کسی کلی کو اٹھا رہے ہیں، ایسی ہی آسانی س ء انہوں نے دولہن پاشا کو گود میں اٹھا لیا۔ کسی میراثن نے پتے کی بات سنائی...... اے بی، مرد اور پان تو کرارے ہی اچھے لگتے ہیں۔ دیکھو تو کیا مزے سے کوٹے میں بھر لیا۔''

مگر وہ ایک ہی رات کی بات تھی جب دولہا میاں نے اپنی نئی نویلی دولہن کو کوٹے میں بھرا ہوگا۔ نصیبوں کا حال اوپر والے کو معلوم، دولہن پاشا کہ جن کا اصل نام اشرفی بانو تھا، اشرفی یوں کہلائی کہ بچپن میں سونے کی طرح دمکتی تھیں۔ پیار سے ماں باپ نے اشرفی اشرفی پکارا تو نام ہی اشرفی پڑ گیا۔ جوانی آئی تو کندن بن بیٹھیں۔ سنہرا سنہرا رنگ، حیدرآباد کی عام لڑکیوں کی طرح...... بلکہ اس سے بھی سوا لمبے گھیرے بال، جھلمل کٹوروں کی طرح بادامی آنکھیں۔ بھلے کو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ حویلی کی ریت ہی یہ تھی کہ لڑکیاں نگاہیں نیچی رکھیں۔ ورنہ جس طرف نظر اٹھتی کشتوں کے پشتے لگ جاتے اور اوپر سے قوسوں اور محرابوں کی رعنائیاں، کیا قیامت تھی کہ ہے ہے! پھر حویلی کا ایک جان لیوا چلن یہ تھا کہ لڑکیاں ان دنوں اندر، کرتوں کے اندر محرم وحرم کچھ بھی نہیں پہنا کرتی تھیں، جو ہے بس سامنے ہی ہے۔ ایسی آنچیں دیتی جوانی کہ سردیوں کی ایک رات لڑکیوں کو یاد ہی رہ گئی۔ جب مار سردی پڑ رہی تھی اور نوکر خانے سے گل بدن نے انگیٹھی لانے میں دیر کر دی تو سب لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا اللہ اب سردی کا کیا رونا ہے جی، انے اشرفی کی طرف ہاتھاں کو آگ تاپ یو...... سوب لوگاں گرم ہو جائیں گے......''

ایسی انگیٹھی بدل جوانی تھی اور حشر یہ ہوا کہ جہیز میں پیش بندھی جو دی گئی، وہ خوب کے اضلاع کی تازہ تازہ رکھی گئی، ایک مار پٹاخہ لمبارن، یعنی بنجارن چھوکری تھی۔ ایسی تو کئی جہیز میں دی گئی تھیں لیکن ہم عمری کے ناطے اصل کام دھام کی خاطر وہ لمباڑن ہی اصل پیش بندھی مانی جاتی۔ اپنی تیز طرار اور چلبلی طبیعت کی وجہ سے اشرفی باتوں کو وہ بہت پسند بھی تھی۔ لیکن یہ کسے خبر تھی

کہ اس کی تیزی ان کے اپنے نصیب کو ہی اس تیزی سے چاٹ جائے گی۔

شادی کی رات ...... پہلی رات، سہاگ رات گزار کر جب دولہے پاشا اپنے شہزادوں ایسے شان دار کمرے سے نکل کر جب باغ میں آئے تو دیکھا کہ خوب دھما چوکڑی سو رچ رہا ہے۔ ایک لمبا ڑن ہاتھ لمبے کر کر کے مالی سے وہ مچیٹے لے رہی ہے کہ مالی سات بچوں کا باپ ہو کر بھی نامردوں کا سردار نظر آ رہا ہے۔

"اے چھوکری، اتا شور کیوں مچائی رئی ہے؟ ......" دولہے پاشا نے الجھ کر اسے مخاطب کیا، جس کی ان کی طرف پیٹھ تھی۔

"اے چھوکری ......" سنتے ہی اس نے تنک کر سر گھمایا اور اس کے سر گھماتے ہی ادھر دولہے پاشا خود گھوم کر رہ گئے۔ ایسی آفت ڈھاتی جوانی تو ان کے باپ نے بھی اپنے خوابوں میں نہ دیکھی ہوگی۔ چہرہ تھا کہ انگارہ بنا ہوا تھا، آنکھیں آگ برساتی ہوئیں۔ اتنی موٹی چوٹی ٹھیک سینے کے بیچ میں چاندی کے بٹنوں کے اوپر پڑی ہوئی اور چوٹی کے ایک طرف اُدھر اور ایک طرف ادھر۔ بس اب کیا کہا جائے۔ بڑے غصے سے اس نے کہا......

"میں چھوکری دکھتی ہوں ؟......"

اب دولہے پاشا کی مردانگی بھی خوشی خوشی جاگ پڑی۔ ذرا شرارت سے بولے، "دکھتی تو چھوکری ہی ہے۔ مرد لوگاں ایسے پہاڑیاں اٹھا کر نہیں گھوما کرتے ......" انہوں نے صاف اس کی جوانی پر چوٹ کی۔

"میرے کو میرے نام سے پکارنا سرکار، ہاں، بول دی میں......"

"مگر آپ کا اسم شریف؟" دولہے پاشا ہنسی روک کر بولے۔

"بگیا۔" اس نے اسی بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"بگیا...... بہت اچھے۔ واقعی پھولاں ہی پھولاں ہیں یہاں سے وہاں تک......"

پھولوں کے ذکر پر بے چارہ مالی شامت اعمال سے دخل انداز ہو گیا...... "دیکھئے سرکار، میں یہی اچ بول را تھا کی یہاں سے وہاں تک پھولاں ہی پھولاں ہیں۔ ہور آپ کا حکم ہے کی پھولاں توڑا نیئں کرو۔ اپنے آپ سے مرجھا کو، ٹوٹ کو گر گئے تو گرنے دیو...... پن یہ کیا بولتی کی میں اپنی بی بی صاحب کے واسطے توڑوں گچ توڑوں گی...... ہور کیا بولتی......"

ایک دم اس قیامت نے حقارت آمیز لہجے میں دھتکارا، "اگے تو جا کو اپنی بی بی کے لہنگے میں سو جانا رے۔ چپ کا چپ ٹرٹر لگا کو رکھا۔ جا جا، بہوت دیکھے تیرے جیسے پھولاں سنبھالنے والے۔"

"پھولاں سنبھالنے والے تو ہم ہیں بگیا بیگم......" دولہے پاشا کے دل سے آواز نکلی۔

اللہ معلوم اس بگیا میں کیا زہر بھرا تھا کہ آپ تو ویسے ہی بھری بھری، کسی کسی رہی، مگر دولہے پاشا کو چوس چوس کر پھوک بنا ڈالا۔ کسی کام کے نہ رہ گئے۔ یا تو وہ ایسے کرارے تھے کہ پہلی رات کو دولہن کو کلی سمجھ کر اٹھا لیا تھا، یا اب پانی کا گلاس بھی اٹھاتے تو ہاتھ تھر تھر کانپنے لگتا۔

دولہن پاشا کے حصے میں کیا آیا...... بس بھڑکتی، انگارے بچھاتے جوانی ...... اور شادی کی اکلوتی ایک رات کی یادگار، ایک بچی ...... پھر میاں نے انہیں کبھی بھولے بسرے بھی ہاتھ نہ لگایا۔ یوں ہاتھ لگانے یوگ رہ بھی کہاں گئے تھے۔ دولہن پاشا چودہ برس کی بیاہی سسرال آئیں۔ نویں مہینے ایک گڑیا سی بچی کی ماں بن گئیں۔ پندرہ برس کی ننھی منی ماں، اپنی ہی بچی سے یوں کھیلتیں، جیسے ماں باپ کی سب سے بڑی اولاد اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلے۔ کھاتے پیتے گھرانے کے بچے تو ویسے بھی جلد ہی جوانی کی منزلوں کو جا چھوتے ہیں۔ پھر دولہن پاشا کی تو ساری زندگی ہی ان کی اپنی بٹیا بی بی تارا تھی ...... اس کو بنانا، سنوارنا، سجانا اپنے ہاتھوں کھلانا پلانا۔ ماماؤں اور نوکرانیوں کی پلٹن ہونے کے باوجود اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں کرنا، ہر دم ان کا یہی تو مشغلہ تھا۔

بی بی تارا کچھ ہی عرصے میں ماں کی بہن لگنے لگیں۔ دس گیارہ برس کی ہونے کے بعد تو وہ ماں کے جہیز کے کپڑے بھی پہننے لگیں، کیونکہ ہاتھ پیر خوب نکل آئے تھے۔ اس قدر کم فرق ماں بیٹی میں نظر آتا کہ دادی حضور نے شروع ہی سے ماں کو بجائے امی حضور کی آپا کہنا سکھایا تھا۔ اب برسات کے دنوں میں کبھی جھولے پڑتے تو بی بی تارا اماں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی آنگن میں لے جاتیں، جھولے پر بٹھا دیتیں، ہاتھوں میں ہاتھ دے کر، پنکھڑی کھیلتیں۔ آگے پیچھے بھاگ کر آنکھ مچولی، چھیتا بانی، لپا چھپی کھیلتیں، دیکھنے والے کہتے ......"اوئی، ایسا لگتا جیسا دونوں بہناں بہناں ......" اور ادھر چند برس سے تو بی بی تارا باقاعدہ بڑی بہن لگتی، اور ماں چھوٹی بہن ......

بی بی تارا کو گھر کے کام کاج سکھائے گئے، اسکول میں پڑھایا گیا۔ نوابوں کی حد تک جتنے بھی سینے پرونے، مہمان داری اور گھریلو زندگی کے کام ہوتے ہیں، وہ تو نوکرانیاں نپٹ لیتیں ہیں، مگر بی بی تارا نے اپنے الھڑ پن کے باوجود دوستی دوستی میں بہت کچھ سیکھ ہی لیا۔ سولہ برس کی شہد ٹپکتی عمر میں جب پیغام اس لئے ٹوٹ ٹوٹ برسنے لگے کہ اکلوتی ایک بٹیا کو تو نواب دولت یار جنگ ایک زمانہ سمیٹ کر دے دیں گے، تو دولہن پاشا کا دل دھڑ سے ہو کر رہ گیا...... میری گڑیا مجھ سے چھن

جائے گی، میرا کھلونا مجھ سے بچھڑ جائے گا۔ نیند تو مقدر میں تھی ہی نہیں، اب تو بالکل اکھڑ کر رہ گئی۔

شادی کی رات تھی، اور یہ دن ...... ایسی غیرت مند بی بی تھیں کہ پھر کبھی تو شوہر سے پہل کر کے بات نہ کی، بستر کے قابل تو وہ رہے ہی نہیں تھے۔ بات چیت بھی اگر وہ کر لیتے تو بس جواب دے دیتیں۔ یہ کبھی نہ ہوا کہ اپنی طرف سے انہوں نے بات میں پہل کی ہو۔ لیکن غموں کا مار کھایا ہوا، ماں کا تڑپتا دل لے کر وہ اس دن پہلی بار ان کے پاس گئیں اور کہا...... ''آپ باپ ہیں، جو بھی کریں گے، میرے کو منظور ہے، مگر خدا کا واسطہ دیتی اوں کی بی بی تارا کو گھر داماد دیو۔''

''گھر داماد مل جائیں گا؟'' نواب صاحب ذرا شک بھرے لہجے میں بولے۔

''کیوں نئیں ملیں گا، آپ اتی بے حساب دولت دیں گے تو کوئی بھی گھر دامادی خبول کر لے سکتا......'' وہ ایک دم رو پڑیں...... ''میں اب پرانی باتاں نکالنا نئیں چاہتی، مگر اچ بات بولتیوں کی میں اپنی بچی کے بغیر زندہ نئیں رہ سکوں گی۔''

شاید زندگی بھر کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا بس ایک آسان ذریعہ نواب صاحب کو نظر آیا۔ محبت سے کہنے لگے، ''تم جو چاہتے ہو، جیسا بولتے ویسا ہی انشاء اللہ ہوئیں گا۔''

بی بی تارا مایوں بیٹھی تھی۔ ہر طرف شادی کے ہنگاموں کی دھوم تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہاں سے لے کر وہاں تک ایک طوفان سا پھیلا ہوا تھا۔ اب دولہن پاشا کی نیند کاہے سے اڑ گئی تھی، بیٹی گھر کی گھر ہی میں تو رہنے والی تھی نا۔ اب تو یہ ساری ہلچل یوں مچی ہوئی تھی کہ پچھلی رات کو جورت جگا ہوا ہے اس نے ان کی سوئی ہوئی جوانی کو دھکے مار مار کر پھر جگا دیا تھا۔

رات کو وہ تو اپنے کمرے میں ہی تھیں، مگر خاندان بھر کی بیاہی، ان بیاہی لڑکیاں، عورتیں، خواصیں، مامائیں، نوکرانیاں دالان میں ہلڑ بازی مچائے ہوئے تھیں۔ شاہ آبادی پتھروں والے فرش پر سے جاجم اور چاندانی اٹھا کر وہیں انگھیٹیاں اور چولہے جلا دیئے گئے تھے اور دھناون پکوان پک رہے تھے۔ گل گلے، چونگے، میوے کی پوریاں، ملیدے ...... ایک طوفان تھا۔ یہ سارا پکوان شادی کے گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ توشے کے طور پر دیا جانا تھا۔ اس وقت پکوان ہو رہے تھے اور مذاق کے مذاق۔ ادھر میراثیں کیا کسی سے کم تھیں۔ ایک سے ایک فحش گانے گائے جا رہے تھے۔

''اجاڑ مارا گلا تڑخ گیا گاتے گاتے۔'' ایک میراثن تنک کر بولی، اب میری جگہ کسی اور کو لیو اور میرے کو ذرا آرام دیو۔''

''اچھا چلو۔'' ایک کنیز شرارت سے بولی، ''اب ذرا پہیلیاں بوجھیں گے کتے۔''

''اچھا تو بول میں بوجھتیوں۔'' دوسری بولی۔

ایک خالہ زاد بولیں، ''اچھا جو پہیلی بوجھ کو نہ دے وہ میری باندی بنے۔''

تیسری بولی، برابر بوجھ کو دیتی میں۔ میری کو بہت مسئلے اور پہیلیاں یاد ہئیں......

''اچھا تو شروع...... بسم اللہ......''

''ایک تھال موتیوں سے بھرا
سب کے سر پہ اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے
موتی اس سے ایک نہ گرے''

سب چلانے لگیں، ''ایو اللہ، اتا اسان۔ یہ تو آسمان اور تارے ہیں۔''

''برابر...... اچھا اب دوسرا بولتیوں...... ذرا غور سے سننا۔'' ایک ہنس کر بولی۔

''چٹاخ پٹاخ کب سے...... ہاتھ پکڑا جب سے
آہ اوئی کب سے...... آدھا گیا جب سے
چپ چاپ کب سے...... سارا گیا جب سے۔''

اک دم ہنسی کے ٹھٹھے ابلنے لگے، اور پہیلی بولنے والی کو گالیاں پڑنے لگیں۔ مگر وہ تنک کر کہنے لگی، ''اگے تمہارے داماغاں گندے ہیں۔ اجاڑ ماریو۔ یہ تو امیر خسرو کی پہیلی ہے۔ اس کا جواب ہے ''کنگن'' اب سوچو بھلا۔''

''اچھا ایک ہور بوجھو۔''

''بات کی بات ٹھٹھولی کی ٹھٹھولی
مرد کی گانٹھ عورت نے کھولی۔''

بی بی تارا، جو سہیلیوں کے بیچ میں ہنستی مسکراتی، شرماتی لجائی بیٹھی تھی ...... دھیرے سے بولی ''......

قفل چابی......''

دو ایک لڑکیوں نے اس کے دھموکے جڑے۔ ''بڑی چتری ہے، وہ تو میں بھی سمجھ گئی تھی۔''

اچھا ایک پہیلی بوتیوں اب'' ایک طرارسی نوکرانی نے کہا'' جو یہ پہیلی نہیں بوچھا۔ انے میرا نوکر............''

ہاں، ہاں بول ...... سب لڑکیاں چلائیں۔

''سوتے سوتے ہاتھ میں لے کو سوئے۔

''حرام زادی ...... تیرا دماغ تو بالکل اچ ویسا ہے۔

وہی نوکرانی ہنس کر بولی ''اچھا ایک ہور بولیتوں۔ دونوں کا ایک اچ جواب ہے سوچ کے بولو۔

''اسلتا مسلتا ہاتھ میں لیو تو پھسل پھسل پڑتا۔

پھر بی بی تارا ہی بولی ''پنکھا ...... دونوں کا جواب پنکھا اچ ہے۔

اب سب نے سوچنا شروع کیا ''اے سچی تو بات ہے، سوتے وقت ہاتھ میں پنکھا لے کر سوتے نا گرمی کے دناں میں ...... ہور ہاتھ میں پسینہ آتا تو اجاڑ مارا پھسل پھسل بھی تو پڑتا نا۔''

''اب میری پہیلی جوئیں بوجھے تو اس کو میرے سامنے اٹھک بیٹھک کرنا پڑے گا۔ حویلی کی مغلانی اماں کی بیاہی بیٹی نے کہا۔

''ہاں بولو''

اوڑوں مروڑوں، تھوک لگا کر اندر گھسیڑوں۔''

سب گالوں پہ ہاتھ ٹکا ٹکا کر سوچنے لگیں۔ اتنے میں ایک لڑکی بھاگی بھاگی گئی اور ہاتھ میں کچھ لئے واپس آئی۔ زور سے چلا کر اس نے اعلان کیا ''سوئی اور دھاگا۔''

سب ان کی جان پہ ٹوٹ پڑیں ''اگے دیکھو یہ سب یہاں نئیں چلنے والا۔ کتاب میں سے دیکھ دیکھ کو مت بولو۔

لڑکی نے دونوں ہاتھوں میں کتاب دبالی۔ اچھا سچی بولیتوں۔ اب سے جھٹا کھیل نئیں۔ دل سے بولنا سب لوگ میں بھی۔

''اگے دولہن بیگم، تم نا بھی تو کچھ مونہہ کھولو۔''

دو چار سہیلیاں بی بی تارا کو خوب گدگدانے لگیں۔

وہ بل کھا کر، ہانپ کر بولیں ''ابا' خدا کے واسطے اتا گدگدی مت کرو ...... مر جاؤں گی۔ اچھا بس اچ بول کے میری باری ختم۔ آں

پھر وہ ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر، مسکرا مسکرا کر بولنے لگی۔

''تو جاتا تھا میں پکارتی تھی
توڑ التا میں روتی تھی
پھر تو دیکھتا تھا میں ہنسی تھی۔

ایک دم طوفان کی طرح چکراتی، بلبلاتی، آگ برساتی، دولہن پاشا اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں۔ یہ کیا فضول باتاں لگائے بیٹھے تم لوگاں، کچھ عمل ہے کی نئیں؟ کہ انے بیٹھے والیاں میں کنوارے بچیاں بھی ہئیں۔''

بی بی تارا جگہ سہم سی گئی، آپا ...... ہم تو خالی چوڑیاں اور چوڑی والے کا مسئلہ بولے۔

دوسری ڈر کر اپنے ہاتھوں میں چھپائی ہوئی کتاب آگے بڑھا کر کہنے لگی۔

دیکھ لیجئے یہ تو ہم کتاب میں سے یاد کرے۔

دولہن پاشا نے اٹھل پتھل مچاتے سانس کو بڑی مشکل سے سینے میں سیمنا، اور کتاب زورست چھبٹ کر اپنے بستر پر آ کریں۔ کتاب کو تیزی سے کھول کر پڑھنا شروع کیا ...... چند دکھنی پہیلیاں، کے عنوان سے الہ آباد کے کسی نعیم الرحمٰن ایم اے نے کتاب مرتب کی تھی، جو اس وقت ان کے جلتے بدن پر گرم تیل بن کر ٹپک رہی تھی، انہوں نے چر چر کر کے پوری کتاب پھاڑ کر رکھ دی تھی۔

پھر وہ نہ سو سکیں۔ ایک ایک کر کے پورے سولہ برس کی زندگی کے دن ان کے سامنے آ کر اپنی اپنی شکایتیں کرنے لگے۔

ایک دن بولا، یاد ہے ایک دن برسات میں خوب پانی برسا تھا ...... خوب بلیاں چمکیں تھیں۔ تم آنگن میں اتری تھیں تو پورا لباس پانی میں بھیک کر سارے آگ ایسے بدن سے چپک گیا تھا۔ تمہیں کتنی سردی لگ رہی تھی۔ یاد ہے؟ ...... ایسی سردی کیا کمبلوں اور مخملوں رضیاؤں سے جاتی ہے؟

ایک اور دن نے کہا۔ نواب دولت یار جنگ نے تو ایک رات کے بعد کبھی اس انگیٹھی ایسے جسم کو چھوا تک نہیں، پھر تم نے اپنے آپ پر یہ ظلم کیوں روا رکھا کہ حویلی میں کتنے لڑکے تمہاری ایک چشم کرم کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر تم نے انہیں پوچھا تک نہیں ...... ہاد ہے ایک دن شوکت نواب نے تمہارے دوپٹے کا آنچل اک زرا تھام لیا تھا تو تم نے کتنی زور سے ان کے تھپڑ مارا تھا ...... کیا جنت میں جانے کی آرزو اتنی شدید ہے؟

ایک اور دن بولا۔ ایک موٹر زندگی بھر اسی لئے واقف رہی کہ منوں برف کی سلیں لائے اور تم ٹب میں وہ برف گھول گھول کر یخ بستہ پانی سے نہا نہا کر اپنے جسم کی تپش ٹھنڈی کرتی رہو۔ مگر کیا یہ روح گرمی برف سے بجھ جاتی ہے۔

یاد ہے ایک دن ......

ایک دن ......

ایک دن ......

ایک دن ......

انہوں نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لئے، کتنے دنوں کو یاد کروں اور کتنے دنوں کو بھولوں۔ اب میں اپنی بیٹی وداع کر رہی ہوں۔ میں اکتیس بتیس کی سہی ...... دیکھنے میں جوان سہی، میرے ارماناں پیاسے سہی۔ میرے آرزواں تشنہ سہی، پر میں اب سب بھول جانا چاہتی ہوں ...... میں اپنی بیٹی کی بڑی بہن دکھتی۔ یہ بھی صحیح ہے...... کوئی بھی ہم دونوں کو آج تک ماں بیٹی نہیں بولا۔ جو بولا بہناں، بہناں اچ بولا۔ پھر بھی اب ایک داماد کی ساس بننے جارئی۔ انہوں نے چیخ کر ان دیکھی قوتوں کو جیسے بھگانے کی کوشش کی۔

چلے جاؤ میرے سامنے سے نکل جاؤ۔ یہ پلید خیالاں دراصل شیطان ہیں ...... مالک میرے کا آج تک سنبھالا اب بھی سنبھال لے

اور وہ ہانپتی، ہانپتی کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

ترجلے کی رات گئی۔ پھر مہندی کی رات بھی گئی۔ سانچق کی رات بھی گئی اور آج شادی کی رات، یعنی جلوے کی رات تھی، حویلی میں وہ بھگدڑ مچی ہوئی تھی کہ منٹ کے کام کو خواہ مخواہ گھنٹہ لگ رہا تھا۔ بیٹی بیاہ کر میکے ہی میں رہنے والی تھی کیونکہ گھر داماد میسر آ گیا تھا۔ داماد میں ہر خوبی موجود تھیں۔ بس ذرا عمر کا فرق تھا، تو بھئی دودھ دینے والی بھینس کی دو لاتیں تو کھانی ہی پڑتی ہیں۔ پڑھا لکھا ہونہار نواب خاندان کا لڑکا تھا۔ عمر چونتیس سال تھی، کچھ لوگوں نے منہ بھی بنائے ......

اگے کوئی بات بھی ہوئی اجاڑ یہ بچی دیکھو سو سولہ برس کی، اور دولہا دیکھو سو پوری دگنی عمر کا۔ ایسا کیا کل پڑا تھا کیا چھوکروں کا۔

اب آپا ایک نہ ایک جگہ تو جھکنا ہی پڑتا ناماں۔ دیکھو سب چیز تو برو بر ہے، بس عمر ہی ذرا زیادہ ہے اس سے فرق پڑ جائیں گا بھلا؟

فرخ کی بات تو جانے دیو۔ جوڑ کو جوڑ تو سجنا چاہیئے نا’’

وہ تو سجیں گا ...... نئیں تو ایک دو بچوں کے بعد عورت خالہ اماں نئیں تو پھوپھی اماں لگنے لگ جاتی مرد کی۔ اچھا اچ ہے مردوئے نے ذرا بڑی عمر کا اچ ہونا۔

لیکن جب رفعت نواب بر دکھاوے کو آئے تو سب اپنی جگہ سن رہ گئے۔ ایسا جی دار مرد، ایسا بانکا سجیلا جوان ...... کلین شیو، نہ داڑھی نہ مونچھ، گورا رنگ، اونچا قد، مضبوط ہاتھ پاؤں، چوڑی چکلی چھاتی، مسکراتا چہرہ، شریریں آنکھیں، صورت سے مشکل سے پچیس چھبیس سال کا لڑکا۔ سب

اپنی معقول اور نامعقول رائیں دل ہی دل میں دبا کر بیٹھ گئے ...... واقعی اچھا جوڑا ملا تھا ...... بی بی تارا تھی تو سولہ سال کی، مگر عمر اس سے کچھ زیادہ ہی لگیں اور یہ زیادہ ہو کر کم لگتے۔ یوں بھی عمر صورتوں ہی سے پرکھی جاتی ہے ...... کوئی اسکولوں میں سٹوفکیٹ تھوڑی ڈھونڈنے جاتے ہیں۔

برات جس دھوم دھڑکے سے آئی اس کا ذکر فضول ہے۔ اس لئے کہ ادھر سے گھر داماد ...... ماں باپ نے جی کھول کر جو دیا۔ دولہا والوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، اور چیزوں کو تو جانے دو، صرف ایک ہار ہی پورے نو لاکھ کا تھا، اب کسی کو یقین آئے یا نہ آئے یہ پرانے نوابوں کا دستور رہا ہے کہ ایک نی ایک خاندانی زیوران کے یہاں شہنا پشت سے چلا آتا ہے، جو خاندان کی ہر بڑی بہو کو چڑھایا جاتا ہے، سو رفعت نواب کا خاندانی نولکھا ہار تھا، جو پرانے وقتوں کے نو لاکھ روپے کا تھا ...... یقیناً اب اس کی قیمت دگنی تگنی ہو گی مگر نام وہی چلا آ رہا تھا ’’نولکھا ہار‘‘

عقد خوانی ہو گئی ...... باہر بینڈ باجا اور اندر ڈھولک پٹنے لگی۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ نکاح خوانی ہو گئی اور بیٹی پرائی ہو گئی۔ اب اندر آرسی مصحف یعنی جلوے کا ہنگامہ ہونا تھا۔ جس کے بعد ہی دولہا میاں اپنی دولہن پر قابض ہو سکتے تھے۔ قاعدہ ہے کہ جلوے سے پہلے دولہن کو نئے سرے سے سجایا سنوارا جاتا ہے، کیونکہ ایجاب قبول کرانے کے لئے جب وکیل اور ماموں دولہن ہے پاس ...... ’’ہاں ......‘‘ کہلوانے آتے ہیں تو دولہن کچھ تو میکہ چھوڑنے کے غم میں سچ مچ اور دنیا دکھاوے کو اس سے بھی زیادہ، رہ رہ کر اپنے آپ کو ہلکان اور بدحال کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آرسی مصحف کے وقت جب زندگی میں پہلی بار آئینے میں دولہا میاں کو اس کا دیدار کرایا جاتا ہے، اس رخ روشن کا دلکش ہونا بہت ضروری ہوتا ہے جو بعد میں انہیں زندگی بھر دیکھنا ہے۔

سسرال سے آیا ہوا جوڑا بی بی تارا کو پہنایا جا چکا تھا۔ اس قدر وزنی کمخواب کا جوڑا کہ بی بی تارا اپنے وزن سے دگنی ہو گئیں، پھر زیور، پھر بھرواں جوڑا ...... پھر حیدرآبادی نگوں کا جوڑا، پھر پہنچیاں، پھر کرن پھول، پھر ماتھے کا جھومر، پھر مانگ کا ٹیکا ...... بس بے چاری دولہن بوجھ کے مارے زمین کی طرف جھکی چلی آ رہی تھی ...... اور ابھی، ایک قیامت تو باقی ہی تھی، ابھی تو دولہا میاں منہ دکھائی میں وہ بیش قیمت وزنی ’’نولکھا ہار‘‘ بھی اس کے گلے میں پہنانے والے تھے۔

جلوے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ بڑے سے چاندی سونے کے ملواں چھپیر کھٹ پر جہیز میں دیا جانے والا شان دار مخملیں بستر بچھا دیا گیا، زریں مسند، زریں گاؤ تکیے ...... گدگدے لحاف ...... بی بی تارا کو سنبھال کر بہت سی لڑکیاں چھپیر کھٹ تک لائیں، اور گڑیا کی طرح بٹھا دیا، برابر میں دولہن پاشا کو بیٹھنا پڑا۔ وہ لاکھ شرمائیں، لاکھ بہانے بنائے، مگر بہنوں، نندوں، بھاوجوں نے پکڑ دھکڑ کر

انہیں چھپر کھٹ پر چڑھا دیا...... اب مونہہ دکھائی کے جو بے حساب روپے اور زیور ملتے، انہیں کون سنبھالتا پھرتا؟

دولہا میاں کے آتے ہی جیسے قیامت آ گئی۔ میراثیوں نے امینڈی، بینڈی آوازوں میں وداعی کے گیت گانا شروع کر دیئے۔ جنہیں سن کر لڑکیوں بالیوں نے رونے کی بجائے ہنسنا شروع کر دیا۔ بھلا ایسے رومانٹک موقع پر کہ پہلی بار اپنی دولہن کا چاند سا چہرہ دیکھنے کے لئے دولہا آیا ہے، رونا دھونا کس کو سوجھتا ہے۔ تنگ آ کر میراثیوں نے گانا بند کر دیا۔

دولہا میاں کو چھپر کھٹ پر ٹھیک دولہن کے سامنے بٹھایا گیا۔ دولہن کے برابر میں دولہن کی ماں براجمان تھیں۔ کسی میراثن نے پتہ نہیں جس رو میں اس ہلڑ میں ایک بات کہہ دی، جو کسی اور نے سنی نہ سنی دولہا میاں نے ضرور سن لی۔

''ایو، دولہن پاشا کو دیکھو، انو خوداچ دولہن لگ سے رئیں۔''

داماد نے اب ذرا غور سے ساس کو دیکھا۔ انہوں نے اپنی ساس کو سولہ برس پہلے چاہے نہ دیکھا ہو...... مگر تھیں تو وہی...... چاول بھر بھی تو نہیں بدلی تھیں۔ سنہرا سنہرا رنگ، حیدر آباد کی عام لڑکیوں کی طرح بلکہ ان سے بھی سوا، لمبے گھنیرے بال، جھلمل کٹوروں کی طرح بادامی آنکھیں ...... اور اوپر سے قوسوں اور محرابوں کی رعنائیاں۔ کیا قیامت تھی کہ ہے ہے۔ پھر حویلی کا ایک جان لیوا چلن یہ تھا کہ لڑکیاں ان دنوں بھی اندر، کرتوں کے اندر محرم وحرم کچھ بھی نہیں پہنتی تھیں۔ جو ہے بس سامنے ہی ہے۔ ایسی آنچیں دیتی جوانی کہ سردیوں کی اس شام کو بھی جب ہزاروں لوگوں کا ہجوم تھا، اسی ایک انگیٹھی کی بدولت سارا ماحول گرما گرم محسوس ہو رہا تھا...... انہوں نے بڑی شریر نگاہوں سے ساس کو دیکھا۔ روایت اور قاعدے کے مطابق بردکھاوے کو داماد آتا ہے تو ساسیں پردہ کرتی ہیں۔ اسی لئے اس دن وہ اپنی ساس کو نہیں دیکھ سکے تھے، آج دیکھا تو بس دیکھے ہی جا رہے تھے۔ دولہن پاشا نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ حویلی کی ریت ہی یہ تھی کہ لڑکیاں نگاہیں نیچی رکھیں، ورنہ کشتیوں کے پشتے لگ جاتے۔

اب آئینہ لایا گیا۔ سونے کے چوکھٹے میں جڑا آئینہ جس میں پہلی بار دولہا میاں اپنی دولہن کا منہ دیکھ کر اسے ''نولکھا ہار'' پہنانے والے تھے۔ چاند سی صورت نظر آئی تو دولہا میاں نہال ہو اٹھے ...... انہوں نے خواب میں سوچا اور دیکھا ہو تو دیکھا ہو زندگی میں تو ہرگز نہیں سوچا تھا کہ ایسی حسین اور پیاری دولہن انہیں مل بھی سکتی ہے۔ مگر وہ سچ مچ مل چکی تھی اور اب وہ اس پیاری صورت کی قیمت ایک ''نولکھے'' ہار سے ادا کرنے جا ہی رہے تھے کہ کسی نے ذرا ترس بھری آواز میں کہا، ''ایو ماں، اتا وزنی ہار بچاری بچی کے گلے میں نکو ماں ابھی سے؟ ''بعد'' میں چپ رسم ادائی کو ڈال دینا بوبو...... ابھی پہلے اچ بہت وزن ڈال لے کو بیٹھی انے......'' یہ سسرال والیوں میں سے کوئی تھیں۔

ہار دولہا میاں کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا، ''پھر اس کا کیا کروں میں؟ ......'' وہ کچھ بھولپن اور شرارت سے بولے، ''اگے تمہاری ساس کے پاس رکھوا دیو جی میاں۔ بعد میں لے لینا...... نئیں تو ان کے گلے میں ڈال دیو۔''

دولہن پاشا نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا مگر اتنے میں ذرا آگے جھک کر...... مسکراتے مسکراتے دولہا میں ان کے گلے میں نولکھا ہار پہنا چکے تھے اور اپنی قسمت کو رو چکے تھے۔ کیونکہ ہار کو قبولیت کا درجہ بخشنے کے لئے دولہن پاشا ذرا آگے کو جھکیں تو گہرے اودھے رنگ کے ریشمی کرتے کے اندر کچھ ایسا تباہ کن منظر نظر آیا، کہ انہوں نے سوچا کہ ایٹم بم یا ہیروشیما پر گرا تھا یا آج مجھ غریب پر گرا ہے...... ہیروشیما پر تو بے شمار بم گرے ہوں گے مگر یہاں تو ''دو'' ہی بموں نے زندگی تباہ و تاراج کر دی۔ کیونکہ اس حویلی میں ایک جان لیوا چلن یہ تھا کہ لڑکیں اندر، کرتوں کے اندر محرم وحرم کچھ بھی نہیں پہنا کرتی تھیں، بس جو ہے سامنے ہے اور ویسے بھی سچی بات تو یہ ہی کہ کس کر باندھ رکھنے کی ضرورت تو انہیں پڑے جن کا گوشت لٹکا چلا آ رہا ہو۔ یہاں تو جیسے تلواریں تنی ہوں۔ یہ معاملہ تھا تو حرم پہنے ان کی جوتی۔

اب سلامی اور منہ دکھائی کا دور چلنا شروع ہوا۔

''اس کی طرف سے سونے کے کنگن دولہن کو۔''

اس کی طرف سے پانچ اشرفی دولہا پاشا کو۔''

''اس نے گلے کی تن منی دی۔''

''اس نے دولہا میاں کو گھڑی دی۔''

ارے کاہے کی سلامی اور کاہے کی منہ دکھائی۔ وہاں تو ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ اب وہ مرمر کر اپنا دھیان بٹانے کی سوچ رہے ہیں کہ یہ جو ہماری دولہن کی امنی ہیں، ان کا دوپٹہ کتنا اچھا اودا اودا ہے۔ اس پر کامدانی کتی اچھی لگ رہی ہے؟ مگر کامدانی بنے ہوئے دوپٹے کو چننا بولے تو کتنی مصیبت کی بات ہے۔ چننے والیوں کے انگوٹھے ضرور چھل گئے ہوں گے...... پھر اچانک وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو گالیاں دینے لگے......

''ارے جناب یہ فضول باتاں مت سوچیئے، جو سوچنا ہے وہی سوچیئے نا۔ اب اگر وہ دوپٹہ چننے والی مر بھی جائے تو آپ کا کیا بگاڑ کر جائیں گی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ صرف ایک ہی

بات سوچنا چاہ رہے ہیں اور خود کو الو بنانے دوسری طرف دھیان لگا رہے ہیں...... مگر میاں آپ ہیں اصلی الو کے پٹھے...... آپ کو کامدانی کے دوپٹے اور کرتے سے مطلب ؟''

کرتے کا دھیان آتے ہی ان کے ذہن میں پھر قینچی سی چلنے لگی...... اب دنیا میں رنگوں کی کچھ کمی ہے کیا...... سنہرا رنگ ہی لے لو، سنترے کے چھلکے جیسا کتنا اچھا لگتا ہے، یا ہرا رنگ، پتوں کے جیسا۔ پھر ایک جامنی رنگ بھی ہوتا ہے۔ گلابی رنگ ہوتا ہے...... اور کم بخت یہ لال رنگ کدھر مر گیا تھا آج؟ یہ کرتا اور کچھ نہیں اور کچھ نہیں، اودے رنگ کا ہی ہونا تھا۔ اودا رنگ اور ذرا جھک کر دیکھو تو اس کے اندر تباہیاں، بربادیاں !''

ان کے باہر جتنا شور تھا، اندر اس بھی کہیں زیادہ غلغلہ مچ رہا تھا...... اچانک دولہن پاشا گرمی اور حبس کے مارے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بھئی اللہ، میں کمرے کو جا ری یوں۔''

ان کے کھڑے ہوتے ہی جیسے کائنات کا سارا سلسلہ اپنی جگہ جامد ہو کر رہ گیا......

''بیگم صاحبہ، آپ کا کیا بگڑ جاتا جو آپ یہ جان لیوا رول دار اطلس کا پھنسا پھنسا پاجامہ نہ پہن لیتے ؟''

سادگی اور وہ بھی ایسی قیامت خیز...... یہاں سے وہاں تک محفل میں چمکی، سلمہ ستارے، گوٹے پٹھے اور زیوروں کی جگمگاہٹ تھی، اور یہاں کیا تھا؟ صرف ایک اودا کرتا، اودا تنگ پاجامہ اور اودا دوپٹہ...... بس یہاں وہاں کامدانی ضرور دمک رہی تھی۔ دمک کیا رئی تھی، دولہا میاں کے نصیبوں پر ہنس رہی تھی...... مگر وہ ''نولکھا ہار؟ ......'' دو اونچے اونچے گنبدوں کے بیچ کیسا حقیر ہو کر رہ گیا تھا۔

برات کو واپس تو جانا تھا ہی نہیں کیونکہ داماد ''گھر داماد'' ...... اسی لئے گڑبڑ کے کم ہونے کے آثار نظر ہی نہ آتے تھے۔ پتہ نہیں ایک بج گیا تھا یا دو بج گئے تھے، مگر یہاں تو نصیبوں نے ایک نہ دو پورے تین بجا دیئے تھے۔ وہ اٹھ کر چلی بھی گئیں مگر دماغ پر وہی چھائی ہوئی تھیں...... اب لاکھ دولہا میاں ادھر ادھر کی باتیں سوچنا چاہتے ہیں، مگر بعض مرد ایسے ہوتے ہیں کہ باغوں میں پھول کھلنے کا سماں بھی یاد کرنا چاہیں تو کم بخت دماغ میں ہیروشیما پر بمباری کا منظر ہی یاد آتا ہے۔

دولہن چھوٹی سی تھی، الھڑ سی تھی، نادان بھی تھی، اس لئے دولہن پاشا نے اپنے کمرے کے برابر کا ہی کمرہ اس کے لئے چنا تھا۔ کیا پتہ رات بے رات، وقت بے وقت اسے ماں کی ضرورت پڑ جائے۔

کھانے وانے سے فارغ ہو کر حویلی میں رفتہ رفتہ سناٹا ہونے لگا۔ جا جموں فرشوں پر، قالینوں پر جس کو جہاں جگہ ملی، پاؤں پسار کر سو گیا۔ کیا نوکرانیاں، اور کیا بیبیاں...... بس اکا دکا بوڑھی عورتیں یہاں وہاں بلاضرورت جوان لڑکیوں کو لتاڑتی جاگتی دکھائی دے رہی تھیں، باقی تو سارے میں سوتا پڑ گیا تھا...... البتہ دولہن کی سکھی سہیلیاں ڈرائنگ روم میں گھیرا باندھے بیکار کی باتوں سے اس کا دماغ کھائے جا رہی تھیں۔ سسرال والیاں کھا پی کر رخصت ہو گئی تھیں، اور دولہا میاں اپنے کمرے میں پہنچا دیئے گئے تھے......

دولہن پاشا کی نیند تو مدت ہوئی روٹھ چکی تھی، آج بھوک بھی اڑ چکی تھی...... اکتیس برس کا بوجھ، جو وہ بہر حال اٹھائے چلی آ رہی تھیں، آج اچانک ناقابل برداشت سا ہو گیا تھا۔ دماغ میں، دل میں بس ایک دھکا دھک ہوئے جا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے بے پناہ بال، جن میں آج کے دن تک ایک بھی مہربان کرن نہیں چمکی تھی، جوان کے نصیبوں ہی کی طرح کالے تھے، وہی بے پناہ بال کھول کے بکھرا دیئے کہ سر ذرا ہلکا محسوس ہو۔ صبح صنوبر نے عود اور عنبر انگاروں پر ڈال کر، ان کا سر ٹوکری پر رکھوا کر بال خوشبو سے بسائے تھے۔ بید کی ٹوکری کو تکیہ بنا کر لیٹ کر وہ بچپن سے اپنے بال اسی طرح سکھانے اور خوشبو سے بسانے کی عادی تھیں۔ اب خوشبوؤں میں بسنے کا ارمان تو کسے رہ گیا تھا، ہاں کبھی کبھار نہا کر جلد بال سکھاتے ہوئے ابر کے مارے سردی وغیرہ نہ ہو جائے تو وہ ٹوکری سر کے نیچے لے لیتیں۔ آج بھی خوشبوؤں کا سمندر ان کے سر میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

چنا ہوا، بتی بنا ہوا دوپٹہ انہوں نے اتار کر تکئے کے پاس رکھ دیا تھا...... شور شرابے سے بچنے کی خاطر انہوں نے دلان کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ دروازہ بھی بھڑا ہوا تھا، جو ان کے اور بی بی تارا کے کمروں کو ملاتا تھا، مگر اس کی چٹخنی نہیں لگی تھی۔

اچانک انہیں خیال آیا کہ دیکھ تو لوں، دولہن کے کمرے میں پاندان رکھوا دیا گیا ہے یا نہیں؟ ان کی اپنی زندگی میں بس ایک ہی دن سنہرا تھا اور ایک ہی رات رنگین...... اور اس رنگین اور سنہرے خواب میں پاندان کا اہم رول تھا...... جب نواب صاحب نے پان مانگا تھا اور انہوں نے اپنے حنائی ہاتھوں سے لرزتے کانپتے پان بنایا تھا اور شرماتے شرماتے نواب صاحب کے سامنے رکھا تھا تو انہوں نے بڑی بدمعاشی سے کہا تھا، ''انہوں ایسے نہیں...... اپنے ہاتھ سے کھلائیں......''

اور جب انہوں نے اپنے پان نواب صاحب کے مونہہ میں رکھنا چاہا تو وہ پورا ہاتھ ہی چبا گئے۔ بلکہ ہاتھ کیا ان کا پورا انگ انگ چبا گئے۔ پھر وہ رات کبھی نہ لوٹی۔

''اللہ نہ کرے کہ میری بیٹی کی زندگی سے وہ رات کبھی منہ موڑ لے...... روز وہ رات آئے

میرے اللہ...... ''انہوں نے بوجھل دل سے سوچا اور بھڑے ہوئے دروازے کو کھول کر برابر کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

چھپر کھٹ سونے چاندی کا ملواں تھا۔ اس پر سونے کے کام کی بنی مسند تھی۔ اور اس پر جو شخص بیٹھا موزے اتار رہا تھا، وہ نہ سونے کا تھا اور نہ چاندی کا...... محض گوشت پوست کا ایک انسان تھا۔ ایک جوان انسان، ایک جوان مرد۔

دولہن پاشا گھبرا سی گئیں۔ دوپٹہ تو وہیں ان کے سرہانے بتی بنا پڑا تھا، اور وہ یہاں اپنی ساری بلندیوں اور ساری خوبصورتیوں کے ساتھ اودے اودے لباس میں کھڑی قیامتوں کو دعوت دے رہی تھیں۔

عورت برہم رہے تو مرد کمزور پڑنے لگتا ہے لیکن گھبرائی ہوئی عورت کو دیکھ کر ایک مرد کو اپنے مرد ہونے کا پوری شدت کے ساتھ احساس ہونے لگتا ہے اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب گیہوں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ساری چیزوں میں سب سے زیادہ لذیز محسوس ہونے لگتا ہے۔

دولہن پاشا کو کچھ کچھ یاد تھا...... سب کچھ نہیں، کچھ ایسا کہ کسی نے شہد ٹپکاتی آواز میں یہ کہا، ''آپ کے گلے میں نولکھا ہار کتنا خوبصورت لگتا ہے۔'' اور پھر انہیں پھول کی پنکھڑی کی طرح ہلکا اور نازک سمجھ کر مخمل کے بستر پر بچھا دیا گیا اور پھر جیسے زندگی بھر کی کلفتوں کا ازالہ ہو گیا...... جیسے وہ سب خواب کی باتیں تھیں کہ برف گھول گھول کر پانی کو ٹھنڈا کیا جا رہا ہے۔ وہ ٹھنڈے یخ بستہ پانی سے نہا رہی ہیں اور آگ اور گرمی ہے کہ کم ہوتی ہی نہیں۔ یہ سب انہیں خواب اور جاگتے سوتے کی کیفیت لگی۔ لیکن جب صدیوں بعد انہیں ہوش آیا تو لگا کہ وقت تو جہاں کا تہاں پڑا ہوا ہے۔ سامنے والا بڑا گھنٹہ چار بجا رہا ہے، اور وہ یعنی بنت حوا آدم زادے کی پسلی سے لگی اسی لباس فاخرہ میں ملبوس ہیں جو قسام ازل نے اس دنیا میں بھجواتے وقت انہیں عطا کیا تھا۔

پاگلوں کی طرح وہ اٹھیں اور شیرنی کی طرح اس شخص پر ٹوٹ پڑیں جس نے ان کی سولہ سال سے مقفل عبادت گاہ کو تباہ و تاراج کر دیا تھا۔

''تم...... تم...... تم جنور...... تم حیوان، تم میری بچی کا سکھ اجاڑنے والے ذلیل کتے، خدا تمہیں کبھی سکھ نئیں دیں گا۔ اللہ کرو تم کو کبھی کوئی خوشی نہ ملے......''

اور وہاں اس مرد کا دل، ذہن، ہر احساس، صرف ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا، یہ عورت...... یہ عورت کس قدر گڑبڑا دینے والی شخصیت ہے۔ بستر پر جنتی...... خوب صورت لگی، غصے میں تو اس سے بھی سوا ہے...... بس کیا کروں...... چبا ڈالوں، کچا کھا جاؤں؟''

سارے دن دولہن پاشا اپنے کمرے سے نہ نکلیں۔ بی بی تارا کا کمرہ برابر میں ہی تو تھا۔ لڑکیاں، بالیاں، دولہن کی جان پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ بس ایک ہی سوال تھا...... اری بتانا گے رات کو کیا کیا ہوا؟''

بی بی تارا جیسی بھولی بھالی، اب اسے کیا پتہ کہ پہلی رات کو کچھ نہ کچھ ہونا ضروری بھی ہے، وہ ہنس ہنس کر بات کو ٹالے گئی۔

عصر کے لگ بھگ دولہن پاشا اٹھیں۔ گناہ کا بوجھ انہیں اٹھنے ہی نہ دیتا تھا۔ بوجھل دل، بوجھل ضمیر اور بوجھل پیروں سے چلتی غسل خانے گئیں۔ نہا کر زرد رنگ کا کرتا پاجامہ پہنا، دوپٹہ اوڑھا، عصر کی نماز پڑھی اور ہر چند کہ عصر کی نماز کے بعد سجدے میں گرنے کی اسلام میں ممانعت ہے، لیکن وہ اپنے بوجھل اور گناہ گار دل کی مار سے اتنی شرمندہ تھیں کہ سجدے میں گر کر ماتھا رگڑ رگڑ کو خوب روئیں، اتنا کہ جانماز کا اتنا حصہ آنسوؤں سے تر بہ تر ہو گیا، مگر ان کے دل کی بھڑاس نہ نکلی...... بس ایک ہی آہ لب پہ آئے جاتی.........''

''خدایا، مجھے معاف کر دے، مالک میں بہت بڑا گناہ کری، مجھے موت دے، دے۔ رات کے کھانے پر سب کا سامنا ہونا ضروری تھا۔ وہ باہر آئیں تو داماد تو کیا سب دیکھتے ہی رہ گئے۔ ملکوتی حسن زرد رنگ کے جوڑے میں اور بھی دمک رہا تھا۔ سوگوار چہرہ، ہزار بناؤ سنگھار والے چہروں سے بالاتر نظر آ رہا تھا۔

داماد نے سلام کیا، مگر انداز میں بے پناہ شرمندگی اور ندامت تھی۔ ان کا جی چاہا، سلام کے جواب میں جوتا کھینچ ماریں۔ مگر ساری دنیا دیکھ رہی تھی، اس لئے محض گردن خم کر کے اپنی بڑائی ظاہر کرنا چاہی، لیکن کسی نے دھیرے سے جیسے کان میں کہہ دیا ہو...... ''وہ تم سے دو سال بڑا ہے......'' انہوں نے گھبرا کر سر اٹھایا اور ادھر پھر ایک مرد اپنے آپ کو مرد محسوس کرنے لگا۔ لیکن انہوں نے خود کو سختی سے سمجھایا۔

''اونہوں...... انے میرا داماد ہے......''

دادی حضور سمجھیں، پتہ نہیں پوتی کے ساتھ دولہا میاں نے کیا اودھم مستی مچائی ہو، اس لئے نوکرانیوں سے کہہ دیا، ''آج رات بچی آرام کریں گی...... ننھی سی جان کو روز روز یہ آفت نکو۔''

دولہا میاں کو یہ سندیسہ پہنچا دیا گیا کہ ''بیٹا آج گڑبڑ نکو...... ایکلے ایکلے اج سوؤ۔''

بارہ بجے...... ایک بجا...... پھر دو بجے...... پھر ساتھ والے کمرے سے بتی بجھانے کی آواز آئی۔ رات والی بتی شاید ابھی جل ہی رہی تھی، کیونکہ دروازوں سے نیلی نیلی روشنی چھن چھن کر

آ رہی تھی۔

پھر رات کا ایک اور پہر بیتا۔ باغ سے موگرے چنبیلی کی سنکتی ہوائیں دستکوں پر دستکیں دینے لگیں۔ بی بی تارا دادی کی محفوظ بانہوں میں سوئی پڑی تھی...... سارا جگ ہی سویا پڑا تھا...... صرف وہی جاگ رہی تھیں۔ لاکھ نہ چاہنے پر بھی ایک ایک بیتی گھڑی یاد آ رہی تھی۔

سوچتے سوچتے دماغ بوجھل ہو گیا تو انہوں نے چوٹی کھول ڈالی کہ اس طرح دماغ کو اور سر کو بوجھ سے نجات ملے۔ بال بکھرتے ہی عود عنبر کی جان لیوا خوشبو سارے میں پھیل گئی۔

پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ دروازے تک پہنچیں اور ہلکے سے دھکا دیا۔ کوئی جیسے تاک ہی میں تھا۔

’’آپ۔‘‘ دولہا میاں قریب آ کر حیرت اور خوشی سے بولے:۔

وہ بے بس سی ہو کر بولیں، ’’آج میں پھر نولکھا ہار‘‘ پہنی ہوں.............‘‘

◆

کوئلہ بھئی نہ راکھ

رات تاریک ہے، میرے نصیب کی طرح، آسمان پر اکا دکا ستارے ٹم ٹمارہے ہیں، ان کا میرے آنسوؤں سے کیا مقابلہ ؟

میری آنکھوں میں تو ان گنت ستارے جھلملا رہے ہیں، جھلملاتے ہی رہتے ہیں۔ کتنے دن ہو گئے، میری آنکھوں نے مسکرانا چھوڑ دیا، ایسا معلوم ہوتا ہے ہنسی سے میری شناسائی ہی نہیں۔

آج صبح سے میرا دل ہے کہ ڈوبا جارہا ہے، یوں رہ رہ کر تو میرا دل کبھی نہ دھڑکا تھا۔ مٹی کے اس ننھے منے چراغ میں ایسی کیا بات تھی کہ اس کے ٹوٹتے ہی میرا اپنا دل بھی جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں نے کتنے جتن سے، کتنے برسوں سے اس چراغ کو سنبھال کر رکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا اس چراغ سے میری اپنی زندگی کا گہرا ناطہ ہے، وہ ٹوٹے گا تو میں بھی ٹوٹ کر رہ جاؤں گی۔

اور آج ! آج تو جیسے میرا سبھی کچھ ٹوٹ گیا۔ سبھی کچھ لٹ گیا۔

لیکن میں کیسی پاگل ہوں آفتاب ! جو یہ کہہ رہی ہوں کہ آج میرا سبھی کچھ لٹ گیا، میرا تو اسی دن سب کچھ لٹ گیا تھا جس دن تم مجھے چھوڑ گئے تھے۔

امیدوں، آرزوؤں اور بھروسوں کے سارے چراغ تو اسی دن بجھ گئے تھے..........''

یہ تو میں ہی تھی کہ جو خزاں ہو کر بھی بہار بہار کرتی رہی۔

کتنی پاگل ؟ کیسی نادان (محبت کرنے والے سچ مچ نادان، پاگل ہی تو ہوتے ہیں) میں تم سے شکایت نہیں کر رہی ہوں آفتاب

شکایت اور گلے تو اپنوں سے کئے جاتے ہیں اور تم نے یہ موقع ہی کب دیا کہ میں تمہیں اپنا سمجھوں یا کہوں ؟ سوائے چند لمحوں کے، وہ لمحے جو میری زندگی کا سکون بن کر رہ گئے ہیں، کاش میں نے یوں ٹوٹ کر کسی کو نہ چاہا ہوتا۔ لیکن محبت کیا سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے آفتاب؟

اب سوچتی ہوں تو یہ سراسر پاگل پن ہی نظر آتا ہے۔ میں نے دل بھی کس سے لگانے کی کوشش کی ؟

تم سے ! تم جو سچ مچ آفتاب ہی کی طرح بلند اور دور تھے۔

لیکن آفتاب ! میں سچ کہتی ہوں، تم نے مجھے یوں حوصلہ نہ دلایا ہوتا تو شاید میں تمہاری طرف کبھی دیکھ بھی نہ پاتی، میں نے تو جبھی سے روشنی حاصل کی تھی۔ (اور تمہیں نے مجھے اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ کیسا دکھ ہے)

کتنے سارے سال گزر گئے ہیں کہ میں نے تمہارے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں۔ اور جو دیکھو تو زندگی میں تمہارے سوا اور دوسری کوئی بات ہی نہیں۔

جیسے اپنے آپ سے خود کو بچائی، چھپاتی پھرتی ہوں۔ آئینے میں خود کو دیکھتی تک نہیں کہ اپنی صورت دیکھوں گی تو تم یاد آجاؤ گے۔

اس صورت کو تم نے کتنا پیار کیا تھا، کتنا پیار دیا تھا، کتنا غرور بخشا تھا۔

ان دنوں آئینے کے سامنے جاتی تو گالوں پر گلاب سا بکھر جاتا تھا، اپنا آپا سنبھلتا نہیں تھا۔

آنکھوں کی جوت دیوالی کے چراغوں کی طرح جگمگاتی تھی۔ مجھے میرا ماتھا چاند معلوم ہوتا تھا اور ہونٹوں پر ایسی کلیوں کا گمان ہوتا تھا جو اب کھلیں، اب کھلیں۔

ان دنوں کوئی مجھ سے میرا نام پوچھتا تو مجھے جھجک سی آتی تھی۔ میں کیسے کہوں میرا نام شمع ہے۔ شمع تو جلتی رہتی ہے اور میں تو مسکراہٹوں سے عبارت ہوں۔ بھرپور بہادر اور دلکش سپنوں سے میرا وجود مہکا لہکا ہوا ہے۔

لیکن میں یہ بھولتی ہوں کہ شمع کا کام بہر حال جلنا ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں آفتاب ! کہ اگر میرا نام شمع نہ ہوتا تو کیا واقعی میری زندگی یوں نہ ہوتی ؟

لیکن تمہارا نام بھی تو آفتاب ہے۔ سورج بھی تو سدا جلتا ہی رہتا ہے، پھر تمہارے حصے میں دنیا زمانے کی خوشیاں کیسے ہوئیں اور میں کیوں غموں سے سجائی گئی ہوں ؟

شاید یہ میرے اپنے سوچنے کا غلط انداز ہی ہو، ہم عورتیں وہمی ہوا کرتی ہیں نا۔

ہاں یہ میرا وہم ہی تو تھا کہ میں ایک معمولی سے مٹی کے چراغ کو یوں دل سمجھ کر سنبھال سنبھال کر رکھتی رہی۔

اور آج اس کے ٹوٹ جانے سے یوں اداس ہوں جیسے ساری خوشیوں ہی سے میرا ناطہ ٹوٹ

گیا ہے۔ شاید یہ بات ہو آفتاب کہ اس دن تم نے ہنسی ہی ہنسی مین بہت گہری بات کہہ دی تھی۔

"شمع اسے سنبھال کر رکھنا، جس دن یہ بجھا، سمجھو اپنی محبت بھی بجھ گئی۔"

وہ دیوالی کی رات تھی۔ تمہیں تو یاد بھی نہ ہوگا۔ (اور میری تو زندگی ہی محض یاد ہے) گھر کے بچے پڑوسیوں کی دیکھا دیکھی مٹی کے چھوٹے چھوٹے دیئے کہیں سے لے آئے تھے اور چاندی کی منڈیروں پر قطار در قطار بہت سارے دیئے جلا کر رکھ دیئے تھے۔ ہم دونوں چاندنی پر آئے تو سب سے کونے والا دیا بجھا پڑا تھا۔

"ہائے غریب کا کوئی پرسان حال نہیں۔"

میں نے لرز کر کہا اور اسے ساتھ والے دیئے سے جلانے کو جھکی ہی تھی کہ تم نے ہنس کر کہا :

"آج دیئے سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہیں ہے۔"

میں نے بوکھلا کر تمہیں دیکھا تو تم اس جگمگاتی ہنسی کے ساتھ بولے تھے :۔

"ہاں جسے تم چھولو۔"

میں نے تمہاری بات کاٹ کر پوچھا :۔

"اور جسے تم چھولو ؟"

دیا میرے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ جل مل، جھل مل۔

مجھے نہیں معلوم لیکن یقیناً میرے چہرے پر اس دیئے کی لو جاگی ہوگی۔ یقیناً اس کے عکس نے میرے چہرے کو وہ جلا بخشی ہوگی کہ تم میری تمنا کرسکو، اسی لئے تم نے کہا تھا۔

"شمع ! میں ساری زندگی تمہاری تمنا کرتا رہوں گا۔"

میرا ہاتھ کانپا، یقیناً دیا گر جاتا اگر تم میرا ہاتھ نہ تھام لیتے وہ ہاتھ جو پھر تم نے کبھی نہ تھاما اور تم نے جذبات سے بھری اور بھرائی آواز میں کہا :

"شمع ! اس مٹی کے چراغ کو میں اپنی محبت کا امین بنالوں ؟"

میں وہموں کی ماری، عورت پن کی ساری کمزوریوں سمیت تمہاری طرف تکنے لگی، نہ جانے اب تک کیا کہو؟ اور تم نے دھیرے سے کہا تھا کہ :

"شمع ! اسے سنبھال کر رکھنا، جس دن یہ بجھا، سمجھو، اپنی محبت بھی بجھ گئی۔"

میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ محبت کا یہ کون سا انداز تھا کہ لے کہ ایک چراغ کو تمام تر ذمہ داریاں سونپ دیں، لیکن میں نے کہا نا، میں وہموں کی ماری تھی۔

تمہارے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے لئے جیسے آسمانی صحیفہ ہوگئے۔

مجھے سہا ہوا دیکھ کر تم ذرا مسکرائے تھے اور کہا تھا :

"اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو شمع ؟"

میں ایک دم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی، "تم نے کیسی زنجیر میں جکڑ دیا ہے آفتاب ! چراغ تو چراغ ہی ہوتا ہے کبھی ایک جھونکے سے بھی بجھ سکتا ہے۔ اب تو ہر لمحہ میرا دل رہ رہ کر دھڑکے گا۔ اللہ نہ کرے ...... اللہ نہ کرے جو یہ بجھے۔ اور جو کبھی ہوا کا کوئی سرکش اور حاسد جھونکا، میرے آنچل سے نظر بچا کر اسے بجھا ہی دے تو میں کہاں جی سکوں گی ؟"

تم کتنی اعتماد سے بھری ہنسی ہنسے تھے۔

"تو تم اتنی سیریس ہوگئیں شمع ! کیا مٹی کا یہ حقیر سا دیا میری محبت پر بھاری ہوسکتا ہے ؟"

"بات مٹی اور کانچ کی نہیں آفتاب، بات تو اعتقاد اور رواجوں کی ہوتی ہے، کانچ کی چوڑیوں میں کیا دھرا ہوتا ہے ؟

"لیکن کسی کے نام کے ساتھ جب ایک نئی بیاہتا کو پہنچائی جاتی ہیں تو اس کی زندگی کا مول ہو جاتی ہیں اور پھر وہ ساری زندگی اس کے اپنے انگ کا ایک حصہ ہوکر رہ جاتی ہیں۔ تم نے یونہی ایک بات کہہ دی، لیکن میں تو مٹ کر رہ گئی آفتاب !"

پھر وہ رات کبھی نہ آئی، جب ہم ساتھ ساتھ چاندنی پر جاتے۔

میں چراغ جلاتی، تم میری تمنا کرتے اور میں تمہاری وفاؤں پر بھروسہ کرتی۔ بس زندگی جیسے سمٹ کر آنچل کی اوٹ میں آگئی۔ میں نے اپنے کمرے کے ایک محفوظ طاقچے میں وہ چراغ اٹھا کر رکھ دیا۔

اور زندگی اس جتن میں گزرنے لگی کہ محبت کا وہ شعلہ کبھی بجھ نہ جائے، میرا بھولا پن دیکھا۔ مارے وہم کے ایک ساتھ دو دو بتیاں روئی کی بنا کر اس میں ڈال دیتی کہ ایسا نہ ہو کہ ہوا اسے کمزور پا کر بجھا ہی دے۔

ہر روز میں تیل ڈالتی، میں تو اپنا خون بھی اس میں ڈال دیتی اگر مجھے یقین ہو جاتا کہ اس طرح محبت کے چراغ دل کے خون سے امر ہو جاتے ہیں۔

سب میں اس چراغ کا چرچا ہوگیا۔ میری سہیلیاں مجھ پر ہنستیں۔

"ارے دیکھو یہ زرتشتیوں کی طرح دن رات چراغ جلائے رہتی ہے۔"

دو ایک نے تو ٹوہ لینے کی کوشش کی لیکن جس طرح منہ بند کلی کی خوشبو اسی کے تن میں چھپی رہتی ہے، ایسے ہی اپنی محبت کا راز میں نے بھی اپنے تن من میں ہی رکھا تھا۔

زمانہ بہت حاسد ہے، کون جانے کس کا دل کب پلٹ جائے، اور بعض ہوائیں اتنی سرکش اور منہ زور ہوتی ہیں۔

اور میری محبت کا چراغ تو اتنا ننھا سا ہے......

منزل سامنے ہو تو راستے کی کٹھنائیاں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ میری منزل تو میرے سامنے تھی، مجھے کس بات کا ڈر تھا۔ کانٹوں سے میں کبھی نہ ڈری، پاؤں کے چھالوں نے مجھے ہراساں نہیں کیا۔

قدم قدم، لمحہ لمحہ، بڑھتے ہوئے حوصلوں کو زمانے کے ظلم بھی نہ پیس سکے۔ حالانکہ میری زندگی ہی کیا تھی۔

غریب سی لڑکی جس نے ماں کا سکھ دیکھا نہ باپ کی محبت۔ خالہ کے رحم و کرم کے سہارے جس نے جینا سیکھا۔ دو وقت کی روٹی اور تن بھر کپڑا، جہاں زندگی کی معراج تھی اور وقت گزارنے کے لئے جہاں ڈھیروں کام تھے۔

گھر بھر کے میلے کپڑوں کے انبار، باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کے ڈھیر جھاڑنے کے لئے بڑے بڑے آنگن، صفائی کے لئے چھوٹے بڑے کمرے اور خدمت بجالانے کے لئے چھوٹے بڑے گھر بھر کے کئی کئی آقا، لیکن پیار کی ایک نگاہ، محبت کا ایک ان کہا بول، مٹی کا ایک چھوٹا سا دیا، یہ سب تیز جھلستی ہوئی دھوپ کو کیسے خنک چھاؤں سے بدل دیتے ہیں؟

اس دن دوپہر میں سب کو کھلا پلا کر ہر کام سے نبٹ کر جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو پتہ نہیں کیا ہوا گھر بھر کے بچے آ کر میرے سر ہو گئے۔

''بجیا! پلیز کہانی سنایئے۔''

''ہائے اللہ کہانی؟ اور وہ بھی دن میں، نہیں نہیں! ایسے تو مسافر راہ بھٹک جاتے ہیں۔''

میں نے گھبرا کر کہا:

نہیں باجی! آج بڑے چچا آ گئے ہیں۔ وہ ہمیں سرِ شام ہی بستروں میں گھسا دیتے ہیں کہ بچوں کو جلدی سو جانا چاہیئے۔ تو آج ہمیں آپ دن میں ہی کہانی سنا دیجئے۔''

سب کاموں سے نبٹ کر، یہ میرا تو آخری کام ہوتا تھا کہ رات میں سب بچوں کو کہانیاں کہہ کر سلاؤں، دن میں کہانیاں مجھ سے کبھی نہ کہی گئیں۔

میں سنا تھا کہ دن میں کہانیاں کہو تو مسافر راستے بھول جاتے ہیں، راہ بھٹک جاتے ہیں۔

میں وہموں کی ماری، میرا دل یہ سوچ کر ٹوٹا کرتا، اللہ جانے کون کس ادارے سے کس راہ جانا چاہتے اور راستہ بھول بیٹھے، میں کیوں کسی کی منزل کھوٹی کروں؟

لیکن اس دوپہر بچوں نے مجھے دم نہ لینے دیا۔ میری ایک نہ چلنے دی۔

''دیکھئے آپی! اگر آپ نے کہانی نہ سنائی تو ہم آفتاب بھیا کو کہہ دیں گے۔''

تم گھر کے سب سے بڑے تھے، سب تمہارا نام لے کر ایک دوسرے کو ڈرایا کرتے۔

''آفتاب بھیا!

میں تمہارا نام دل ہی دل میں گنگنا کر بولی۔

میرے خدا! یہ کس کا نام میری زبان پر ہے اور میں جیسے سب کچھ بھول کر کہانی سنانے لگی۔

کسی شہزادے شہزادی کی نہیں، اس بستی دنیا کی میری تمہاری۔

لیکن آفتاب! میں نے دیکھ لیا۔ کہنے والے غلط نہیں کہا کرتے، دن میں کہانیاں سنانے سے مسافر سچ مچ راستہ بھول جاتے ہیں۔

میں نے دن میں کہانی سنانے کی جو غلطی کی، اس کا بھگتان آج تک بھگت رہی ہوں۔ سوچتی ہوں، یہ کہانی میں نے شروع ہی کیوں کی تھی۔

اور پھر یہ ہوا کہ دم بہ دم اس چراغ کی لو نیچی ہوتی گئی۔ پھر بھی اسے جلانے اور جلانے کی اپنی سی کوشش کئے گئی۔ لیکن دل کا لہو بھی کام نہ آیا۔

آج دل کو تھوڑی بہت تسکین بس بیتے دنوں کو یاد کرنے سے مل رہی ہے۔

شاید آج کے بعد ان دنوں کو کبھی یاد بھی نہ کر سکوں۔ یہ کیسی عجیب بات تھی

آفتاب! کہ زندگی میں تم نے کبھی کھلے عام اپنی محبت کا اعتراف کیا، نہ کوٹے کھدروں میں سرگوشیاں ہی کیں۔

نگاہیں! صرف وہ تمہاری بولتی ہوئی، مسکراتی ہوئی، عہد و پیماں کرتی ہوئی، ساری دشواریوں کو پیس ڈالنے کے بلند بانگ دعوے کرتی ہوئی نگاہیں ہی تو تھیں، جنہوں نے مجھے تمہاری محبت کا یقین دلایا۔

مجھے آج بھی تمہارے ان جذبات پر ناز ہے کہ تم نے کبھی سطحی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔

سمندر کی وسیع ذات کی طرح تہ ہی تہ میں تمہاری محبت کی کارفرمائیاں تھیں۔ سطح خاموش، پر سکون۔

کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے کہ تم ایک غریب سی بدنصیب سی لڑکی سے اتنا بھرپور پیار کرتے ہو۔ یہ تو صرف میں تھی جو تمہاری محبت کی رازدار تھی۔

چند لمحے میری زندگی کا حاصل ہیں، کیسے گہرا پیار چھلک پڑتا ہے، کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں سے۔

اندھیری رات میں ایک بار سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، تم اتر رہے تھے۔

میں چاپ سن کر ہی سمجھ گئی یہ تم ہو، میں نے سوچا اللہ نہ کرے، تم کہیں گر نہ جاؤ اسی لئے میں نے ذرا جھک کر کہا تھا۔

تم نے جگمگاتی آواز میں جواب دیا تھا، ”تمہارے چہرے کا چاند جو ساتھ ہے۔“

ایک تیز دھوپ والی دوپہری میں تم باہر سے آئے تو میرا دل رو اٹھا۔

”ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو لیجئے، کیسی سخت دھوپ سے آپ ہو کر آئے ہیں۔“

”دھوپ؟......“

تم نے مسکرا کر کہا تھا:۔

”میں جدھر جاتا ہوں، تمہاری ان لانبی لانبی زلفوں کا سایہ مجھ پر چلتا جاتا ہے۔“

ایک چاندنی رات۔

چاند کے بھرپور حسن کے مقابل تم نے میرا حقیر وجود کھڑا کیا تھا اور اپنی جوان سانسوں اور مظبوط ہاتھوں کے ساتھ میرے قریب تر ہو کر مجھے چھو کر کہا تھا:

”چاند میں اتنا نور کہاں ہے؟“

میرے وہموں کے ساتھ ساتھ زندگی میں قدم قدم پر کیسے بھرپور بھروسے تھے!

آج بھی تو چہرے کا وہی چاند ہے، زلفوں کی وہی عطر بیز اور ٹھنڈی گھٹائیں ہیں۔

آنکھوں کے، انتظار میں بسے ہوئے، ڈوبے ہوئے دیئے ہیں لیکن تم نہیں ہو۔ اور تم کیا جانو، صرف تمہارے نہ ہونے سے ان زندگی کا کیا رنگ ہے؟

میں سوچتی ہوں آفتاب! لکڑیاں کتنی خوش نصیب ہوتی ہیں کہ دھواں دھواں ہو کر راکھ ہو سکتی ہیں، ہو جاتی ہیں۔

میں پاپن تو دھواں بنی نہ راکھ جلی۔ لمحے لمحے کی سنگ دل واردات میرے دل سے پوچھو اور یہ دیکھو میں بھی کیسی سخت جان تھی جو زندہ رہی، زندہ ہوں۔

وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

تم بے حد شادماں، بشاش اور بہت گہرے عزم سے میرے پاس آئے اور بولے:

”شمع! زندگی کتنی خوب صورت ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ایک اور چیز خوبصورت ہے، پیسہ!“

میں سر سے پاؤں تک لرز گئی اور بری طرح چونک کر تمہیں دیکھنے لگی۔

تم اک دم شفاف سی، بے داغ سی ہنس ہنس پڑے۔

”گھبرا گئیں؟ میں صرف یہ کہہ رہا تھا شمع، اب زندگی اس مقام پر آ گئی ہے کہ میں چاہوں تو خوشی سے تمہیں اپنا لوں، مجھے بھلا کون روکے گا؟

”لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم نے جو زندگی میں اب تک صرف دکھ اٹھائے ہیں، غریبی ہی دیکھی ہے تو اب اس راستے کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ اپنائیں جہاں خوشی ہو، محبت ہو اور زندگی کا ہر عیش بھی ہو......“

میں بے حد سہمے دل کے ساتھ سنتی رہی تھی۔

”شمع! پہلے میں ذرا اپنی لائف بنا لوں، میرا مطلب ہے کچھ پیسہ جمع کر لوں، کاروار خرید لوں، پھر ٹھاٹھ سے تمہیں بیاہ لے جاؤں، تمہیں بھی تو زندگی کا کچھ حسن ملے۔“

تمہاری محبت کے بدلے شاید میں نے اپنی زبان رہن رکھ دی تھی، کبھی تمہارے سامنے ہونٹ نہ ہلا پائی تھی۔ لیکن جیسے میرا رواں رواں چیخ اٹھا:۔

”مجھے پیسہ نہیں چاہیئے آفتاب! مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے، مجھے اپنے پیارے ہاتھوں کے ہار پہنا دو۔ اپنے گرم گرم ہونٹوں کا ٹیکہ میرے ماتھے پر سجا دو میرے سہاگ اور محبت کی بس اتنی ہی مانگ ہے۔“

لیکن میں نے کہا نا کہ میں نے تمہارے آگے صرف اپنی آنکھیں جھکانا ہی سیکھا تھا اور تم چلے گئے۔

یوں کہنے اور سننے میں کتنی معمولی سی بات لگتی ہے کہ ایک شخص کو جانا تھا اور وہ چلا گیا۔

لیکن یہ میں نے انہی دنوں جانا کہ جگمگاتا چاند تاریک کیوں کر ہو جاتا ہے۔ پھول اپنا حسن کیسے کھو دیتا ہے، بہاریں خزاؤں سے کیسے بدل جاتی ہیں:۔

اور دھیرے دھیرے ہنسنے مسکرانے والے ہونٹ اپنی مسکراہٹیں آنسوؤں کو کیسے تج دیتے ہیں؟

اور تم سے یہ بتا دوں آفتاب! کہ تم نے میری آنکھوں کے لئے جو ایک بہت پیاری اور

انوکھی سی تشبیح دی تھی کہ میری آنکھیں دیکھوتو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچے ہیرے جگر مگر کرتے ہیرے اللہ میاں نے کوٹ کر یہ آنکھیں بنائی ہیں تو وہی آنکھیں اپنی جگمگاہٹ کھو کر جیسے دو بجھے ہوئے چراغ بن کر رہ گئیں۔

جہاں حوصلہ ہو وہاں ارادے بھی ساتھ دیتے ہیں۔ تمہارے بے پناہ حوصلوں نے تمہیں کامیابی سے ہمکنار کردیا۔ آج یہاں کل وہاں، تمہارا بزنس پھیلتا چلا گیا۔ تم امیر سے امیر تر ہوتے چلے گئے۔

خوب صورت کوٹھی، فون، فرج، نوکر چاکر اور گاڑیاں تو یوں بدلے جانے لگیں جیسے کوئی کپڑے بدلتا ہے۔

میں بھی سب کے ساتھ نئی کوٹھی میں اٹھ آئی تھی۔ ایسی زندگی جس کا تصور انسان خوابوں میں ہی کر سکتا ہے، اب سبھی کا اور میرا مقدر تھی۔

(لیکن تم کہاں تھے ؟)

دولت آئی تو زندگیوں میں مغربیت دخیل ہونے لگی۔ لیکن میں جس مقام پر تھی وہیں رہی۔

سورج مکھی کے معصوم اور نادان پھول کی طرح جو سدا سورج ہی کی طرف تکتا رہتا ہے۔

ایک رات سب لوگ کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے، فون کی گھنٹی اچانک بجنے لگی۔

میں نے ہی فون اٹھایا، تم تھے، دہلی سے بات کر رہے تھے۔

اتنی دور سے، میرا دل لرز اٹھا۔

''ہیلو ! میں آفتاب بول رہا ہوں، ادھر کون ہے ؟''

میں ڈوبتے دل سے بولی :۔

''میں...... میں شمع ہوں۔''

''کیا کر رہی ہو ؟''

''جل رہی ہوں۔''

ادھر سے ایک بھرپور ہنسی۔

''افوہ! تم تو ڈائیلاگ بول رہی ہو۔

نہ جانے ایک ساتھ کتنے سارے آنسو میری آنکھوں میں اُمڈ پڑے۔ میں نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

بنتے بگڑے جملوں کو میرے آنسوؤں نے بھگو بھگو دیا۔

''آفتاب'' میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، تم آتے ہو پھر چلے جاتے ہو، پھر آتے ہو، پھر چلے جاتے ہو۔

مجھ سے بات کرنے کا وقت تمہارے پاس نہیں ہوتا۔

یہ چہرہ آج بھی چاند ہے، آنکھیں آج بھی ہیروں کی طرح دمکتی ہیں۔ زلفوں میں آج بھی ساون کی گھٹائیں جھومتی ہیں، لیکن تم کہاں ہو آفتاب؟

ادھر سے فون کٹ ہوگیا۔

تیسرے دن پلین سے تم آئے۔

شوفر گاڑی لیکر ایرڈرم گیا تھا۔

تم نوابوں کی سی شان تمکنت کے ساتھ اترے۔ کچن کی ایک کھڑکی کاریڈور میں کھلتی تھی، تم ادھر ادھر دیکھتے چلے آرہے تھے جیسے کسی کو ڈھونڈ رہے ہو، شاید تمہاری آنکھوں کو میری تلاش ہو؟

میں نے دکھے دل سے سوچا، لیکن تم اپ اپ کرتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ شام کو میں پودوں میں پانی دے رہی تھی کہ تم باغ میں نکل آئے۔

''ارے شمع! تم؟ مالی کہا ہے؟ یہ تم کیا کرتی رہتی ہو ہمیشہ؟ کام کام اتنے سارے نوکر جو ہیں۔

میں نے پہلی بات بے خوفی سے تمہاری آنکھوں میں جھانکا۔

''آفتاب! کبھی پھول ایسے تو نہیں ہوتے ہیں جو مالی کے ہاتھوں کھل سکیں۔

اک دم تم چونکے

''تم آج کل بہت ڈائیلاگ بولتی ہو۔ ایں اور بھئی اس دن ٹرنک کال پر تم یہ کیا نادانی کرنے لگیں؟ کوئی ایسے رویا کرتا ہے؟ میں نے گھبرا کر رسیور ہی رکھ دیا۔''

میں کچھ نہ بولی۔

پودوں میں پانی ڈالتی رہی۔

لڑکیاں بہت احمق ہوتی ہیں، زندگی بھر محبت کے پودوں میں امیدوں کا پانی ڈالتی رہتی ہیں، اور میں بھی تو ایک لڑکی ہی تھی، سب لڑکیاں جیسی بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی نادان۔

اور مجھے اس دن پر حیرت ہے، جب میں اتنی بے باک ہوگئی تھی کہ تمہارے مقابلے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ تمہارا احسان تھا یا ظلم، پتہ نہیں،

بہرحال تم نے مجھے نئے کپڑوں اور زیوروں سے لاد دیا تھا۔

سبھی سے تمہارا یہ مطالبہ تھا کہ گوندنی کے پیڑ کی طرح زیوروں سے لدی رہیں۔ تم کسی کام

سے اندر آئے تو، تھے تو بڑی لپک جھپک میں، لیکن مجھے دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔

"شمع! یہ دوپٹہ"

میں نے تمہاری بات کاٹ دی:۔

"اسے میرا مقدر سمجھ لو، سیاہ، تاریک۔ اور ان ستاروں کو آنسو، شاید یہ نشانی تمہیں کچھ سوچنے پر اکسائے۔"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو شمع ؟"

میں پھٹ پڑی :۔

"آفتاب ! مجھے مت آزماؤ، خدا کے لئے مجھے مت آزماؤ۔ میں گھٹ رہی ہوں، مر رہی ہوں، تمہیں کچھ احساس نہیں ہوتا۔"

آنسوؤں نے میرا گلہ رندھا دیا :۔

"آج میں تم سے تمہیں کو مانگتی ہوں، بولو آفتاب ! جب اللہ نے تمہیں دنیا جہان کی نعمتوں سے نواز دیا ہے تو مجھے کیوں ٹال رہے ہو ؟"

"پاگل نہ بنو شمع، میں تمہیں ٹال وال نہیں رہا ہوں بھائی۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ابھی میرے سامنے اتنے پروگرام ہیں کہ میں خود گڑبڑا گیا ہوں۔

"دیکھو ! پندرہ دن بعد مجھے لندن جانا ہے، وہاں سے لوٹوں تو شاید کئی دنوں کے لئے دہلی جانا پڑ جائے، اگلے چھ مہینوں میں مجھے پیرس، ہانگ کانگ۔"

میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، میں چیخ اٹھی :۔

"آفتاب ! سونے کے مت بن جاؤ۔ خدا کے لئے گوشت پوشت کے گھر کے لڑکے کاریں اڑائے پھرتے۔ لڑکیاں نئے نئے فیشن کے کپڑوں اور زیوروں سے سجی بنی کوٹھی پر اپنی سہیلیوں اور دوستوں کے ساتھ ہنگامہ مچائے رکھتیں۔"

اور تم جوان دنوں نعوذ باللہ سب کے پالن ہار بنے ہوئے تھے، یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے کہ سب لائف کو کس قدر انجوائے کر رہے ہیں۔

اور یہ دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے کہ میں اتنی خوشیوں کے باوجود کس طرح، بے طرح اداس رہتی ہوں۔ پہننے اوڑھنے سے مجھے رغبت نہیں، گھومنے پھرنے کا شوق نہیں آنے جانے میں دل نہیں لگتا، محفلوں سے بھاگتی ہوں۔

میں کیا کرتی آفتاب ! میرا تو دل ہی جیسے مردہ ہو گیا تھا۔

تم سچ مچ ہی آفتاب بن کر رہ گئے تھے۔ جسے ہر لمحہ دیکھ تو سکتے ہیں، ہاتھ بڑھا کر چھو نہیں سکتے۔ اپنا نہیں سکتے۔

اس دن تم کلکتہ سے آئے ہوئے تھے، تم نے اپنے دوستوں کو ایک پارٹی دے ڈالی۔

انتظام تو میں نے ہی کرنا تھا سو کر دیا۔ لیکن ان ہنگاموں سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی ؟ تم نے مجھے جتا دیا تھا :۔

"دیکھو شمع ! خدا کے لئے آج ذرا اچھے کپڑے پہننا اور خوب صورت، خیر وہ تو تم نظر آؤ گی ہی !"

میں نے بے حد بے دلی سے وہ جوڑا پہن لیا جس سے میری دیرینہ یادیں وابستہ تھیں، جن دنوں تم غریب تھے لیکن میرے تھے۔

سیاہ شلوار، سیاہ قمیض اور سیاہ دوپٹہ، جس پر ستارے ٹنکے ہوئے۔ انسان بنے رہو کہ میں تمہیں پا بھی سکوں۔ چھو بھی سکوں، اور چھوؤں تو احساس بھی کر سکوں کہ میں نے محبت اور پیار سے بھرپور دل کو، جسم کو چھوا ہے۔ یہ احساس نہ ہو کہ میں نے ایک سونے کے مجسمے کو محبت دی ہے۔

تم ہکا بکا رہ گئے۔

شاید تمہیں توقع نہ تھی کہ میں جو سدا ایک گونگی کے کردار میں تمہارے ڈرامے میں پارٹ کرتی رہی، یوں بول بھی سکوں گی۔

میں اچانک دیوانوں کی طرح اٹھی اور اونچے کارنس پر سے وہ ننھا منا چراغ اٹھا لائی جو میری امیدوں کی طرح رہ رہ کر ٹمٹما رہا تھا۔

"اسے پھونک مار کر بجھا دو آفتاب ! اب میں زندگی سے ہار گئی ہوں، مجھ میں وہ حوصلہ نہیں کہ اسے میں دل کا خون بھی دے کر زندہ رکھ سکوں۔"

تم نے چراغ کو بے معنی نظروں سے دیکھا، اسے بجھایا نہیں (لیکن جلایا بھی نہیں)۔

اس رات کی پارٹی کی ایک بات مجھے یاد رہ گئی ہے۔ تم نے اپنے دوستوں کا ہم سب بہن بھائیوں سے تعارف کرایا تھا اور تمہارے ہی ٹکر کے ایک بزنس مین دوست اسلم نے مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت بے حد شدید حیرت اور سچائی کے ساتھ کہا تھا :۔

"یار آفتاب ! کیا بے وقوفی تھی، آج کے دن تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ حوریں مرنے کے بعد ہی ملیں گی۔"

پھر چند دنوں بعد خالہ امی نے میرے سامنے ایک عجیب و غریب "بات" پیش کی۔

''بیٹی ! تم جانتی ہو، آفتاب کتنا روشن خیال لڑکا ہے۔ اس نے اپنی بہنوں کو بھی بے جا پابندیوں سے دور رکھا ہے اور تمہیں بھی وہ اپنی بہنوں کی طرح ہر عیش و آرام مہیا کرنا چاہتا ہے۔ اسلم آفتاب کا بہت گہرا، بہت پیارا دوست ہے۔

''اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے تمہیں بے حد پسند کیا ہے۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

وہ کچھ ٹھہر کر بولیں :۔

ہم سب اور خاص طور سے آفتاب اس رشتے سے بے حد خوش ہیں۔''

اس کے بعد تو سننے کے لئے کچھ بھی نہ رہ گیا۔

میں اس اصول کی قائل ہوں کہ محبت ایسا جذبہ ہے جو زبردستی کسی سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ جب تمہیں نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں تمہارے سامنے اس گھر میں رہ کر کیا کرلیتی؟

میں تو بہر حال ایک بوجھ تھی، جو کسی نہ کسی سر پر لادیا جاتا۔ میں نے ہاں، نہ کچھ بھی نہ کہا، بس اپنا سر جھکایا۔ اب میں سر اٹھا کر جی بھی کیسے سکتی تھی؟

لیکن یہ کیا دکھ ہے آفتاب! جو جی سے جاتا ہی نہیں، میں کہانیاں پڑھتی تھی جن میں ہمیشہ دو محبت کرنے والوں کے بیچ زمانہ، سماج یا کوئی رقیب آڑے آجاتا تھا۔

محبت اسی لئے سدا مثلث ست تعبیر کی جاتی رہی ہے۔ لیکن میرے نصیب میں یہ کیسا غم لکھا تھا کہ نہ کوئی سماج میرے لیے دیوار بنا، نہ زمانہ نے اڑچن ڈالی، نہ کوئی رقیب ہی پیدا ہوا۔ تمہیں میرے سب کچھ تھے اور تمہیں نے مجھے بھری بہار میں لوٹ لیا۔

تمہیں نے سہاگ کی بندیا میرے ماتھے پر سجائی اور تمہیں نے مٹا دی۔ جیون مرن کا سارا کھیل تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچا۔

میں جب بیاہ کر نئے گھر آئی تو وہ دیا اپنے ساتھ ہی اٹھا لائی۔ اسلم نے دیکھا میں دیئے کی ایسی دیوانی ہوں تو اس نے میرے گھر کو سدا دیوالی کا روپ دے دیا۔

ننھے منے رنگین، یہاں سے وہاں تک سارے لان میں، درختوں میں، حد یہ کہ ننھے منے پودوں میں لگوا دیئے۔

''تمہیں اجالوں سے پیار ہے اور مجھے تم سے۔''

اور اس نے محبت سے سرشار ہو کر بے حد عام شوہروں والی ہزار بار کہی بات دہرائی۔

''جان! یہ حقیر قمقمے ہیں، تم کہو تو میں آسمان کے سارے جگمگاتے ستارے توڑ کر تمہارے

آنچل میں ڈال دوں۔

اسلم بے چارے کو نہیں معلوم آفتاب! کہ جن ستاروں کو توڑ لانے کا جتن وہ کرتا رہتا ہے وہ آج سے سالوں پہلے تم نے چن چن کر میری آنکھوں میں بسا دیئے ہیں۔

مجھے اسلم پر کیسا کیسا ترس آتا ہے۔

اس بے چارے نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے محبت سے محروم زندگی ملے۔

اور پھر اتنا ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر۔

اسی لئے۔

آج میں نے اپنے ہاتھوں سے اس مٹی کے دیئے کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔

میں ان یادوں کے لئے کیوں اپنا جیون برباد کروں، جو مجھے خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں دے سکتیں۔

لیکن صبح سے اب تک میں ایک لمحہ کو بھی سکون نہیں پاسکی ہوں

اور آنسو تو ......

یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں جیسے ساری دنیا بہالے جائیں گے۔

دل کی دکھن کا یہ عالم ہے جیسے چھالے تپ رہے ہوں۔

بے پناہ خوشیوں، محنت کرنے والے ساتھی اور رنگین بہاروں میں گھری ہونے کے باوجود جیسے میری روح ترس ترس کر کراہتی ہیں۔

میں تنہا ہوں،

میں اکیلی ہوں، میں اکیلی ہوں۔

* * *

نکو اللہ

ایو میرا دل...... انے میرا دل کیسے سوکھے مارے پتے ویسا لرز را جی !! ایو میرے ہاتھا پاواں ایسے ٹھنڈے کائے کو پڑ گئیں مولا...... ابھی ابھی تو مئیں چھوٹے پاشا کے سنگات انون کے ہولڈال کے بنان کس لینے رئی تھی...... ابھی ابھی تک کا تو مئیں اپنے آپ کو ﺋﭻ دنیا کی ایک رہنے والی معلوم پڑتی تھی...... پن اب میرے کو کیا ہوگا...... میرے مئین یہ ہمت کاں سے آگئی تھی۔ کبھی وخت تو مئیں ویسی حرکت نئیں کری...... پن اب......

مئیں تو اس محل کی وہ پالکڑی چھوکری تھی جو کوئی کو، کسی موچے پر نئیں بولی...... جو، جو بھی کام بولے، کردی۔ کر کو نہ دیتی تو کرتی بھی کیا مئیں...... میری ہمت اچ کیا پڑتی کی بڑے بڑے پاشا لوگاں کو نکو بولتی۔ ایسا بھی وخت آیا کی کالے کالے راتوں کو جب ٹھنڈے ٹھنڈے ہوایاں چل رئے ہوتے مئیں مزے میں خرخر پڑی سوتی ہوتی کی کوئی نہ کوئی آن کو جگا دیتے......

”ایو نواب زادی اٹھ۔ گوری پاشا کے کمرے کے انگاران گلس کو گلس گئیں۔ جا برچی خانے سے انگاران بھر لے کو آ۔“

اور میرے کو اتی رات کو، ایسی پکی نیند سے اٹھ لے کو جانا ﺋﭻ پڑتا۔ اپنے کمرے سے برچی خانے کو جانے تک کا، میرے ہاتھاں، پاواں ٹھنڈے ہو ہو کر سکڑ سکڑ جاتیں...... پن پاشا لوگاں کا حکم ٹالتے نہ بنتا۔ مئیں تو دھنا دھن جوتے چپلاں کھا کھا کو بھی چپ چاپ ﺋﭻ رہی، پھر میرے کو یہ کیا ہو گیا تھا۔ میرے مئیں یہ نئی خوت، یہ نئی طاخت کاں سے آگئی تھی۔ اج کے دن میرے کو ایسا کیوں معلوم پڑا کہ مئیں بھی کوئی چیز ہوتی۔

ابھی ابھی تھوڑی دیر اول کی تو بات ہے کی بڑے پاشا جھنپا جھپ ایک ایک کام کروا لے رئے تھے۔ ہاتھ میں کاغذ لے کو انوں ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر دوڑ دوڑ کو آ جا رہے تھے۔

”وہ بڑا اگلدان رکھ لئے نئیں، جو میں مراد آباد سے لایا تھا۔“

”وہ چاندی کا پاندان رکھے کیا نئیں جی...... جو بڑی پاشا جہیز میں کو آئے تھے۔“

”اگے وہ صراحی بولے تو نئیں جس میں گرمیاں بھی رہو تو پانی ٹھنڈا اچ ہو کو نکلتا......“

یہ سوب ابھی ابھی کے تو باتاں ہیں نا جی...... پن اب کے اب میں مئیں کیا کر ڈالی......

ہندوستان بٹا سو وخت میں بہت چھوٹی تھی۔ خدود تو اچھا تھا، پن عمر چھو ﺋﭻ تھی۔ اتی چھوٹی کہ امنی میرے سر کے بالاں پہ بول کر مونڈ دیتی تھی، کی لڑکیوں کے سر پہ جھو پالا کے جھو پالا خوب گھنے بالا ﺋﭻ اچھے دکھتے۔ میرے کو میری عمر کا حساب یاد نئیں...... پن کی اتا یاد ہے کی محل کے مولانا کے اگو، سب پاشا لوگ کے ساتھ مئیں بھی بیٹھا کرتی تھی۔ نئیں میں کائے کو بیٹھتی...... ایسا کیا میرے کو پڑھنے لکھنے کا شوخ تھا۔ وہ تو میری امنی کو بڑا سوئلہ تھا کہ میرے کو پڑھنا لکھنا آ جائے...... ”مولانا کے اگو مئیں بیٹھتی تو تھی پن دوسرے بی بی لوگاں میرے کو بات بے بات، کام رہو چاہے نہ رہو، البت کر کو اٹھا دیتیں۔ ان لوگاں شاید یہ چاہتے ہوں گے کی نوکرانی کی بیٹی ہے۔ اس کو کائے کو پڑھنا لکھنا ہوتا...... مگر ہوا ایسا کہ اسی اٹھک بیٹھک میں، ﺋﭻ میرے کو پڑھنا لکھنا آ گیا۔ اتا امنی کے پاس گاؤں سے کوئی خط آتا تو مئیں پڑھ کو سنا دیتی۔ ہور امنی کو جواب دلوانا ہوتا تو مئیں لکھ کو دے ڈالتی...... امنی کو بڑی خوشی ہوتی، کی مولیٰ نے وہ دن بھی دکھایا کہ میری بیٹی خلم چلانا سیکھ گئی۔

ہو تو مئیں یہ بول رہی تھی کہ جب یہ ہندوستان بٹا سو وخت مئیں بہوت چھوٹی تھی...... پھر بعد کو ہوایوں کی مئیں ہوا کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگی...... امنی کو حیرت ہوتی تھی کی مئیں پن میرے کو تو لگتا تھا کی بیٹھے بیٹھے میں بڑھتی ﺋﭻ جا رہی ہوں۔ جو چھوٹے بی بی لوگاں میرے ساتھ کے تھے انوں تو جیسے وہاں کے وہا ﺋﭻ تھے پن مئیں تو اک دم لمبی ہوتی جا رہی تھی۔

انے معلوم نئیں ہمارے محل والوں کو کون ایسی ہونڈی سیدھی پٹی پڑھائے کی سب کے سب لوگاں اکدم سے پاکستان بول بول کو ادھر چ گھسر نے لگے۔ اب میرے کو اتا خیال تو نئیں پن یہ اچھے طرحوں سے معلوم ہے کی جب سوب جانے کے باتاں کرتے تھے تو کوئی نئیں بولتا تھا کی میرے کو اور امنی کو بھی لے کو جائیں گے...... وہ دنان ایسے تھے کی مئیں ہرنی کے ویسا جگو جگو اڑتی پھر لیتی تھی۔ ایک دن ایسا ﺋﭻ میں، بنچے کے پچھواڑے میں، پکی روش سے ہٹ کو کچے کچے امیاں توڑ رئی تھی کی اندر سے باتاں کرنے کی آواز آئی...... بڑے پاشا بول رہے تھے......

”ہم کو کیا وہاں جا کو لنگر خانے کھولنا ہے کیا......؟ اب اتنے دنان رکھے سو رکھے اب سوب کو

چھٹی دے کر بڑھا دیو۔“

میں کچھ بات تو سمجھی کچھ نہیں سمجھی۔ ایک خدم آگے بڑھائی اور کھڑکی سے لگ کو کھڑی ہوئی۔ پھر شاید بڑے ماموں بولے...... ”تو کیا پاکستان جا کو آپ لوگاں چولہا چکی سنبھال لے کو رہیں گے؟“ یہ بات شاید بڑے پاشائیں سوچے تھے۔ انوں تھوڑی دیر تو غپ چپ رہے، پھر بولے :۔

”ایسی بات ہے تو جو نمک حلال نوکران ہیں ان ان کو سمیٹ لینا۔“

اور آگے جو باتاں چلے تو یہ سن کر میرا خون کھول کر رہ گیا، کی نمک حلالاں کی فہرست میں میری امنی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا...... ایو پاشا یہ تم کیا باتاں کو لے بیٹھیں۔ میں اپنے آپ میں بولی...... بھلا میری امنی سے بڑھ کر نمک حلال تم کہاں ملتی ہور کہاں ملی۔ کیا تم وہ دنان بھول گئیں کہ جب میری ماں تمہارے محل میں نوی نوی آئی تھی ہور اپنے گلے کی بچھڑی جیسی بکری کی طرحوں سے بولائی بولائی پھرتی تھی...... پھر یہ بچ تو تھے نا کی ایک رات کو تم نے میری ماں کے ہاتھ پکڑے...... پھر پہونچا پکڑے...... ہور اب آگے کیا بولوں؟ میری ماں آخر کو بھی غریب گھر کی تھی۔ تمہارے ٹکڑوں پو آ کو پڑ گئی تھی اور یوں پالکڑی بن کو مشہور ہوگئی تھی۔ یہ تمہارا حیدر آباد بھی خوب ہے پاشا...... نوابوں کا یہ دیش اندر سے کیسا کالا ہے۔ حیدر آباد نگینہ مگر نیچے مٹی اوپر چونا۔ اب کوئی کیا سمجھے یہ اوپر سے جھم جھم چمکتا تمہارا حیدر آباد اندر سے کیسا کالا کلوٹا ہے...... یہاں پر تو عزتوں کو تم لوگاں ایسا نیلام کرے کی مولی بھاجی بھی ایسا نئیں بیچتا۔ میری ماں اپنی زندگانی کے سارے سکھاں، سارے ارمان، سارے آرزوان، بھول بھال کو تمہارے در آ کو پڑی اور اوپر سے تم ایسا بولتے کہ انے نمک حلال نئیں...... خوب ہے تمہاری بادشاہت۔

میری ماں قسمت کی ماری انے کیسا تو کر کے بڑی پاشا کے محل میں آ گئی، اب میں حیدر آباد کی رہنے والی ہوگئی تو میرے کو یہاں کے تمام ریتان، رسمان...... طور ان طریقے معلوم ہوگئے۔ یہ حیدر آباد کی کاچ چلن ہے کی اچھے بھلے لڑکیوں کو بڑے لوگاں لے لے کو پال لیتے اور انوں بے چارے ہالکڑے کے نام سے مشہور ہو جاتے...... پالکڑے بولے تو پالے ہوئے، میری امنی بھی ویسی بچ بدنصیب تھی۔ پہلے تو بڑے پاشا دولہن سے طے ہوا تھا کی انے چار پانچ مہینے کام کو لے کو رہیں گی۔ کبھی اچھے طرحون سے کام کری تو آگے ہمیشہ کو رکھ لیں گے...... مگر چار پانچ مہینے تو چھوڑ چار پانچ دنان بھی گزرے نئیں تھے کی انے میری امنی بڑی سرکار کو پسند آ گئی اور ایسی ہی چکمکا کر

پسند آ گئی کی انوں میری نانی سے میری ماں کو ہمیشہ کے واسطے خرید لئے...... اور یوں میری ماں جو تھی تو پالکڑی بن کو رہ گئی۔

مگر امنی کی حسمت بری تھی۔ پہلے تو بڑے پاشا، امنی کو اپنے خواب گاہ میں خالی پیران، ہاتھان دبوانے کو بلاتے رہے...... پھر کیا دل میں آئی تو ہور آگے بڑھے...... سوچنے والے سوچن گے کی گھر کے بڑے منع کرنے کو مر گئے تھے کیا؟ تو شاید ان کو معلوم نہیں کی یہاں کا خائیدہ تھا کی جان بوجھ کو خدمت گزاری کو باندیاں بندوڑیان رکھتے تھے......

”خدا دولت دیا تو اس کا مصرف تو یہی ہے کی لڑکے بالے جی خوش کر سکتا۔“

”بڑے پاشا بھی اپنا جی خوب خوش کرے۔ یہ کون دیکھتا کی اپنی خوشی کے آگے دوسرے کی خوشی بھی ہے کی نہیں۔ وہاں تو بس سب کچھ اپن ہی اپن تھے۔ میری امنی میرے سے سناتی کی جب کبھی شہر میں ڈھولان بجتے اور براتان نکلتے تو میرا جی چاہا کرتا تھا کی میں نے بھی ایسی بچ دولہن بننا۔ کوئی ڈھولان بجا بجا کو، لال لال جوڑا لے کو آنا، اور میں نے سج دھج کر پالکی میں سوار ہو کر شرماتے ہوئے جانا، مگر امنی کے سنگات تو یہ ہوا کی ڈھولان بجے نہیں برات آئی نہیں کس کی شرم؟...... کدھر کی سج دھج؟ بڑے پاشا ہاتھ پکڑ کو پہونچا پکڑے، کلائی پکڑ کو بستر میں گھسیٹے اور سارے ارمانان ہوا ہو گئے۔ نہ کوئی پوچھ گچھ کرنے کو خالی تھا، نہ ایسی بری بات تھی یہ، بلکہ اگر کوئی پالکڑی یونہی ”خالی“ دکھتی تو سب چھوکریاں چھیڑ چھیڑ کو پوچھے کی...... ”انے کیا تیرے کو کوئی پسند نہیں کرا کی خالی گھوم رئی......“ اس خالی کا مطلب اس سے تھا جو حاملہ نہ رہتی...... جو خالی رہتی اس میں کوئی نہ کوئی کمی رہتی اور جو ”بھری“ رہتی وہ پاشا لوگوں کے مذاخ پر پوری اترتی۔ میری ماں تو اچھی حسمت لائی تھی کی آتے ہی بھری بھری گھومنے لگی اور جب پھر سے خالی ہوئی تو نتیجے میں اس کی گودی میں تھی۔

”لوگاں کہتے میں بڑی خوبصورت پیدا ہوئی تھی۔ میرے آنکھاں یہ بڑے بڑے تھے۔ گالاں خوب لال لال۔ سر پر تو جیسے کسی نے ٹوپی ہی پہنا کر رکھے تھے۔ جھنڈولا بالان گھنے ہو راتے پر رنگ بھی خوب تھا کہتے میں پیدا ہوئی تو کوٹھری میں جیسے روشنی ہوگئی۔ وہی اچ دنوں میں دلی سے بڑے پاشا رشتوں کے بھائی آئے تھے۔ میرے کو آ کے دیکھے تو بولے...... ”اتنی خوبصورت بچی کا نام تو بس سویرا رکھنا......“ یہ بات سن کو سب اتا ہنسے کو پیٹوں میں بلاں پڑ پڑ گئیں“...... ”اگے صبح ہوتی تو اس کو سویرا بولتے۔ یہ کوئی لڑکیاں بالیاں کے رکھنے ویسا نام

ہے کیا۔ لوگاں سنیں گے تو کیا بولیں گے……؟''

''بولتے بھئی کی انون شاعر تھے اور اپنے دل سے گیتاں جوڑتے تھے……انون بولے۔ آپ لوگاں تو جانواراں ہیں۔ آپ کو نام کی خوب صورتی کیا معلوم۔ یہ الٹ پلٹ ناماں صنوبر، صندل، گل چمن، نوبہار، چنبیلی، گلاب، گیندا اتو پرانے زمانے کے لوگاں رکھتے تھے۔ گھدون کو زعفران کی کیا پرکھ……

انون کے نام کی ابھی ہنسی اڑچ رئی تھی کہ ایک دم سے کہتے میری ماں نے آنکھاں کھولی اور بولی:

''اس کا نام سویرا اچ رکھنا۔ کیا معلوم اس کا نام اس کی زندگی کو ویساچ بنادے جیسی کی روشن صبح ہوتی۔''

وہ دلی والے سرکار میری ماں کے منہ سے یہ بات سن بولتے اتے حیران ہوئے کی ایک جاہل عورت نے ایسی بات کیسی بولی۔ مگر پھر ہوایوں کی میرا نام سویرا ہی رکھے۔ پہلا پہل تو سوب کو میرا نام بہوت اوکل اوکل لگا پن بعد کو سارے لوگاں عادی ہو گئیں۔''

مئیں چھوٹی تھی پن یہ دیکھتی ہور سمجھتی تھی کی میری ماں کے منہ پر کبھی ہنسی نئیں آتی تھی……دیکھنے دکھاتے میں وہ تو ایسی اچھی تھی کہ پہنا اوڑھنا کو بٹھا ڈالتے تو گاں بچ پوچھتے کی……''انے بھئی کوئی جاگیردارنی ہے کیا……؟ مگر میری امنی تو بے چاری پہننے اوڑھنے تک کو دوسروں کی طرف دیکھتی تھی۔ وہ کاں کی جاگیردارنی تھی۔ ویسے جاگیردار کی بیوی کو لوگاں جاگیردارنی بچ بولتے……اور ویسا دیکھو تو میری امنی بھی تو جاگیردار کی، نواب کی بیوی جیسی تھی، پن اب یہ کون دیکھتا ہے……وہ تو آسمان پو پہونچ کو بھی زمین بچ رئی۔

جیسا جیسا میرے کو سمجھ آنے لگی مئیں یہ بات سمجھتی گئی کہ اس گھر وائے میں تو ہنسنا بولنا بھی اپنے بس کا نئیں……پاشا لوگاں جو چاہ لیتیں کرتیں۔ پن اپنا تو یہی حال تھا کی خدم خدم پر دیکھ دیکھ کو چلو……میری امنی کے آنکھاں ہمیشہ پانی سے بھرتے رہتے۔ جب میں نے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھ گئی، تب میں نے سوچی تھی کی اپنی امنی کی ایک کہانی لکھنا……امنی کو یہ بات مئیں بولی تو ان کو بڑی ہنسی آئی، بولے……''بٹیا کانیان تو بڑے پڑھے لکھے لوگاں لکھتے……اپن لوگاں تو ایسے ہے کی سیدھے سے بات کرنا بھی نئیں آتا۔ خلم چلانا بھی نئیں آتا۔ الٹے پلٹے تو کانیان کیا لکھیں گی……''مئیں بولی تھی……''امنی مئیں تو اب بہوت اچھا لکھنے پڑھنے لگ گئی۔ محل کے دوسرے

پالکڑی لڑکیاں تو میرے اتی اچھی بات کرسکتے۔ میرے ویسا ڈھنگ کوئی کا ہے……؟''

اور یہ بات مئیں جھوٹ بولی بھی نئیں تھی۔ بہت دنان پیچھے وہی دلی والے سرکار آئے تھے تو انون بولے تھے۔ ''سویرا تو حیدرآبادی معلوم پڑتی نئیں کرتی۔''

ہمارے پاشانے پوچھے تھے……''وہ کیسا؟''

تو انون نے جواب دیئے تھے کی ''حیدرآبادی لوگاں جیسے غلط سلط بات کرتے انے نئیں کرتی……کرتی پن اتی نئیں کرتی۔''

انے بڑے سرکار جو دلی سے بار بار جاتے تھے تو اسی حیدرآباد کے، پن جانے کیا بھید تھا کی ادھر انوں کچھ سالان پیچھے حیدرآباد چھوڑ کو دلی جا بسے تھے۔ بولتے انہوں کبھی شادی بھی نئیں کرے۔ میری امنی یہ بات بتائی تھی کی انوں کسی پالکڑی سے عشق کرے۔ عشق کرے پن ایسا سچا کی بولے اسی کو بیوی بناؤں گا۔ اب دل بہلاوے پڑتے کی محبت جتاتے تو اچھا بھی لگتا پن انون تو اس کو باخائیدہ اپنی رانی بنانے کا سوچ لے کو بیٹھے تھے۔ انون کو دادا منع کردیئے۔ عشق کے ایسے سچے ہور ضد کے ویسے پکے تھے کی انون سارا زمانہ چھوڑ ڈالے۔ اٹھے ہور دلی جا کو بس گئیں۔ پہلے تو کتے دناں پلٹے بچ نئیں۔ پھر بہوت برساں بعد آئے تو لوگاں کہتے انے بالکل بدل کو رہ گئے تھے۔ تو میں یہ بول رہی تھی، کی جو دلی والا ایسے بولے کی یہ اچھی بات کرتی تو اس میں جھوٹ بات تھوڑی ہوئی۔ پھر انون کے بولے پیچھے میں آزمائی تو سچی میں دوسرے چھوکریاں ویسی جاہل نئیں لگی اپنے کو……مئیں یہ سوچ کر رکھی تھی کہ سچی کہانی لکھوں گی، ضرور لکھوں گی، ضرور لکھوں گی مگر میری حسمت کی کبھی موخع نہ ملا۔ میں بڑھتی گئی ہور یہ بات بھول گئی۔

لوگاں بولتے کہ کوئی کوئی بچیان ایسے رہتے کی ان کی عمراں تو چھوٹے رہتے پن انے دماغ بڈھوں کا لاتے……میرا بھی ویساچ حال ہے۔ ہندوستان بٹا سو وخت میری عمر چ کیا تھی……پن عخل بہوت بڑی تھی۔ پھر مئیں وہ زمانہ بھی دیکھی جب کیا بولتے اس کو وہ پولیس اکشن ہوا۔ پھر تو پورے حیدرآباد میں وہ ہلور مچی کی پوچھو نکو……پھر دنان ایسے بیتنے لگے جیسے شکاری کو آگے بھاگتا ہرن۔ ابھی کے یہاں تھے کہ ابھی وہاں……ان آنکھاں نے کیسے کیسے زمانے دیکھ کو بیٹھیں !

سال پیچھے تو محل والوں نے میٹنگ جمع کر کو پاس کئے تھے کی اب جیسا کبھی بھی حسمت میں لکھا ہے بھگتنا……نہ آنا نہ جانا……پن اب یہ نوا ہلڑ مچا تو پھر سے یہاں وہاں جگو جگو بیٹھ کو سرگوشیاں ہونے لگے۔ سب اپنے اپنے باتاں سناتے کوئی کسی کو سننے کو خالی نہیں تھا۔ پن بڑے پاشا بیٹھ کو

سب کو سنائے کی ایسا آپس میں بکواس کر لینا اچھا نئیں۔ اب سوچو کون جانے کون نئیں۔

بڑے بڑے باتاں ہولئے، پھر یہ طے کرے کی آدھے لوگاں چلے جانا، وہاں جا کے بزنسان کھولنا، ملان چلانا، کچھ کچھ تو سبھی کرنا، پن خالی نئیں بیٹھنا کی خالی بیٹھنے کا اب یہ زمانہ نئیں ...... اور جب ادھر سارے زمینان، جاگیران حکومت کے حلق میں چلے جائیں گے تب تو سوچ کو جانا چ پڑتا۔

اور پھر ایسا ہوا کی بہت سے لوگاں پاکستان چلے گئے، پن میں نئیں گئی...... میں بولی میری ماں جہاں رہیں گی وہیں میں بھی رہوں گی۔ ہور اب میری ماں پاکستان چھوڑ کر دنیا کے کوئی حصے میں نئیں جا سکتی تھی کیونکہ انے پولیس ایکشن کے کچھ دناں پہلے مر گئی تھی۔ ہور جب ایک انسان مر جاتا ہے تو انے انے جانے کے سارے سلسلے چھوڑ جاتا ہے۔ انے اب ایسے سفر پہ چلی گئی تھی کی اب واپس آنچ نئیں سکتی تھی...... امنی کے مرنے کا بھید میرے کو نئیں معلوم، پن لوگاں کہتے ان نے خودکشی کی تھی۔

میری جوانی برسات کے منہ زور بادل کے ویسی اُمڈاُمڈ کو بڑھچ چلی آ رہی تھی اور جدھر جاتی ادھرچ اجالے ہو جاتے۔ ایسے میں میں تو چڑھتا سورج ہوتی جا رئی تھی جس کو ہر کوئی اپنے دل میں بھر لے کو رکھنا چاہتا (اور کتنے ناماں گناؤں جو ایسا کر لینا چاہتے تھے) کہتے میری ماں ایک ببرچی خانے نئی دوسرے پالکڑے چھوکریاں سے بولی۔ ”میں نئیں چاہتی میرے ویسا حشر میری بچی کا بھی ہو......“ کوئی بولے۔ ”وہ تو ایک نہ ایک ہو کرچ رہیں گا۔“

اس پر میری ماں نے کہا...... ”تو اس گھڑی کو دیکھنے سے اچھا یہ ہے کہ میرے آنکھاں ڈھنک جاتا۔“

اور میری ماں کے آنکھاں ڈھنک گئے۔ انے خودچ ڈھنک لی۔ امنی پاگل تھی۔ کتنی عجیب بات کری اس نے میرے کو اس طرحون سے اکیلے چھوڑ دی۔

امنی کے مرنے کے بعد جب میں نے یہ بات سنی ہور ایک دن خالی یونچ آئینہ دیکھی تو پتہ چلا کی ماں کی بات غلط نئیں تھی۔ ابھی ابھی تو دو سال پیچھے کی بات ہے کی ماں نے میرے بالاں منڈا دی تھی۔ جب میں کیسی تھی ہور اب۔ لمبے لمبے بالان میرے پیٹھ پو جھول رہے تھے۔ ہور منہ کیسا جگ مگ جگ مگ کر یا تھا۔ میں نے اس وقت سوچی تھی کی سچی اگر سویرا صبح کو بولتے تو میں سویرا ہوں۔ مگر کیسا اندھیرا اور تاریک سویرا...... بولتے نا جی کی صبح چمک دار، روشن اور خوبصورت

ہوتی...... ارمان بھری ہوتی، آرزوان بھری ہوتی۔ میں اوپر سے تو سچی بھی سویرا تھی، مگر اندر سے رات تھی...... رات کی ویسی کالی اور بھیانک...... نئیں تو پھر میرے دل میں ارمانان بھری روشنی کائے کو نئیں تھی۔

ادھر تو امنی مری ادھر محل کے لوگان، آدھون آدھ لوگان ...... پاکستان چل دئین ...... کیسا کیسا میرا من ترسا کی اس کیلئے پن سے اس ڈھنڈار محل سے، اس جلانے رلانے والے گھرانے بھاگ کو کہیں چھپ جاؤں، پن میرے دکھی من کو کبھی کوئی سہارا نئیں ملا۔

یہ نکو سمجھو کی سہارا دینے والے ملے نئیں۔ ملے تو ضرور پن ایسے جن کے آنکھاں، جن کے نظران زہر بھرے تھے، جن کے سانساں مار ڈالنے والے تھے، جن کے رگ رگ میں شیطانیت اور حرام زادگیان بھرے ہوئے تھے۔

بہوت سے لوگان یہ سمجھ لے کو بیٹھے کی جاگیران ختم ہو گئے۔ حکومت نے زمیناں لے لیں تو اب ان لوگان کے دماغ ٹھکانے کو آ جائیں گے...... پن ایسی کوئی بات نئیں ہوتی۔ وہ لوگان تو روز اول تھے...... ایسے باتان بولنے کو بھی شرم آتی۔ پن ہم کو تو اپنے آنکھاں سے دیکھنا پڑتا۔ میرے کو اپنی زندگی سے بیزارگی ہوتی جا رئی تھی۔ آپ پو رحم آتا...... دکھ ہوتا کی یا مولیٰ یہ بھی کیسی زندگی تو دیا......

اپنی زندگی سے اب تک کا دکھ ہوتا ہے، خود پو رحم آتا ہے۔ پن ایک دم سے اب میرے کو اپنے آپ سے نفرت ہو گئی، اپنی زندگی زہر معلوم پڑنے لگی...... میرے ساتھ کے اور بھی پالکڑے چھوکریان تھے۔ کچھ تو میرے ویسے ہی باپ ہوتے بھی بن باپ کے اور کچھ غریبی کے مارے خرید ہوئے چھوکریان تھے۔ ان میں سے ایک ستارہ بھی تھی...... بولتے ستارہ خالی آسمان پو جگمگاتا، ایسی اس کی عزت رہتی۔ پن انے ستارہ ہونے کے بوجود زمین پر پھینکے گئی...... بلکہ موری میں گرائے گئی......

ہمارے بڑے پاشا صاحب کے منجلے بیٹے حیدر میاں نے ستارہ کو ایک دن دیکھے۔ بس دیکھ لئے۔ اس کے بعد کام نہ دھام، ببرجی خانے کے بار بار پھیرے کرنے لگے۔ ستارہ کی ماں سچی بہوت نمک حلال تھی کہ جب انے دیکھی کی منجلے پاشا آپو آپ ہو کر یوں دوانے بن رئیں تو انے اپنی بیٹی کو خواب گاہ میں بھیجنا شروع کری۔ اس خواب گاہ کا حال میں کیا بولوں آپ سے نکو پوچھئے تو چ بھلا ہے۔ وہاں پھولان بھرے سیجان تو ہوتے تھے پن پاشا لوگان کے واسطے، ہمارے ایسے

بلنصیبان تو وہاں پہنچ کو خود کو خصائی کے چھرے تلے کی گائے سمجھتے تھے۔ ستارہ بھی اسی خید خانے میں پہنچی اور خصائی کی چھری تلے آ گئی۔

پھر تو ستارہ کو ایک بعد ایک سبھی نے استعمال کرنے شروع کر دیئے...... جب تک انے منہ بند کلی رہی سو رہی۔ پن جب انے پھول کے ناد کھلی تو ہر کوئی اپنے اپنے گلدان میں اس کو سجانے لگے۔ کہاں تو انے پھول بن کر مہکی تھی کی ایک دن موری کا کیڑا بن گئی، چیاؤں چیاؤں کرتے دو تین بچے اس کے آگے پیچھے چھولتے رئیں...... اور پھر یہ مزہ کی ہر بچے کا باپ الگ...... انے ایک کی صورت ایک سے نہ ملتی، سوب الگ الگ صورتاں لے کو آئے...... اور یہ تو پھر ہے کی جیسا بچاں ڈالیں گے ویسا پھل اترے گا۔ دو چار برسوں میں ستارہ کیا تھی اور کیا ہو گئی کی ذیکھ کو رحم آتا۔ میں ایک دن اس سے بولی کی یہ سوب غلط باتاں کیوں کرتی تو اس کے آنکھاں بھر آئے اور بولی ہمے گندی موریاں کے کیڑے کب تلک کا اپنے کو بچالے کو رکھ لیتے......

تو ایک دن میرا بھی یہی حشر ہونیگا۔ میں نے شوچتی اور پھر میرے کو اپنی زندگی سے اپنی ہر ہر چیز سے نفرت آنے لگی۔ اس سے اچھا تو یہی ہے کہ انسان مر جائے مگر پھر میرے کو خیال آیا کہ مرنا تو بزدلی ہے۔ ڈرنا مرنا تو ڈرپوکوں کا کام ہوتا۔ اچھے طرحون سے زندہ رہ کر اپنے رخ ہور زندگی کے واسطے کیوں نئیں لڑنا...... مگر پھر جب سب باتاں سوچ کو اپنے آس پاس دیکھتی تو خیالاں آتے کی ایسے پنجرے میں کیا بچ کو رہنا...... جہاں لوگاں ایک کونے میں اپن کو ڈال کے آس پاس خونخوار شیراں چھوڑ دیتے، ایک سے بچیں گے تو دوسرا آن کو گھیرینگا۔ دوسرے سے بچے تو تیسرا، تیسرے سے بچے تو...... یہ سلسلہ کہاں پر ختم ہونیگا......

مولیٰ تو بھی عورت کو کیسا بے سہارا بنا کر رکھ دیا رے۔ پہلے تو خود چ عورت میں ہمت کی کمی ہوتی۔ اوپر سے ایسے خیدان بھی لگا دیا۔ اب میں اپنے کو بچانے کی ترکیباں سوچتی بھی تو یہ نئیں آیا کی کس کا ہاتھ پکڑوں گی، جھوٹے مجتاں، خالی خولی پیاراں جتانے والے تو بہت مل جاتے، دل سے چاہنے والا کہاں ملتا......؟ اپنا کام نکال کو دوسروں کو بے کام کر کو چل دینا تو سب کو آتا پن وہ محبت کرنے والا دل کون سے کونے میں بستا کی جو اپنے کو روتا دیکھ آنسو کے خطروں کی جگہ خون بہانے کو بیٹھ جاتا...... عورت کے دیوانے تو سب ہوتے۔ اپنا پہلو گرم کرنے کو سب سوچتے...... پن اس کی زندگی، اس کے دکھ درد کا خیال کون کرتے؟...... یہ محل والے...... یہ درندے...... یہ شیران؟ بھاگ جاؤں......؟ میں نے اپنے دل سے پوچھی...... پھر یہ خیال کری کی بھاگ کو اتی بڑی

دنیا میں بھی تو آخر برے لوگان بستے ہوں گے، پھر......؟؟ بھاگنا ضروری نہیں ہے کچھ''...... میں اپنے دل کو سمجھا دی...... ہمت سے رہے تو چ سب کچھ ہے، اپنا من میلا رہے تو لوگان بھی آنکھیں بھر بھر کو دیکھتے...... اپن سلامت روی کہ چال سے چلے تو کسی کے باپ کا مجال نئیں ہوتی کی ایک نظر بھی پھینک کو دیکھے......

زندگی اچ گذرتی تھی...... نامزاد، اندھیاں...... کی ایک دم سے میرے کالے راتاں صبح میں بدل گئے۔

محل کے آدھون آدھ لوگان پاکستان چلے گئے تھے۔ کبھی کبھار وہ لوگان ملنے کو آتے چ تھے۔ اب کے منجلے پاشا، بڑے چچا، چھوٹے پاشا آئے تو جیسے محل بھرے میں بہار ناچ گئی...... یہ لوگان اب کے آئے تو بولے کی سوب کو پاکستان لے جانا ہے کیوں کی اب یہاں زندگی میں کوئی مزہ باخی نہیں رہا۔

اب میں اچھی خاصی ایک جوان لڑکی تھی۔ ادھر ادھر نکل جاتی تو ایکو ایک مرد میرے کو چ گھورنے لگتے۔ ویسے تو لوگان خود بولتے کی جوانی اپنی جگہ خود چ ایک خوبصورتی ہوتی، اس پر خوب صورت چھوکری کی جوانی...... محل میں بہار ناچی تو ناچی میرے دل میں بھی ناچی۔ زندگی میں پہلی بار تھی کی کوئی نے سچ مچ میرے کو پیار بھری آنکھاں سے دیکھ کر مسکرایا۔ ایسے پیار سے مسکرانے والا وہ عباس تھا۔ جب پولیس ایکشن کے وخت سب لوگان پاکستان گئیں تو انے بھی ساتھ گیا...... جب کو انے ایک بچے کے مانچ تھا، پن اب تو ایک اچھا خاصہ مردوا بن گیا تھا۔ اور کیسا طرحدار اور بانکا مردوا کی دل آپو آپ اس کی طرف کھینچتا...... پیار سے مسکرانے کو دیکھنے کے سوا انے کبھی میرے سے بات تک کرنے کی کوشش نئیں کرا۔ یہ نکو سمجھو کہ ایسے سے محبت نئیں رہتی کی بات تک تو نئیں کرا اور بول دئی کی محبت کری تھی۔ سچی چاہت والے کا یہی روپ ہوتا۔ چار چھ سال انے پاکستان رہ کو کیا آیا کی انے اپنا لہجہ، بات چیت، چال ڈھال سب بھول بیٹھا...... اب انے بات کرتا تو ایسی جیسے چھوٹی پاشا لوگان کو اردو پڑھانے والے ماسٹر کرتے تھے۔ کسی کو کوئی کام سے پکارتا تو ایسا کی آواز کان میں نرم نرم لگتی...... چلتا تو ایسے کی زمین ہدرتی اور سینہ ایسا تنا ہوا کی جیسے کبھے نئیں، کتے گولیاں کھانے کا حوصلہ ہے......

عورت کا دل بھی بولتیوں کیا دل ہوتا کی جہاں پیار کی ایک ذری جھلک بھی دیکھا وہیں جھک گیا۔ اب عباسؔ کے خیالاں آتے تو صرف عباس ہی دل میں، دماغ میں نہ آتا بلکہ ایک گھر، ایک

باغ، اور کھل کھل کر کرتے بچے بھی آپو آپ چلے آتے بچے...... جو الگ الگ صورتاں نئیں رکھتے تھے۔ کسی کی ناک عباس کے ویسی تھی، کوئی اپنے آنکھاں عباس کے ویسے لایا تھا۔ کسی کے چلنے کی ڈھب عباس ویسی تھی اور کوئی تو چھوٹا سا عباس ہی تھا۔ بس...... میں تو وہ پھول تھی جو ایک گلدان میں سجنے لائق تھی۔

اب تک محل میں جو سارے لوگاں تھے انوں ایسے نیت کے، نظر کے برے تھے کی کبھی پینے کو پانی بھی مانگے تو جھٹ آنکھ مار دیئے۔ کبھی پان کی تھالی دینے کو اٹھتی تو ہاتھ پکڑ لینے کو تیار ہو گئے۔ مگر عباس، انے تو بات بھی کرا تو نظر جھکا کو۔

ایک دن بغیچے میں میں بڑے پاشا کے سرہانے رکھنے کو گلاب کے پھولاں توڑتی تھی کی کچھ سے ایک کانٹا انگلی میں گھس گیا...... ”سی“ کر کو میں اپنی انگلی منہ میں ڈال لی۔ پتہ نئیں وہاں عباس کھڑا تھا کی میری آواز سن کو آیا اور اک دم میری انگلی پکڑ لیا۔

”دیکھ کر کام کیا کرو۔ اگر ابھی زخم بن جاتا تو۔“

”میں حیرت اور شرم سے ڈوب مری...... انے کیسی دہلی دہلائی زبان میں بات کر ریا تھا۔ میں اپنے اپ کو اس کے سامنے ایسی حقیر لگی۔ دل بولا، ڈوب مروں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھاں منہ پر رکھ لی...... ”نکو اللہ......؟“ میں خود سے بولی...... ”اتے اچھے آدمی سے کیا بات کروں ماں......“

وہ کچھ دیر تو کھڑے رہا پھر بولا...... ”لاؤ تمہاری انگلی پر پٹی لپیٹ لا دوں......“ اور ایسا بول کو وہ اپنی دستی کا کونہ پھاڑنے لگا۔

”نکو اللہ......“ میں گھبراہٹ سے بولی۔ ”اپنی دستی نکو پھاڑو۔ ایسا کیا بڑا زخم میرے کو لگ گیا۔“ میرا دل جیسے رونے لگا۔ میں بولی۔ ”تم اتے سے زخم کو دیکھ کر پٹی لپیٹ رئیں اور جو میرے دل میں اتے سارے زخماں پڑے سو......“

وہ ذرا دور ہٹ کر بولا ”میں تمہارے سارے زخموں پہ اپنے پیار کا مرہم رکھ دوں گا...... بولو، مجھ سے بیاہ کروں گی۔“

یہ بادلان، یہ ہوایاں یہ پھولان، یہ باغان جیسے سوب کے سوب جھوم جھوم کو لہرانے لگے...... ہم دونوں کھڑے کتنی دیر کم ہوئی تھی، پن میرے کو ایسا لگا کی ہم کتنے زمانے بیت گئے یہیں تھے۔ میں نے سر اٹھا کو اس کو دیکھی، جانے کب تک دیکھتی رہی، ہور پھر جیسے میں کسی جادو

کے اثر سے آگے بڑھی اور جا کو اس کے سینے پو اپنا سر ٹکا دی۔ اس نے جھک کر میرے منہ کو دیکھا۔

”تم کتنی بدل گئی ہو سویرا۔ تم کتنی اچھی ہو گئی ہو۔ تم تو سچ مچ میری زندگی میں صبح بن کر آئی ہو۔“

اور اس نے دھیرے سے جھک کو میرے کو اپنا ہاتھاں میں سمیٹ لیا۔ اس ایک گھڑی میں ہمارے سارے دکھان ایک ہو گئے، سکھان ایک ہو گئے...... ہم دونوں اتنے خریب ہو گئے جیسے کبھی دور اچ نئیں تھے۔

پہلے تو عباس کراچی جا کر تعلیم پوری کرا، اس کے بعد انے پاشا لوگوں کے حساباں کتاباں کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ اس کے بغیر تو محل والوں پتا بھی نئیں ہلتا تھا۔ وہ کرانچی میں کہتے بہوت سے لڑکیاں اس پر لٹو ہوئے۔ بہوت سے لڑکیاں اس سے عشق لڑانا چاہے۔ پن انے کسی کو خاطر میں نئیں لایا۔ اب انے بولتا تھا کی بچپنے سے جب کی انے میرے کو دیکھا تھا، میرے ساتھ رہا تھا...... میرے کو چاہتا تھا...... انے بولتا میں اتے بڑے بڑے بستیاں گھوما، ایکو ایک لڑکی سے ملا، پن وہ بات کسی میں نئیں جو میرے میں ہے۔

میری زندگی اب تک کا بڑی بری گزری تھی، کوئی خوشی نئیں تھی، کوئی سکھ نئیں تھا۔ بس ہر وقت پاشا لوگان کے جھڑکیاں اور بات بے بات ڈانٹاں۔ ایک دن بھی تو ایسا نئیں ملا کی میں ذرا مسکرا ہی لیتی۔ ویسے مسکرانا چاہتی تو مسکراہٹاں بھی بہوت مل جاتے، مگر میں ویسی لڑکی نئیں تھی کی پیسوں کے بدلے میں خوشیاں خریدتی...... اتے زمانے میرے پر سے گزرے، کتے پاشا لوگان ایسے تھے کی میرے کو طرح طرح سے دغا دینا چاہتے پن میں تو ایسی تھی کی کبھی کسی کے خواب گاہ میں پھٹکی تک تو نئیں...... ہزار موقعے ایسے آئے کی میں بال بال بچی۔ لوگان بولتے کی انے کیوں ایسی خود سر ہے۔ یہ نئیں سوچتی کی جن کا کھاتی ہے، انون کے کام آنا، ہچ پڑتا۔

پن میں تو یہی بولتیوں کی دنیا میں بدی نیکی سب عورت کے ہاتھ میں ہے...... انے کبھی عورت کی مرضی نئیں تو کسی کے باپ کی ہمت نئیں پڑ سکتی کی ہاتھ بھی لگا سکے۔ مجبوری کو میں کب نئیں مانتی، مگر عورت تو وہی کی مجبوری ہوتے بھی اپنی عزت کی ناؤ کو صاف کھے لے جائے۔ نئیں تو ایسے سے موت کیا بری ہے...... یہ مردوں کو دلیر بنانے میں سارا ہاتھ ان عورتاں کا رہتا......

اڑتے اڑتے یہ خبر پاشا لوگان کے کانان تک پہنچی کی عباس ہور سویرا کا میل جول بڑھ را...... اب یہ اتی اہمیت کی بات تھی بھی نئیں، مگر بات یہ تھی نا کی میں کسی کو منہ نہ لگاتی تھی، سو اب

کیسے ایک دو کوڑی کے مردودے پر ریجھ گئی...... میں ان لوگان سے کیا بتاتی کی انے دو کوڑی کا بھی تھا تو میرے واسطے دو لاکھ کا تھا۔ کیا محبت پیسے سے کرتے کیا؟ دل دیکھتے جی دل...... پن ان لوگاں کو دلاں کیا کیا خدر۔ یہ لوگان تو بس پیسے کے غلامان ہیں...... چھی...... مٹھی پڑو ایسے عیتاں پو۔

میں عباس کی رانی تھی تو اپنی جگہ پو تھی...... پن ان پاشا لوگان کی تو غلاچ تھی۔ ایسے موقعے تو آتے چ تھے کی میرے کو ان کے کاماں کرنے کو انوں کے کمروں میں جانا پڑتا۔ ایسے میں ان لوگان کا بس نہیں چلتا تھا کی میرے کو اٹھا کے کچا کھا جاتی...... میں کیسی مگن اور خوش تھی کی چلو اب میرا بھی نصیبہ خدا نے کھولا...... ورنہ یہ ڈاکوآن تو میرے کو اڑا لے جاتے۔

اب ہمارے سوب کا پاکستان جانا بالکل طے ہو گیا تھا۔ عباس نے بول دیا تھا کی اپن پاکستان جا کو جھٹ پٹ شادی کرلیں گے۔ میں نے بولی۔ ”یہاں پر چ کیوں نہیں کرلیتے۔ جتی جلدی میں تمہارے سائے میں آ گئی اتا چھا......“ پن عباس بولا کی انے میرے کو ایسی دیسی دولہن نہیں بنانا چاہتا۔ اس کا پاکستان میں بہوت روپیہ جمع تھا۔ وہ وہاں چل کر زور دار شادی کریں گا...... ایسا انے بولا...... انے بڑے بڑے باتاں سوچتا تھا کی اپن ایسا کریں گے، ویسا کریں گے۔ (ہم دونوں جلدی جلدی پاکستان پہونچ جانا چاہتے تھے......) پھر گھر بھی الگ لے کو رہیں گے۔

پھر سب لوگان پاکستان جانے کے تیاریاں کرنے لگے۔ اچھے برے سامان کی بیچ باچ ہونے لگی...... رونے دھونے ہوتے، بے ہوشیاں پڑتے ہور روپیہ حاصل کرتے جاتے اور ساتھ ساتھ سامان کی باندھا باندھی بھی چلتی چ رہتی......

”یہ چیز لاؤ۔“

”وہ چیز لاؤ۔“

”وہ پاندان اٹھا کو لا۔“

”آگے وہ گلدان سنبھال کو لا۔“

اس دن یہ حکم احکام جاری تھا کی ادھر سے کوئی آ کو بولے کی میرے کو ادھر چھوٹے محل میں چھوٹے پاشا بلا رئیں۔ انوں کے ٹھاٹ باٹ نرالے تھے...... انون کا سامان بھی سوب لوگاں سے الگ تھا...... وہ اکیلے میں باندھا بوندھی کر رئیے تھے کی میں جا پہنچی۔

”تو بھی پاکستان چل رئی کیا؟“ وہ اپنے کوٹ کی گھڑی کرتے میں بولئیں۔

”جی ہو“ میں خوش ہو کر بولیں۔ ”میں تو اپنا سب سامان بھی بندھ ہو لی۔“

”اچھا......“ انون کچھ دیر رک کو بولئیں۔ ”اور پھر وہاں تیری شادی ہو جائیں گی نا!“

میں شرما کو سر جھکالی۔ تو کہے ”ہے بڑا یہ خوش نصیب عباسیا۔ تازے پھول پو ہاتھ مارا سالا۔“

”آپ تو بہوت اچھے ہیں پاشا۔“ کوئی تو میری شادی کا نام بھی نئیں سننے کو خالی، اور آپ بول رئیں شادی دھوم سے کریں گے۔“

”انون میرے قریب اکو رکے۔“ کیوں نئیں، آخر تجھ پو ہمارا کچھ حق لگتا کی نئیں۔“

میں جیسے احسان میں ڈوب کر بولی۔ ”کیوں نئیں پاشا، آپ چ لوگاں تھے کی میرے کو پالے۔ آپ سے بڑھ کو کس کا حق ہوئیں گا۔“

”تو وہی تو میں بولتا ہوں کی اپنا، حق کیوں نہ لیوں؟“

اب جو میں نے ہولڈال کے بنان کستے کستے سر اٹھا کو انون کی صورت دیکھی، تو سارا معاملہ جیسے میرے سمجھ میں آ گیا۔ وہ نئیں چاہتے تھے کی یہ پھول اپنے اصلی روپ میں عباس کے آنگن میں مہکے...... کیوں نہ آ گو ہی اس کو مسل دیوں......؟ میں گھبرا کو بھاگنا چاہی تو دیکھی چھوٹے پاشا سامنے، چ کھڑے ہنس لے رئے تھے۔

آخر وہ گھڑی تو میرے مقدر میں لکھی تھی چ کی جس سے بچنے کو میری امی زہر کھالی تھی۔ پنجرے میں شیر بھی تھا اور انے بے بس شکار بھی۔ انون میرے خریب آ کو بولے:

”یہ گالوں کو چومنا تو میری برسوں کی خواہش تھی۔“

میرا خون سن سن کرلے کو اونٹنے لگا...... ہوں، تو انے بھی ابھی اچ واسطے میرے کو پھسلا لے رئیے تھے۔ میرے دماغ میں اکدم سے میرے عباس کی پیاری صورت آئی، اور اس کی صورت کے ساتھ جیسے میرے دل میں نئی خوت آ گئی...... ہور میں جو برسوں سے پاشا لوگاں کا چھوٹے سے چھوٹا حکم بھی مانتی سنتی چلی آئی تھی، اس گھڑی تن کر بولی :۔

”یہ تو عمر بھر بھی نئیں ہونے کا......“ ہور ایسا بولتے، ہچ میرے میں ساری دنیا کی طاخت آ گئی...... ”میری ماں جیسی زندگی گزاری ویسی تو میں ہرگز نئیں گزاروں گی۔ میرے کو سترہ مرد نئیں ہونا، میرے کو ایک ہی ہونا...... پن محبت کرنے والا ہونا، ایک چھوٹا سا گھر ہونا، جس کی میں مالکن رہنا۔ کسی کا ڈر نئیں ہونا، ڈبکا نئیں ہونا......“

میرے باتاں سن کو ایسا معلوم پڑا جسے انون کو غصہ آ گیا۔ انون آ گو ہی آ گو بڑھتے چلے آئے۔ میں پیچھو ہوتے ہوتے دیوار کو جا لگی۔ اب انے میرے سامنے ایک اسٹول پہ پاؤں دے

کو ایسے کھڑے ہوگئیں جیسے سینما میں کام کرنے والے لوگاں ہوتے ...... میرے منہ پو جھک کے ابھی انون کچے نئیں کیا کرتے تھے کی مئیں زناٹ سے ایک چانٹا انون کے منہ پو جڑ دی۔ انون میرا وہی ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لئیں ...... مئیں پنجہ منہ تک لے جا کو ایسی زور سے کاٹی کی خون کا کھارا کھارا، کڑوا، کسیلا مزہ میرے منہ میں اتر گیا۔ ''سی'' کر کے انون اپنا ہاتھ کھینچ لئے ...... پن ابھی ان کی ہوس تو باخی تھی، میں ادھر ادھر دیکھی کی اپنے بچاؤ کے واسطے کیا تو بھی کروں، پن کوئی بات عقل میں نئیں آ رہی تھی۔ دل تھا کی اجاڑ دھڑ دھڑ کرے جا رہا تھا ''مٹھی پڑ دو یہ دل پو'' ...... مئیں دل ہی دل میں بولی ...... عین موخے پہ دھڑک رہا تھا۔

اکدم تیزی سے ایک ترکیب میرے دل کو سوجھ گئی۔ پن بات بڑھ وڑھ گئی تو ؟ کچھ زیادہ کم ہوگیا تو میرے کو جیل کی ہوا تو نئیں کھانے پڑیں گی ...... پن مئیں بھی سوچی کی عزت جانے سے اچھا تو یہ ہے کی جیل ہو جانا۔ جیل سے تو پھر بھی کبھی چھوٹ کو آجائیں گے۔ عزت گئی تو کان سے لائیں گے۔ یہ سارے ہمتان میرے کو عباس کے خیال نے بندھایا۔

''مئیں تمہارے پاواں پڑتی حضور، میں تمہاری غلام پاشا ......'' ایسا بول کو مئیں نیچے ان کے خدموں میں جھکی او وا ایک پاؤں جو زمین پر تھا، اس کو پکڑ کو ایسی زور سے کھینچی کی انون کا سارا تول پیچھے چلا گیا۔ دھڑ کر کو انون تالو کے بل گر گئیں اور دوسرچ گھڑی مئیں تیزی سے باہر کو بھاگی۔ دروازے میں سے نکلتے مئیں پیچھے مڑ کو ایک بار بھی نئیں دیکھی ...... بس ایک خوشی تھی کہ مئیں اپنی عزت برباد ہونے سے بچالی ...... آخر کو مئیں اپنے عباس کی عزت بچائی نا ......''

حویلی کیسی کی ہول رول مچ گئی۔

مئیں بغیچے میں آ کو رکی۔ دم پھول ریا تھا ...... سانسوں سانس ہوئی جا رہی تھی ...... میرے میں یہ ہمت کان سے ائی۔ مئیں کتے بڑے بڑے ہمتاں کری۔ تھپڑ میں ماری، گوشت مئیں نوچی، خون مئیں کال دی، ہور ٹنگ کھینچ کو تالو کے بل مئیں الٹ دی۔ انون کو پورا کا پورا اپٹ دی۔

پن اب حویلی جو ہول مچ رئی وہ بھی ایک الگ خصہ ہو ریا۔

بڑے بڑے بوٹاں کھٹ کھٹ کرتے، امین لوگاں (پولیس) ادھر ادھر گھوم لے رئیں۔ کتے انون چھوٹے پاشا ختم ہوگئے۔ اب میرے گلے میں شاید پھانسی کا پھندا پڑیں گا ...... پڑنے دیو ...... مئیں وہ پھانسی کا پھندہ چڑھاوے کا کالی پوت کا گھچا سمجھ کو پہن لیوں گی ...... کالی پوت کا لچھا سہاگ کی نشانی ہوتا ...... لڑکیوں کو اسی واسطے تو لچھا چڑھاتے نا کہ بولتے انے دولہے کو نام پو

چڑھتا ......؟ تو مئیں بھی تو یہ کام عباس کے واسطے اچ کری نا ......؟ ہور کبھی میرا مولٰی میرے پو مہربان رہیا ہور میں جیل جانے سے بچ گئی تو مئیں تو ہوں اچ اپنے عباس کی ...... میرے کو کائے کا ڈر۔

میرا لرزتا وا دل آپو ہلو ہلو دھڑکنے پو آگیا ...... مئیں سوچی میرے کو کائے کو اتا ڈرتا ہونا ...... مئیں خونی کائے کو سمجھوں خود کو، مئیں اپنے کو گنہگار بھی کائے کو سمجھوں۔ میں کیا انون کو چپ کا چپ مار ڈالی کیا ......؟ مئیں اپنی عزت بچانے کو یہ سب کری نا ......؟ کائے کی واسطے میں دنیا کے سب شریف عورتاں جیسی عورت نہیں بننا چاہتی ...... جو ستر دھگڑے نئیں کرتی ...... جو اپنی عزت نہیں لٹانا چاہتی، جو ایک بھوت بھی بھوت محبت کرنے والا شوہر ہونا بولتی، جو اپنے گھر کی مالکن رہنا چاہتی ...... جو کھچ پچ کرتے بھولے بھالے بچے چاہتی، جو سوب کے سوب ایک دوسرے سے شکل وصورت میں ملتے دلے رہنا۔ ہور آپس میں شکل صورت جبھی ملتی جلتی رہتی جب کی سب کا باپ اکیچ ہوتا ......

نکو اللہ ...... میرے کو رنگا رنگی صورتاں کے بچے انکو۔

مئیں آپ سے بولی نا کی مئیں تو وہ پھول تھی جو ایک ہی گلدان میں سجنے لائخ تھی ......

* * *

اُترن

“نکو اللہ، میرے کو بہوت شرم لگتی۔”

“ایو اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ میں نہیں اتاری کیا اپنے کپڑے؟”

“اوں...... چمکی شرمائی۔”

“اب اتارتی کی بولوں انا بی کو؟” شہزادی پاشا جن کی رگ رگ میں حکم چلانے کی عادت رچی ہوئی تھی، چلا کر بولیں۔

چمکی نے کچھ ڈرتے ڈرتے، کچھ شرماتے شرماتے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پہلے تو اپنا کرتا اتارا، پھر پاجامہ...... پھر شہزادی پاشا کے حکم پر جھاگوں بھرے ٹب میں ان کے ساتھ کود پڑی۔

دونوں نہا چکیں تو شہزادی پاشا ایسی محبت سے جس میں غرور اور مالکن پن کی گہری چھاپ تھی، مسکرا کر بولیں، “ہور یہ تو بتا کا کی اب تو کپڑے کون سے پین رئی؟”

“کپڑے......” چمکی بے حد متانت سے بولی، “یہی اچ میرا نیلا کرتا پاجامہ۔”

“یہی اچ؟” شہزادی پاشا حیرت سے ناک سکوڑتے ہوئے بولیں:

“اتے گندے، بدبو والے کپڑے؟ پھر پانی سے نہانے کا فائدہ؟”

چمکی نے جواب دینے کی بجائے الٹا ایک سوال جڑ دیا:

“ہور آپ کیا پین رئے پاشا؟”

“میں؟” شہزادی پاشا بڑے اطمینان اور فخر سے بولیں:

“وہ میری بسم اللہ کے دخت چمک چمک کا جوڑا دادی ماں نے بنائے تھے۔ دنی اچ...... مگر تو نے کائے کو پوچھی؟......”

چمکی ایک لمحے کو تو سوچ میں پڑ گئی، پھر ہنس کر بولی، “میں سوچ رئی تھی۔” وہ کہتے کہتے رک گئی۔

“ہو پاشا...... یہ میرے کو حمام میں بھگا لے کو تم اس اجاڑ مار چوٹی کے ساتھ کیا مٹاخے مار لیتے بیٹھیں؟...... جلدی نکلو...... نہیں تو بی پاشا کو جا کو بولتیوں......”

اپنی سوچی ہوئی بات چمکی نے جلدی سے کہہ سنائی:

“پاشا میں سوچ رئی تھی کہ کبھی آپ ہور میں “اوڑھنی بدل” بہناں بن گئے تو آپ کے کپڑے میں بھی پہن لے سکتی نا؟”

“میرے کپڑے؟...... تیرا مطلب ہے کہ وہ سارے کپڑے جو میرے صندوخاں بھر بھر کو رکھے پڑے ہیں؟”

جواب میں چمکی نے ذرا ڈر کر سر ہلایا۔

شہزادی پاشا ہنستے ہنستے دہری ہو گئی...... “ایو کتی بے خوف چھوکری ہے...... اگے تو تو نوکرانی ہے...... تو تو میری اترن پہنتی ہے...... ہور عمر بھر اترن ہی پہنیں گی......” پھر شہزادی پاشا نے بے حد محبت سے جس میں غرور اور فخر زیادہ اور خلوص کم تھا...... اپنا ابھی ابھی کا۔ نہانے کے لئے اتارا ہوا جوڑا اٹھا کر چمکی کی طرف اچھال دیا:“

یہ لے اترن پہن لے۔ میرے پاس تو بہوت کپڑے ہیں۔”

چمکی کو غصہ آ گا...... “میں کائے پہنوں، آپ پہنو نا میرا جوڑا یہ جوڑا......” اس نے اپنے میلے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

شہزادی پاشا غصے سے ہنکاری۔ “انا بی...... انا بی......”

انا بی نے زور سے دروازے کو بھڑ بھڑایا اور جو صرف ہلکا سا بھڑا ہوا تھا، پاٹوں پاٹ کھل گیا۔

“اچھا تو آپ صاحبان ابھی تک ننگے اچ کھڑے دے ہیں......” انا بی ناک پر انگلی رکھ کر بناوٹی غصے سے بولیں۔

شہزادی پاشا نے جھٹ اسٹینڈ پر ٹنگا ہوا نرم نرم گلابی تولیہ اٹھا کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔

چمکی یوں ہی کھڑی رہی۔

انا بی نے اپنی بیٹی کی طرف ذرا غور سے دیکھا، ہور تو پاشا لوگاں کے حمام میں کائے کو پانی نہانے کو آن مری؟......”

یہ انوں شہزادی پاشانے بولے کی تو بھی میرے ساتھ پانی نہا۔“

انا بی ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ پھر جلدی سے اسے حمام سے باہر کھینچ کر بولیں، چل، جلدی سے جاکر نوکر خانے میں کپڑے پین۔ نئیں تو سردی وردی لگ گئی تو مرے گی۔

”اب یہ چکٹ گوند کپڑے نکو پیں، وہ لال پیٹی سے شہزادی پاشا پرسوں اپنا کرتا پاجامہ دیئے تھے، وہ جا کو پین لے۔“

وہی ننگی کھڑی وہ سات برس کین تھی سی جان بڑی گہری سوچ کے ساتھ رک رک کر بولیں...... ”امنی جب میں ہور شہزادی پاشا کے برابر کے ہیں تو انوں میری اترن کیوں نئیں پہنتے؟“

”ٹھہر وذرا، میں مما کو جاکے بولتیوں کی چمکی میرے کو ایسا بولی۔“

لیکن انا بی نے ڈر کر اسے گود میں اٹھالیا...... آگے پاشا انے تو چھنال پاگل ہولی ہوگئی ہے۔ ایسے دیوانی کے باتاں کائے کو اپنے مما سے بولتے آپ؟ اس کے سنگات کھیلنا، نہ بات کرنا، جب اس کے نام پو جو تو ماردیو آپ۔“

شہزادی پاشا کو کپڑے پہنا کر، کنگھی چوٹی کر کے، کھانا وانا کھلا کر جب سارے کاموں سے نچنت ہو کر انا بی اپنے کمرے میں پہنچیں تو دیکھا کہ چمکی ابھی تک ننگا جھاڑ بنی کھڑی ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ دیکھا آتے ہی انہوں نے اپنی بیٹی کو دھنکنا شروع کردیا۔

”جس کا کھاتی اسی سے لڑائیاں مول لیتی ...... چھنال گھوڑی۔ ابھی کبھی بڑے سرکار نکال باہر کردیئے تو کدھر جائیں گے اتے نخرے؟“

انا بی کے حسابوں تو یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ وہ شہزادی پاشا کو دودھ پلانے کے واسطے رکھی گئی تھیں۔ ان کے کھانے پینے کا معیار تو لازماً ہی تھا، جو بیگمات کا تھا کہ بھئی آخر وہ نواب صاحب کی اکلوتی بچی کو اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ کپڑا لتا بھی بے حساب تھا کہ دودھ پلانے والی کے لئے صاف ستھرا رہنا لازمی تھا۔ اور سب سے زیادہ مزے تو یہ تھے کہ ان کی اپنی بچی کو شہزادی پاشا کی بے حساب اترن ملتی تھی...... کپڑے لتے میں دبے دیئے جاتے تھے۔

ادھر وہ حرافہ تھی کہ جب سے ذرا ہوش سنبھال رہی تھی، یہی ضد کئے جاتی تھی کہ میں بی پاشا کی اترن کیوں پہنوں؟ کبھی کبھار تو آئینہ دیکھ کے ساتھ کہتی...... ”امنی میں تو بی پاشا سے بھی زیادہ

خوبصورت ہوں نا؟ پھر تو انوں میری اترن پہنانا؟......“

انا بی ہر گھڑی ہولتی تھیں۔ بڑے لوگ تو بڑے لوگ ہی ٹھہرے۔ اگر کسی نے سن گن پالی کہ موئی انا نا اصل بیٹی ایسے ایسے بول بولتی ہے تو ناک چوٹی کاٹ کر نکال باہر نہ کریں گے؟ ویسے بھی دودھ پلانے کا زمانہ تو مدت ہوئی بیت گیا تھا۔ وہ تو ڈیوڑھی کی روایت کہئے کہ انا لوگوں کی مرے بعد ہی چھٹی کی جاتی تھی۔ لیکن قصور بھی معاف کئے جانے کے قابل ہو تو ہی معافی ملتی ہے ایسا بھی کیا؟ انا بی نے چمکی کے کان مروڑ کر اسے سمجھایا۔

”آگے سے کچھ بولی تو یاد رکھ...... تیرے کو عمر بھر بی پاشا کے اترن پہننا ہے سمجھی کی نئیں، گدھے کی اولیاد!“

گدھے کی اولیاد نے اس وقت زبان سی لی...... لیکن ذہن میں لاوا پکتا ہی رہا۔

تیرہ برس کی ہوئیں تو شہزادی کی پہلی بار نماز آٹھویں دن گل پوسی ہوئی تو ایسا زرتار، جھم جھماتا جوڑا مما نے سلویا کہ آنکھ ٹھرتی نہ تھی...... جگہ جگہ سونے کے گھنگھروؤں کی جوڑیاں ٹنکوائیں کہ جب بی پاشا چلتیں تو چھن چھن پازیبیں سی بجتیں۔ ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق وہ حد سے سوا قیمتی جوڑا بھی اترن میں صدقہ دے دیا گیا۔ انا بی خوشی خوشی وہ سوغات لے کر پہنچی تو چمکی جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ دار اور حساس ہو چکی تھی، دکھ سے بولی، ”امنی مجبوری ناطے لینا ہور بات ہے مگر آپ ایسے چیزاں کو لے کو خوش مت ہوا کرو۔“

”اگے بیٹا......“ وہ رازداری سے بولیں...... ”یہ جوڑا اگر بکانے کو بھی بیٹھے تو وہ سو کل دار روپے تو کہیں نئیں گئے۔ اپن لوگاں نصیبے والے ہیں کہ ایسی ڈیوڑھی میں پڑے۔“

”امنی......“ چمکی نے بڑی حسرت سے کہا...... ”میرا کیا جی بولتا کی میں بھی کبھی بی پاشا کو اپنی اترن دیوں؟“

انا بی نے سر پیٹ لیا...... آگے تو بھی اب جوان ہو گئی گے ذرا عمل پکڑ...... ایسی ویسی باتیں کوئی سن لیا تو میں کیا کروں گی ماں...... ذرا میرے بڈھے چونڈے پو رحم کر......

چمکی ماں کو روتا دیکھ خاموش ہو گئی۔

مولوی صاحب نے دونوں کو ساتھ ہی ساتھ قرآن شریف اور اردو قاعدہ شروع کرایا تھا...... بی پاشا نے کم اور چمکی نے زیادہ تیزی دکھائی...... دونوں نے جب پہلی بار قرآن شریف کا دور ختم کیا تو بڑی پاشا نے از راہ عنایت چمکی کو بھی ایک ہلکے کپڑے کا نیا جوڑا اسلوا دیا تھا۔ ہر چند کہ

بعد میں اسے بی پاشا کا بھاری جوڑا بھی اترن میں مل گیا تھا۔ لیکن اسے اپناوہ جوڑا جان سے زیادہ عزیز تھا...... اس جوڑے سے اسے کسی قسم کی ذلت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہلکے زعفرانی رنگ کا سوتی جوڑا...... جو کتنے ہی سارے جگمگاتے۔ لس لس کرتے جوڑوں سے سوا تھا......

اب جبکہ خیر سے شہزادی پاشا ضرورت بھر پڑھ بھی چکی تھیں، جوان بھی ہوچکی تھیں...... ان کا گھر بسانے کی فکریں کی جارہی تھیں۔ ڈیوڑھی، سناتوں...... ورزیوں، بیوپاریوں کا مسکن بن چکی تھی۔ چمکی یہی سوچے جاتی کہ وہ تو شادی کے اتنے بڑی ہنگامے کے دن بھی اپنا وہی جوڑا پہنے گی جو کسی کی اتا ترن نہیں تھا۔

بڑی پاشا، جو واقعی بڑی مہربان خاتون تھیں، ہمیشہ اپنے نوکروں کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ اس لئے شہزادی پاشا کے ساتھ وہ چمکی کی شادی کے لئے بھی اتنی ہی فکر مند تھیں...... آخر نواب صاحب سے کہہ سن کرانھوں نے ایک مناسب لڑکا چمکی کے لئے تلاش کرہی لیا۔ سوچا کہ شہزادی پاشا کی شادی کے بعد اسی جھوڑ جھمکے میں چمکی کا بھی عقد پڑھا دیا جائے۔

اس دن جب شہزادی پاشا کے عقد کو صرف ایک دن رہ گیا تھا...... اور ڈیوڑھی مہمانوں سے ٹھسا ٹھس بھری پڑی تھی اور لڑکیوں کا، ٹڈی دل ڈیوڑھی کو سر پر اٹھائے ہوئے تھا، اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی شہزادی پاشا پیروں میں مہندی لگواتے ہوئے چمکی سے کہنے لگیں، ”تو سسرال جائے گی تو تیرے پیروں کو میں مہندی لگاؤں گی۔“

”ایو خدا نہ کرے ......“ انا بی نے پیار سے کہا......”اس کے پانواں آپ کے دشمناں چھوئیں...... آپ ایسا بولے سو بس ہے۔ بس اتی دعا کرنا پاشا کہ آپ کے دولہے میاں ویسا شریف دولہا اس کا نکل جائے۔“

”مگر اس کی شادی کب ہورئی جی؟“ کوئی چلبلی لڑکی پوچھ بیٹھی۔

شہزادی پاشا وہی بچپن والی غرور بھری ہنسی ہنس کر بلویں، میری اتی ساری اترن نکلے گی تو اس کا جہیز تیار سمجھو......“

اترن...... اترن...... اترن...... کئی ہزار سوئیوں کی باریک باریک نوکیں جیسے اس کے دل کو چھید گئیں...... وہ آنسو پیتے ہوئے اپنے کمرے میں آکر چپ جاپ پڑگئی۔

سر شام ہی لڑکیوں نے پھر ڈھولک سنبھال لی۔ ایک سے ایک واہیات گانا گایا جارہا تھا۔ پچھلی رات رت جگا ہوا تھا۔ آج پھر ہونے والا تھا۔ پرلی طرف صحن میں ڈھیروں چولہے جلائے، باورچی لوگ انواع واقسام کے کھانے تیار کرنے میں مشغول تھے۔ ڈیوڑھی پر رات ہی سے دن کا گمان ہورہا تھا۔

چمکی کا روتا ہوا حسن نارنجی جوڑے میں اور کھل اٹھا۔ یہ جوڑا وہ جوڑا تھا، جو اسے احساس کمتری کے پاتال سے اٹھا کر، عرش کی بلندیوں پر بیٹھا دیتا تھا۔ یہ جوڑا کیسی کی اترن نہیں تھا۔ نئے کپڑوں سے سلا ہوا جوڑا، جو اسے زندگی بھر میں ایک ہی بار نصیب ہوا تھا، ورنہ ساری عمر تو شہزادی پاشا کی اترن پہنتے ہی گزری تھی۔ اور اب چونکہ جہیز بھی تمام تر ان کی اترن ہی پر مشتمل تھا اس لئے باقی کی ساری عمر بھی اسے اترن ہی استعمال کرنی ہوگی۔

”لیکن بی پاشا...... ایک سیدزادی کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ وہ تم بھی دیکھ لینا۔ تمے ایک سے ایک پرانی چیز مجھے استعمال کرنے کو دیئے نا؟ اب تم دیکھنا......“

ملیدے کا تھال اٹھائے وہ دولہا والوں کی کوٹھی میں داخل ہوئی...... ہر طرف چراغاں ہورہا تھا...... یہاں بھی وہی چہل پہل تھی، جو دولہن والوں کے محل میں بھی، صبح ہی عقد خوانی جو تھی۔

اتنے ہنگامے اور اتنی بری کوٹھی میں کسی نے اس کا نوٹس بھی نہ لیا...... پوچھتی یا چھپتی وہ سیدھی دولہا میاں کے کمرے میں جا پہنچی...... ہلدی مہندی کی ریتوں رسموں سے تھکے تھکائے دولہا میاں اپنی مسہری پر دراز تھے۔ پردہ ہلا تو وہ مڑے، اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

گھٹنوں تک لمبا زعفرانی کرتا۔ کسی کسی پنڈلیوں پر منڈھا ہوا تنگ پاجامہ۔ ہلکی ہلکی کامدانی کا کڑھا ہوا زعفرانی دوپٹہ روئی روئی، بھیگی گلابی آنکھیں، چھوٹی آستینوں الے کرتے میں سے جھانکتی گداز بانہیں، بالوں میں موتیا کے گجرے پروہے ہوئے...... ہونٹوں پر ایک قاتل سی مسکراہٹ...... یہ سب نیا نہیں تھا...... لیکن ایک مرد جس کی پچھلی کئی راتیں کسی عورت کے تصور میں بتی ہوں...... شادی سے ایک رات پہلے بہت خطرناک ہوجاتا ہے...... چاہے ہو کیسا ہی شریف ہو،

رات جو دعوت گناہ ہوتی ہے۔

تنہائی جو گناہوں کی ہمت بڑھاتی ہے۔

چمکی نے انہیں یوں دیکھا کہ وہ جگہ جگہ سے ”ٹوٹ“ گئے...... چمکی جان بوجھ کر مونہہ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ تلملائے سے اپنی جگہ سے اٹھے، اور ٹھیک اس کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ آنکھوں کے گوشوں سے چمکی نے انہیں یوں دیکھا کہ وہ ڈھیر ہوگئے،

''تمہارا نام؟'' انہوں نے تھوک نگل کر کہا۔

''چمکی......'' اور ایک چمکیلی ہنسی نے اس کے پیارے پیارے چہرے کو چاند کر دیا۔

''واقعی تم میں جو چمک ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ تمہارا نام چمکی ہوتا......''

انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے شانے پہ رکھا۔ خالص مردوں والے لہجے میں ...... جو کسی لڑکی کو پٹانے سے پہلے خواہ مخواہ کی ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں...... لرزتے ہوئے اپنا ہاتھ شانے سے ہٹا کر اس کے ہاتھ کو پکڑے ہوئے بولے......

''یہ تھال میں کیا ہے؟''

چمکی نے قصداً ان کی ہمت بڑھائی...... ''آپ کے واسطے ملیدہ لائی ہوں، رت جگا تھا نہ رات کو......'' اور اس نے تلوار کے بغیر انہیں گھائل گھائل کر دیا...... ''مونہہ میٹھا کرنے کو......'' وہ مسکرائی۔

''ہم ملیدے ملیدے سے مونہہ میٹھا کرنے کے خائل نہیں ہیں...... ہم تو...... ہاں......'' اور انہوں نے ہونٹوں کے شہد سے اپنا مونہہ میٹھا کرنے کو اپنے ہونٹ بڑھا دیئے...... اور چمکی...... ان کی بانہوں میں ڈھیر ہوگئی...... ان کی پاکیزگی لوٹنے...... خود لٹنے...... اور انہیں لوٹنے کے لئے......

وداع کے دوسرے دن ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق جب شہزادی پاشا اپنی اترن اپنا سہاگ کا جوڑا اپنی انا اپنی کھلائی کی بٹیا کو دینے گئیں، تو چمکی نے مسکرا کر کہا:

''پاشا...... میں...... میں...... میں زندگی بھر آپ کی اترن استعمال کرتی آئی...... مگر اب آپ بھی......''

اور وہ یوں دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی...... ''میری استعمال کری ہوئی چیز اب زندگی بھر آپ بھی......'' اس کی ہنسی تھمتی ہی نہ تھی۔

سب لوگ یہی سمجھے کہ بچپن سے ساتھ کھیلی سہیلی کی جدائی کے غم نے عارضی طور سے چمکی کو پاگل کر دیا ہے......

* * *

ٹھکانا

''پاشا، میں بہوت پریشان ہو کر یہ فون کر رئی......'' صنوبر کی کانپتی آواز دور سے سنائی دی...... ''آپ کی بلی صبح سے کچھ کھا پی نئیں رئی......'' اس نے اٹکتے اٹکتے بات پوری کی۔

''اللہ میں مر گیا!...... رضیہ بانو، نواب اقتدار جنگ کی اکلوتی لڑکی، کانونٹ کی پڑھی ہوئی...... جسے حیدر آباد کے عام امراء کی لڑکیوں کی طرح لڑکوں کے انداز میں بات کرنے کا کریز تھا، فون میں منہ گھسیڑ کر تقریباً چلاتی ہوئی بولی...... ''ہو تم لوگاں کیا پانواں میں مہندی لگا لے کو بیٹھیں کیا؟ پپا کو بول کے ڈاکٹر کو ذرا فون کر دیو'' ...... پھر وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پیچھے مڑی اور اپنی عزیز از جان سہیلی روشن سے رونکھی ہو کر بولی...... ''اللہ روشن، پنکی کو کچھ ہو، ہوا گیا تو میں مر جاؤں گا......''

''اللہ نکو ریزی اتی پریشان نکو ہو......'' روشن آراء (وہ بیک وقت خالہ کی بیٹی بھی تھی اور سہیلی بھی...... اور دونوں ہی کو کانونٹ میں پڑھ پڑھ کر بات بات میں انگریزی بولنے اور ناموں کو ''انگریزیت'' میں ڈھالنے کا شوق تھا...... رضیہ کو ریزی اور روشن آراء کو روشنی کہلوانے کا خبط) فون کے پاس آ کر بولی۔ ''تو بولنا پپا سے لائن ملا دیو......''

''نئیں اللہ روشنی، تو نئیں سمجھتی، پپا سے فون ملانا خیامت ہے خیامت۔ انوں لیکچراں شروع کر دیں گے...... صبح ناشتے میں کیا کھائے؟ دوپہر میں کیا پیئے؟ سہ پہر کو سوئے کہ نئیں؟ چار بجے کہیں چائے تو نہیں پی لئے؟ نخصان کرتی ہے۔ نکو بابا...... ایک جھنجھٹ ہے کوئی۔ پھر وہ چونک کر فون کی طرف دوبارہ متوجہ ہوگئی۔ اللہ صنوبر، میں خود آتا ہوں۔''

اچانک بلی کے دودھ نہ پینے سے پکنک والے پروگرام کا کیسا سخت ستیاناس ہو رہا تھا۔ لیکن کیا کہا جا سکتا تھا؟ بلی آخر رضیہ بانو کی بلی تھی...... روشن آرا بھی مجبور تھی...... دو دن سے رضیہ اپنی خالی کی حویلی میں محض ہلڑ بازی مچانے آئی ہوئی تھیں...... کیونکہ چند روز بعد ان کی شادی ہونے والی

تھی۔ یہ فراغت کے دن رات کہاں نصیب ہونے والے تھے۔ پھر تو وہ خالص ''بیگمات'' بن جانے والی تھیں بڑے تخت پر شاندار تخت پوش بچھا ہوا...... سامنے سونے کا پاندان، تخت سے نیچے چاندی کی سلفچی، اگال دان، پان بنا کر نواب صاحب کو دے رہی ہیں، خود کھا رہی ہیں، حویلی کے بارے میں احکامات صادر کر رہی ہے۔ افواہ! شادی کے بعد کس قدر ذمہ داریاں گلے پڑ جاتی ہیں آئے دن کی دعوتیں اٹینڈ کرو...... پھر اپنے گھر پر ہونے والی دعوتوں کے سلسلے میں سیف کھول کر بار بار روپے نکال کر دو...... کاموں کی انتہا ہے کوئی...... ایسی ذمہ دارانہ زندگی اپنانے سے پہلے چند دن ساتھ کی ہم عمر سکھی سہیلیوں میں کھیل کود کر، گزار لئے جائیں، تو کیا ہی اچھی بات ہے...... لیکن قسمت میں ہو تب نا...... ورنہ یہ بیٹھے بٹھائے بلی کیوں بیمار پڑ جاتی......؟

پردے لگی ہوئی سیاہ فورڈ میں سے دونوں سہیلیاں حواس باختہ اتریں اور سیدھی زنان خانے کی طرف لپکیں۔ اب پیا حضور سے ملاخات کرنا کتنا ضروری حکم سہی......

لیکن بلی......!

چاندی کی پلنگڑی پر اعلیٰ گلابی قسم کے مخملیں شنائل پر پنکی ست پڑی تھی۔ بالوں دار لمبی دم پیٹ کے نیچے دبائے ہوئے۔ مالکن کے پیروں کی چاپ اور مانوس خوشبو سونگھ کر اس نے بڑی ادائے بیزاری سے ذرا سر ہلایا اور گلے میں پڑے ہوئے سونے کے گھنگھر و مدھم سروں میں چھن چھنائے......

''اللہ کیا ہو گیا جی میری جان کو...... رضیہ بانو نے لپک کر روئیں دار بلی کو بازوؤں میں دبوچ لیا...... منھی پاشا کے غم میں پوری ڈیوڑھی شریک ہونا چاہتی تھی اسی مارے ان کے پیچھے ایک جم غفیر آ کھڑا ہوا تھا۔

''پیا ڈاکٹر کو فون کرے کی نئیں؟'' اس نے گھوم کر جملہ حاضرین سے ایک سوال کیا۔

''ایک موڈر کنے کی آواز آئی تو تھی۔ شائد ڈاکٹر صاحب اچ ہوئیں گے...... پن پردے کی وجہ سے شاید ادھر چ بیٹھے ہوئیں گے......''

''پردے جھروکے کو مارو گولی جی! جلدی سے بلا کو لاؤ۔

لیکن اسی دم لکھنو والی نفیس باروچی، جو ڈیوڑھی میں محض ایک بریانی پکانے پر مامور تھیں، قدرے الجھ کر بولیں۔ ''اے موئے ڈاکٹر کیا کریں گے بھئی۔ وہ ہم بریانی کے لئے گوشت لیء بیٹھے تھے کہ پنکی بیگم آ گئیں اور اتنا نہ اتنا پورا پکی تول سے تین پاؤ گوشت کھا گئیں اب اتنا کچھ کھا لیا تو ست نہ پڑیں گی تو کیا ناچتی پھریں گی......؟

رضیہ بانو کا موڈ بری طرح آف ہو گیا۔ جھلا کر بولیں۔ ''تو ماما بی، تو نے ہماری بلی کو بکرے کا گوشت کھلا ڈالے، تو کوا تا بھی نئیں معلوم کی انے روازنہ ایک مرغی کھاتی ہیں۔ وئی تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ انے کائے سے ایسے سست ہو گئی۔''

''یہ حیدر آباد دکن ہے، پیارے مسعود!

یہ نوجوانوں، رئیس زادوں کی بستی ہے، یہاں یا تو انتہائی امیر لوگ بسے ہوئے ہیں یا نتہائی غریب، بلندیاں کا ایسا عجیب وغریب امتزاج میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ ہم لوگ بھی یہاں کے امراء اور روساء میں شمار کئے جاتے ہیں...... دہلی سے آ کر ہم لوگ یہیں کے ہو گئے ہیں۔ یہاں آ کر ہمیں سب کچھ مل گیا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں کھوئے کھوئے پن احساس جی کو ڈستا رہتا ہے۔ ابا میاں حضور نظام کے دربار میں اتنی بڑی جائیداد پر مامور کئے گئے ہیں کہ کہنے والے کہتے ہیں۔ کہ پھاوڑے اور کدالیاں لگوا کر بھی ہم یہ دولت پھنکوانا چاہیں تو نہین پھکنو پائیں گے...... ہاں اب ہمارے یہاں کے چھوٹے بچوں کی تعلیم مزے میں ہو رہی ہیں۔ کانونٹ میں انگلش ٹیچر سے پڑھتے ہیں۔ گھر پر استانی ماں اردو سکھاتی ہیں اور جغرافیہ، تاریخ، حساب الگ سے پڑھائی ہیں۔ مولوی صاحب مذہبی تعلیم کے لئے رکھے گئے ہیں......

مگر یار یہ برسوں بعد تمہیں میرا خیال کیسے آ گیا اور میرا خیال پوچھنے کی ضرورت کیسے پڑ گئی......؟

شادی؟ ہاں وہ جلد ہی ہونے والی ہے۔ یہاں ابا میاں کے گہرے دوستوں میں سے ایک نواب اقتدار جنگ ہیں۔ ان کی ایک ہی صاحب زادی ہے۔ سنا ہے (دیکھا نہیں) بڑی ہی خوبصورت اور فارورڈ ہے۔ ایک آدھ جھلک دد یکھ لینے کا (شادی سے پہلے) ارادہ ضرور ہے، کیونکہ یار سنا ہے کہ یہاں کی نواب زادیاں بڑی خوبصورت سہی، مگر ناک چڑھی بھی ہوتی ہیں۔ اگر صورت سے ایسا ویسا کچھ انداز ہو گیا تو میں کسی نہ کسی بہانے گول کر جاؤں گا لیکن اصل مصیبت یہ ہے کہ دوست کہ نواب اقتدار جنگ کے ہاں اس قدر شدید پردہ ہے کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ موٹروں میں موٹے موٹے ریشمی پردے لگے ہوئے ہیں...... امی جان نے لڑکی...... میرا مطلب ہے رضیہ بانو کو ایک محفل میں دیکھا، پسند کیا اور میرے لیے چن لیا۔ میں تو خیر میں ہی ہوں۔ حد یہ ہے کہ ابا میاں بھی ہونے والی بہو کو نہیں دیکھ سکتے۔ سات پردوں میں رہنے والی روایتی شہزادی سے گویا ہماری شادی ہو رہی ہے۔

بہر حال تم شادی میں ضرور شامل ہونا۔ رقعے تو مل ہی جائیں گے، لیکن میری طرف سے

تمہیں ذاتی طور پر خصوصی دعوت۔

ارے ہاں، میں شاید تمہیں نہیں بتایا کہ میں نے اکنامکس میں ایم اے کرلیا ہے......اور یار مسعود تم آج کل کیا کررہے ہو۔ کبھی تو دہلی سے باہر نکلو، شادی کے دعوتی رقعے کا انتظار کرو"۔

"تمہارا فیروز"

کیا ہی یادگار شادی تھی، کچھ پوچھئے نہیں......نواب اقتدار جنگ نے کہ روپیہ، جن کے ہاں پانی سے بھی گیا گزرا تھا۔ اس شادی میں ایک اور ہی جدت تھی۔ مہمانوں کے لئے جو مہمان خانے اور گھر سجائے جاتے ہیں، تواب کے سے انہوں نے یہ کیا کہ ہر مہمان خانے میں ایک ایک حسین سے حسین ترین رقاصہ کا بھی انتظام کیا......رقاصہ جو ناچے بھی، گائے بھی اور رات پر سیج بھی جائے۔ اب بھی ظاہر ہے کہ سب ہی مہمان تو کنوارے نہیں تھے، کئی بال بچوں، بیویوں والے بھی تھے۔ ایسی دھاں دھوں مچی کہ، بس، اب کون الو کا پٹھا تھا کہ تر انوالہ سامنے دیکھے اور منہ پھیر لے اور کئی بیویوں نے اپنے شوہروں سے فارغ خطی لے لی اور کئی نوابوں نے تو اپنی بیگمات کو کھڑے کھڑے تین طلاقیں دے دی، اور ان ہی رقاصاؤں کو گھر ڈال لیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس شادی کے انتظام پر کوئی نوے لاکھ روپیہ اٹھا تھا۔ ستر تو رقاصائیں مہیا کی گئی تھیں، جو ایک ایک رات کا ایک ہزار روپیہ نقد گنوا لیتی تھیں اور کئی دن پہلے سے یہ سارا انتظام شروع ہو گیا تھا۔

نواب اقتدار جنگ کے لئے سب سے زیادہ غرور کرنے کا لمحہ وہ تھا......جب فرماں روائے دکن میر عثمان علی خان نے اس شادی میں شرکت کرنے کا وعدہ فرمایا۔

لیکن نواب اقتدار جنگ کے واقعی پرکھوں کے نواب تھے اور بات کے پکے، اور ضد کے پورے، ایک ہی چھوٹی سی بات پر اڑ گئے اور کوئی یقین کرے نہ کرے، حیدر آباد دکن کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی ہوا کہ محض بیٹی کی ایک جھلک دیکھ لینے کی پاداش میں ہونے والے داماد کی چھٹی کر دی گئی ایک کروڑ روپیہ جو شادی کے انتظامات، جوڑ، جماؤ، جہیز دان کے سلسلے میں خرچ ہوا تھا۔ "اونہہ" کہہ کر بھلا دیا گیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ جس دن رضیہ بانو مائیوں بٹھائی گئیں تو ایسی پیاری اور حسین نظر آرہی تھیں کہ روایتی کوہ قاف کی پریوں کا حسن بھی ان کے سامنے ماند......مہندی کی رسم کے لئے جب دولہا والے بڑے ڈیوڑھی میں آئے تو کسی نے دولہا سے کہہ دیا کہ "دولہن نے وہ روپ نکالا ہے کہ بس دیکھو تو جل کر رہ جاؤ، خاک ہو جاؤ......"

کچھ تو جوانی کا جوش اور کچھ ہر ہونے والے دولہا کی سی شدید بے تابی اور

......چلبلاہٹ......جس کمرے میں رضیہ بانو بٹھائی گئی تھیں، اس کے پچھلی طرف والی بڑی کھڑکی کے چھجے پر چڑھ کر انہوں نے چپکے سے کل اپنی ہو جانے والی دولہن کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی ہوگی کہ اتفاقاً کسی کام سے نواب اقتدار کا ادھر سے گزر ہوا......اور وہ جیسے دہک اٹھے......

"مانا کہ کل دولہن ان کی ہو جائے گی۔ لیکن آج تو غیر محرم ہیں، یہ کوئی شرافت نہیں ہے"......اور انہوں نے اتنی آسانی سے یہ رشتہ توڑ دیا کہ کوئی دھاگے کو بھی ایسے نہیں توڑتا......

رضیہ بانو سات پردوں میں رہنے والی شہزادی ! غم نہ کرو، کیا تمہیں بر نہیں جڑے گا......؟ لیکن باپوں کی ضدوں پر ایسی قربانیاں کہاں تک جائز ہیں؟ وقت گزر رہا ہے......گزر رہا ہے......گزرتا جائے گا۔ اس ڈیوڑھی کی دیواریں کھوکھلی ہو رہی ہیں......میں تمہارا آئینہ ہوں......تمہارا عکس، تمہارے دل کی بات جاننے، پہنچاننے والا، بچپن کے نوخیز امنگوں کے چھیڑ چھاڑ......کھیل کود کے دن گئے......اور ساتھ ہی وہ دن بھی لد گئے، جب بایاں سونے کے گھنگھروں پہن کر، چاندی کی پلنگڑیوں پر سوتی تھیں اور چاندی کی کٹوریوں میں میوے والا دودھ پیتی تھیں......اور جن کے لنچ میں روز ایک مرغی ذبح کی جاتی تھی۔ اب پولیس ایکشن ہو چکا ہے۔ یہ تمہارا میرا جنت نشان حیدر آباد دکن، جہاں کی سڑکوں پر حضور نظام کی موٹر گاڑی نکلتی تھی تو سارے میں سناٹا پھیل جاتا اور تیز تیز سیٹیوں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا کہ ہر راہ گیر سڑک چھوڑ کر فٹ پاتھ پہ ہو جائے اور دوسری گاڑیاں اور سواریاں تیز تیز راہ چھوڑ کر نکل جائیں یا ایک طرف ہو کر کھڑی ہو جائیں......اب دھیرے دھیرے اپنی عظمت کے نقوش کھو رہا ہے۔ یہ بہت دن تمہیں گلے لگا کر نہ رکھ سکے گا۔ بھاگ جاؤ......کہیں بھی منہ چھپا لو......ایسا نہ ہو کہ آنے والا وقت تمہارے سرکش سر کو جھکا دے۔

بڑی بیگم کا جنازہ صحن کے بیچوں بیچ رکھا ہوا تھا۔ زمینداری، جاگیرداری اور نوابی ٹھاٹ کے خاتمے کی خبر سنتے ہی ان کا دم یوں نکل گیا جیسے غبارے سے محض ایک سوئی کی نوک چبھ جانے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ نواب اقتدار جنگ سخت دل، سخت جان تھے۔ ان پر اس خبر سے کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ انہوں نے بے پروائی سے کہا "اخباروں کو نئی نئی خبریں روز ہی چاہئیں، چلو آج یہی خبر سہی"۔

لیکن بیگم صاحبہ کی موت نے انہیں بھی ہلا کر رکھ دیا۔ تو گویا اب رضیہ بانو کی پوری پوری ذمہ داری ان ہی کے سر آپڑی۔ رضیہ بانو کی شادی رکوانے کے بعد کئی پیغام اس کے لئے آئے۔ لیکن انہیں ہر پیام میں کوئی نہ کوئی نقص نظر آتا گیا۔ بیگم صاحبہ جھلا کر کہہ اٹھتیں۔ "اب سارے حیدر آباد میں اچ کیڑے پڑ گئے تو کوئی آسمان کا تارا توڑ کر لاؤ بیٹی کے واسطے"

''وہ بھی ہو جائیں گا۔'' وہ ہنس کر کہتے۔

لیکن آج وہ سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ چلتی تو ان ہی کی تھی۔ لیکن ایک احساس کسی کی دوسراہٹ کا۔ سکھ دکھ بانٹ لینے کا احساس۔ آج سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

وقت کیسے بدل جاتا ہے خداوند !

''کہو میاں کیسے آئے؟ کہاں سے آئے ......؟ شبیر میاں کو دیکھ کر نواب اقتدار جنگ بولے۔

''جی شادی سے آ رہا ہوں ......'' شبیر میاں نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔

''کس کی شادی بھئی'' نواب صاحب ذرا مسکرائے۔

''وہ تو مجھے خود بھی پتہ نہیں۔''

''پھر ؟'' نواب صاحب نے حیرت سے کہا۔ ''رقعے پر کسی کا تو نام نشان ہوئیں گا ؟

''یہاں رقعہ وقعہ نہیں چلتا تایا ابا ......اپن تو جہاں بھی شادی دیکھتے ہیں ...... جا دھمکتے ہیں......''

جب سے زمیں داری اور نوابی ختم ہوئی تھی، اور ایک ایک کر کے سارے ٹھاٹ باٹ رخصت ہو گئے تھے اور وظیفہ ملنے لگا تھا، جو کہ دونوں گھرانوں کا برائے نام ہی تھا، ان شبیر میاں نے یہی دھندا شروع کر رکھا تھا۔ (اس طرح کھانے پینے کی بڑی فراوانی رہتی تھی) سرِ شام ہی سے وہ گھر سے نکل جاتے۔ راستے میں جہاں بھی گیس ہنڈے دھومک دھتا دیکھتے، فوراً براتی بن کر پہنچ جاتے ......سیدھے دولہا کے پاس جا کر پہلے تو ''مبارک باد'' کا نعرہ لگاتے اور پھر ایک دم گلے سے لپٹ جاتے۔ اب دولہا والے یہ سمجھتے کہ دولہن والوں کی طرف سے ہوں گے۔ جب ہی بے تکلفی کا یہ عالم ہے کہ آتے ہی دولہا سے لپٹ پڑے۔ اس طرح دونوں طرف سے ان کی آؤ بھگت اور خاطر مدارت ہوتی کہ دو دن بعد بھی کھانا نا ملتا تو پرواہ نہ ہوتی۔

شادیوں کے سیزن میں ان کی خوب موج ہو جاتی۔ ویسے خاصے پڑھے لکھے تھے، لیکن حالات نے کمر توڑ دی تھی۔ طبیعت میں ہنسی مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ تھوڑی پامسٹری بھی سیکھ رکھی تھی۔ کسی نہ کسی کا ہاتھ دیکھتے رہتے۔ خوش کرنے کی باتیں زیادہ بتاتے، کچھ دل سے بھی جوڑ دیتے۔ بری باتیں صفا گول کر جاتے ......رضیہ بانو کا ہاتھ دیکھ کر اسے بہت دلاسہ دیا تھا...... ''گھبرا نہیں بچی ...... تیرا مستقبل بے حد شان دار ہے...... بے حد پیسہ آئے گا تیرے ہاتھ میں......'' ادھر جب سے جاگیرداری چھنی تھی، بس دو وقت کی روٹی کے ہی لالے تھے ......نام نہاد بڑے پن کی

لالچ میں جو ایک کروڑ روپے کا پھٹکا کمر پر پڑا تھا۔ اس نے آگے ہی کھوکھلا کر دیا تھا، اوپر سے زمینات بھی چھن گئیں۔ رہا سہا اثاثہ کتنے دن کام آتا......؟ ایک ایک کر کے گھر دوکانیں اور کچھ بھی جائیدادیں بکتی رہی، نوبت گھر کے زیور پر آ کر ٹوٹی ...... بیٹا کوئی تھا نہیں کہ نوکری کر کے آسرا بنتا ......بیٹی کیا کرتی ......؟ خود بوڑھے ہو گئے تھے اور زمانے کی مار نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا، ایسے حالات میں امید افزا دنوں کا ہلکا سا تصور بھی دل کو خوش کر دیتا ہے۔ لیکن رضیہ بانو نے ہاتھ چھڑا کر بہت گہرے دکھ کے ساتھ کہا......

''شبیر بھائی ...... خواہ مخواہ زخموں کو مت کھرچو...... آپ کو معلوم نئیں کہ حالات کیا ہیں...... یا پھر میرے کو الو بنا لے رئیں...... اب کیا کبھی ہم ایسا سوچ بھی سکتیں کہ ہمارے پاس پیسہ آئیں گا''

......اور اس نے سر جھکا کر آنسو پونچھے تو شبیر میاں لرز کر رہ گئے۔ بے چاری کے سر میں یہاں وہاں سفید بال نظر آ رہے تھے۔ بال سفید ہونے کی تو یہ عمر نہ تھی۔

وہ بڑا بھیانک دن تھا۔ جس مہاجن کے پاس یہ کوٹھی رہن تھی، جس میں وہ آج تک رہتے آئے تھے۔ وہ سارے کاغذات لے آیا تھا...... ڈیوڑھی کا سامان تو ایک ایک کر کے بک ہی چکا تھا۔ اب خالی ڈھنڈار کوٹھی میں رکھا ہی کیا تھا۔ عزت سادات اسی میں تھی کہ تھوڑے بہت روپے جو بھی اس نے ہتھیلی پر رکھ دیئے چپکے سے لے لیں اور ڈیوڑھی خالی کر دیں۔

دو دن کی مہلت مہاجن سے مانگی تھی، جو اس نے از راہ رواداری دے دی تھی۔ اپنے ایک ملنے والے توسط سے پرانے حیدر آباد کے ایک سستے محلے ''پنچھی براق'' میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا۔ چند گنتی کے برتنوں اور ایک بستر پیٹی کے ساتھ جب دونوں باپ بیٹی اپنے نوکروں سے بھی گئے گزرے مکان میں اترے تو ایک رکشا والے نے دوسرے رکشا والے کو آنکھ ماری :

''نیا مال ہے سالے...... دیکھتا کیا ہے ؟''

رضیہ بانو لرز کر رہ گئی ...... قسمت نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، حالات تو سب ہی کے بدلے تھے، لیکن سب کے پاس جذبات کے ساتھ ساتھ عقل بھی تھی ...... پپا کے پاس نرے جذبات ہی جذبات تھے۔ جنہوں نے اپنے وطن عزیز کی مٹی کو آسمان جانا اور کہیں جانے کے بارے میں بھول کر سوچا نہیں...... ان کے کتنے سارے عزیز آج پاکستان میں تھے اور کچھ تو کلیم میں جائیداد حاصل کر کے اور کچھ چار سو بیسی کر کے آج بھی راج کر رہے تھے...... لیکن پپا تھے جنہوں نے ہر موقع پر صرف اپنی ہی ہٹ چلائی تھی......

''پپا !'' رضیہ بانو دکھ سے بولی...... ''آج چاول بالکل ختم ہو گئے ہور......'' اس نے رکتے

رکتے کہا...... ''دال بھی ......اللہ پپا......'' وہ سسک کر بولی۔ ''ہم لوگاں بہوت گناہ کرے تھے کیا ؟''

''ٹھیرو بی بی......'' وہ اٹھے۔ دروازے تک گئے۔ ہاتھ زندگی بھر اٹھا ہی رہا تھا......مگر دینے کے لئے لینے کے لئے ہاتھ کیسے اٹھاتے......؟ کچھ دیر سوچا کیسے......کیسے آواز لگائیں ؟......کس سے بھیک مانگیں؟ پھر ایک خیال آیا نہیں۔ چاندی کا وہ کٹورا اج تک ان کے ساتھ تھا جس سے سہاگ رات کو باری باری میاں بیوی نے ایک ایک گھونٹ کرکے دودھ پیا تھا......سوچا اسے دروازے کے سامنے ایک کپڑا پھیلا کر رکھ دیں۔ جو بھی رحم دل ہوگا، سمجھ لے گا، غیر مند فقیر ہے، خیرات کے لئے رکھا ہوگا...... کچھ نہ کچھ ڈال ہی دے گا۔ ایک کپڑے پر کٹورا رکھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ گھر میں آگئے۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد جاکر جھانکتے کہ شاید کسی نے کچھ ڈال دیا ہو۔ ہر بار مایوسی ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد پھر گئے تو کٹورا ہی غائب تھا۔ اگر یہ انجام معلوم ہوتا تو کچھ روپے چاندی بیچ کر ہی بنا لیتے......مگر جذبات ! بی بی کی چیز سے جو لگاؤ گہرا تھا، وہ بیچنے دیتا......؟

اک دم وہ بیٹی کو گلے لگا کر چیخ چیخ کر رو پڑے...... ''بیٹا، میں تمہاری زندگی تباہ کر دیا۔ اللہ مجھے معاف نہیں کریں گا۔ روزانہ راتوں میں دعائیں مانگ مانگ کر رو یا ہوں، کہ اللہ تو میرے خصور معاف کردے۔ میری بچی کے نصیب کھول دے۔ مگر ایسا لگتا بیٹا کہ اللہ بھی ہم سے ناراض ہو گیا ہے...... بیٹا میں تو کیسا بھی کرکے بھیک مانگ کر بھی جی لے سکتا ہوں، پر بیٹا تم......تمہارا کیا ہوئیں گا......'' پھر وہ بلک بلک کر رونے لگے...... ''اللہ میری بیٹی کو کسی ٹھکانے سے لگا دے معبود !

دو دن گزر چکے تھے، گھر میں کچھ تھا بھی نہیں۔ پکا بھی نہیں......رضیہ بانو اپنے چھوٹے سے بوسیدہ مکان کی کھڑکی میں بے رنگ بے مقصد نگاہوں سے سڑک کو گھور رہی تھی کہ نیچے سے ایک رکشا والا اسے دیکھ کر مسکرایا۔

رضیہ نے اسے دیکھا تک نہیں......کھڑکی سے ہٹی بھی نہیں۔ رکشا والا سمجھا، بات بن گئی وہ زور زور سے پیڈل مارتا ہوا چلا گیا۔

رات کے کوئی گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ نواب اقتدار جھنگ دروازے پر گئے تو رکشا والا رازداری سے بولا :

بائی جی ہیں ؟''

''بائی جی......''؟ نواب صاحب کا دل دھڑکا۔ وہ مونہہ سے کچھ کہہ بھی نہ پائے تھے کہ رکشا

والا بول اٹھا......

''موٹی اسامی ہے......ہاں......''

نواب صاحب کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت ختم ہو چکی تھی، بے جان سے پتلے کی طرح وہ راستے سے ہٹ گئے...... ''موٹی آسامی'' جواب تک رکشا ہی میں بیٹھی ہوئی تھی، رکشا والے کا اشارہ پاکر اتری......اندھیرے میں کچھ کھسر پھسر ہوئی ......رکشا والے نے اپنا کرایہ، اپنا ''محنتانہ'' لیا اور اندھیرے میں رکشا کو ہاتھوں ہی میں پکڑے پکڑے کھو گیا۔

جب وہ......ہاں وہی جو سات پردوں میں رہتی تھی، جس کی ایک جھلک بھی اس کا اپنا ہونے والا شوہر نہیں دیکھ سکتا تھا، جب وہ حالات کے ہاتھوں بک گئی تو صبح کے ملگجے اجالے نے اس کے ہاتھوں میں دس دس کے کئی نوٹ دیکھے۔

وہ پاگل بھی نہیں ہوئی، اس نے حواس بھی نہیں کھوئے، اسے البتہ اس بات پر پورا یقین آگیا کہ شبیر بھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں بتاتی ہیں کہ وہ بہت پیسہ کمانے والی ہے۔

دونوں ہاتھوں میں ڈھیر سارے نوٹ اٹھائے جب وہ پنچھی براق کے بدنام محلے والے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے باپ کے سامنے پہنچی تو پہلے باپ کو سوجھا ہی نہیں وہ کیا کہے۔ پھر جب وہ روپے باپ کے سامنے ڈال کر کمرے میں واپس چلی گئی تو ......دو دن کے بھوکے پیٹ نے خوش ہوکر پروردگار کے سامنے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''شکر ہے میرے مالک کہ میری بیٹی کو ایک ٹھکانہ مل گیا......''

* * *

ہل

ایو ماں بارات آگئی ہے……

’’اگے دولا آگیا……چلو بیگی سے……‘‘

باہر باجوں کی تیز تیز آوازوں کے ساتھ، اندر زنان خانے میں لڑکیوں اور عورتوں کا شور بھی رل مل گیا۔ سب کی سب ایک بھرامار کر دلہن کو چھوڑ کر چاندنی کی طرف بھاگیں۔

’’ائی ہلو ہلو چلو جی ماں……‘‘ کوئی بچوں والی عورت بیزار سی آواز میں بولی، ’’اجاڑ چوتھی بار دولا بنے، سو دولے کو دیکھنے کی ایسی بھی کیا ماری پڑی بول کے……‘‘

دلہن کا دل اپنی جگہ ڈوب کر رہ گیا۔

یہ بات نہیں کہ اسے اس لمحے سے پہلے تک اس بات کا علم نہ ہوا ہو کہ وہ ایک ایسے شوہر کی بیوی بن کر جا رہی تھی جس کی آگے ہی ایک نہ دو، تین تین بیویاں موجود تھیں……لیکن اس کی اپنی تو پہلی شادی تھی نا؟……گھر میں جب کبھی یہ ذکر ہوتا وہ انجان سی بن جاتی……اسی لئے آج سے پانچ دن پہلے جب اسے پیلے کپڑے پہنا کر مایوں بٹھایا گیا تھا اور گھر میں لڑکیوں بالیوں کی دھوم اور رول مچ رہی تھی تو وہ جان بوجھ کر سر درد کا بہانہ لے کر لیٹ گئی تھی تا کہ یہ شور شرابے اس کے کمرے سے دور ہو جائے جس میں رہ رہ کر کوئی نہ کوئی عورت سرگوشیوں میں، یا کوئی حماقت سے، زور زور سے ہی پوچھنے لگتی، ’’ہو جی بولتے دولت نواب کی یہ چوتھی شادی ہے انے……‘‘

کسی کو جواب ملتا، ’’اجاڑ تم کو اتی پنچایت کائے کو جی……ہوئیں گی سو ہوئیں گی، تمہارے پیٹ میں کائے کو سول اٹھ ریا……‘‘

کسی کو جواب ملتا، ’’ہو ہے تم……پن معلوم بھی ہے کی اجاڑ دولت کتی ہے……عمر عمر سونے چاندی میں کھیلتی رہیں گی……‘‘

’’ہو جی تو سونے چاندی کے بدلے میں اولاد کو بیچ دیتے رہتے کیا؟‘‘

’’تمہارے انگ میں کائے کو آگ لگ رئی جی بول کے……‘‘

دولہن کے دل سے دھواں سا اٹھنے لگا……مانجے مایوں سے پہلے ہی سے، جب یہ شادی ٹھہری تھی، یہی بول سنتے سنتے اس کا کلیجہ کچا ہو گیا تھا، لیکن بولتی بتاتی کس سے؟……معمولی سے متوسط گھرانے کی خوب صورت سی لڑکی، جس نے کسی اسکول کی سہیلی کی شادی میں ذرا جگر مگر کرتے کپڑے پہن لئے تھے، اور یونہی بے تکا سا سنگھار کر کے، بال گیلے تھے تو ذرا ڈھیلی سی چوٹی گوندھ لی تھی، اور شادی گھر کی اجلی اجلی چاندنیوں اور مسندوں پر التی پھر رہی تھی……پتہ نہیں کس رشتے ناطے سے نواب دولت یار جنگ کا خاندان بھی اس شادی میں آیا ہوا تھا۔

ساروں کی نگاہوں کا مرکز وہ لمبی سی ناگن تھی جس نے اب تک تو کسی کو نہیں ڈسا تھا، لیکن زبان لپ لپاتی یہاں وہاں گھوم رہی تھی……جلوے اور آرسی مصحف کے وقت جب زنانہ مردانہ ایک ہی ہال میں ٹوٹا پڑ رہا تھا تو آئینے کی پکار مچی کہ دولہن دولہا کو اس میں ایک دوسرے کا موںھہ دکھایا جانا تھا……صابرہ جب آئینہ لینے دوسرے کمرے کو لپکی تو اتفاق سے دولت یار جنگ دوسرے دروازے سے داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے صابرہ کی صرف پیٹھ دیکھی جس پر ایک ناگن جھول رہی تھی……جھوم رہی تھی۔

’’باپ رے! اتنے بڑے بالاں تو ہم خواباں میں بھی نئیں دیکھے……‘‘ وہ ہنس کر بولے۔

بڑی پاشا ان کے بازو ہی تھیں……یوں جیسے بچہ کسی چیز پر لپکے اور ماں فوراً دلا دینے کو تل جائے، پیار سے بولیں، ’’ائی ماں تیکو بالاں پسند آگئیں چھوکری کے……کرتا شادی؟……‘‘

’’جی نئیں……‘‘ وہ گھبرا کر بولے، ’’ہم اس انداز سے نئیں بولے، بس سچی بات تھی موںھہ سے نکل گئی……‘‘

’’ائی تو کیا ہوا……اجاڑ نسل چلانے والا کوئی تو ہونا……‘‘

دولت یار جنگ کی تین تین دلہنیں تھیں……اولاد ایک سے بھی نہیں تھی۔ بڑی دلہن سگے ماموں کی بیٹی تھیں……بچپن سے منگنی ہوئی……اب اولاد تو اللہ کی دین ہے۔ پھر کسی دوست کی شادی میں گھمر گھمر ناچتی ایک پاتر پہ دل آگیا……عقد پڑھوا لیا۔ ماں نے تو کچھ نہ کہا……بڑے نواب بگڑے، لیکن نوابوں میں اور پیسے والوں میں منہ کا مزہ بدلنے کو دو چار عورتیں کر لینا ایسی کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی، سو چپ ہو رہے۔ ہاں اتنی قید البتہ ضرور لگا دی کہ ’’وہ ناچن ہمارے

باپ دادوں کے وقت کی عزت دار حویلی میں نئیں آنا بول کے……''

وہ الگ ایک حویلی میں رہتی تھی، اور نواب دولت یار جنگ کا زیادہ وقت اسی کے پاس اور اسی کے ساتھ گزرتا تھا…… ویسے ادھر ادھر مہینے میں چار پانچ بار اور چر چگ لیتے۔

پھر تیسری تھیں جو اماں جانی کی ضد پر، کہ پوتا کھلانے کی آرزو میں ہر دن گور سے قریب اور گھر سے دور ہوئی جا رہی تھیں، بے حد دھوم دھام سے بیاہ کر لائی گئی تھیں۔ بھائی سے اسی مارے عمر بھر کے تعلقات ٹوٹ سے گئے، مگر بڑی دلہن بھی ایسی میاں کی دیوانی تھیں کہ دھڑا دھڑ سوکنوں پر سکنیں چلی آ رہی تھیں لیکن میاں سے بدظن ہونے کا نام نہ لیتیں۔

اور آج تو انہوں نے غضب کر دیا تھا…… چھوٹی دلہن کا پورا ساج سنگھار اپنے ہاتھوں کیا تھا اور ابھی بارات آنے کی ہلڑ سے پہلے گھونگھٹ میں میں موںہہ ڈال کر بڑے پیار سے کہہ رہی تھیں، ''میں دیکھو تم نا سجانے سنوارنے سب سے پہلے اچ آ گئی۔ اب عقد خوانی کے بعد اپنے ہاتھاں سے تمہارے گلے میں کالی پوت کا لچھا پہنا مئں گی بول کے…… ڈیوڑھی کو تم تو بھی ایک آدھ وارث دینا ماں…… ہم لوگاں تو خالی ہاتھ، خالی گودی کے اچ رہے۔'' پھر رک رک بولیں: ''…… اب تو ہاتھ بھی نہیں لگاتے……'' صابرہ کا دل جو پہلے ہی ڈوبنے ڈوبنے کو ہو رہا تھا، بالکل ہی ڈوب کر رہ گیا۔

شادی کی خوشی کیسی ہوتی ہوگی؟…… شادی تو ہو رہی تھی، لیکن ایسی شادی کی خوشی جو کورے اور کنوارے مرد سے ہوتی ہوگی!!

''امنی تمہارے گھر میں کھٹی دال چاول کھانے کو بھی میں اتی اچ خوش تھی جتا لوگاں مرغیاں ہو بریانیاں کھا کو رہتے ہوئیں گے۔ پھر تم کائے کو میرا ایسا دیس نکالا کرے؟؟……''

دولت نواب کی طرف سے پورے چاؤ چونچلے، پہلی شادی کی طرح ہو رہے تھے۔ آرسی مصحف بھی ہوا، چاول گنانے کی رسم بھی ہوئی…… ریشمی پاجامے میں ازار بند ڈالنے کی رسم بھی ہوئی۔ دودھ سے پیر بھی دھلائے گئے۔ لیکن صابرہ کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ سسرال، جگمگاتی ہوئی ڈیوڑھی اور سجے سجائے کمرے میں کیسے پہنچائی گئی۔

ہوش تو اسے جب آیا، جب ہنستی فقرے کستی، سسرال کی عورتیں اور لڑکیاں دولہا میاں کو کمرے میں دھکیل کر باہر سے دروازہ بھیڑ کر چلی گئیں اور وہ ڈری سہمی، سر جھکائے ہر ہر پل اور لمحے کا حساب کرتی رہی کہ اب چوتھی بار دولہا بننے والا مرد کس طرح اس کے سوئے ہوئے مردہ

احساسات کو جگاتا ہے…… لیکن یہاں بھی اس کے نصیب میں وہی کھٹی دال اور چاول لکھے ہوئے تھے۔

وہ آرام کرسی پر کچھ لیٹے کچھ بیٹھے جھولے سے کھاتے رہے۔ پھر عجیب بے حسی سے بولے، ''تمہارے لمبے بالاں ہمارے جی کا جنجال بن گئے حفت۔''

وہ حرکت بھی نہ کر سکی۔

وہ پھر گویا ہوئے، ''تم برا نئیں ماننا…… ہمارا دل چھوٹی حویلی میں زیادہ لگتا بول کے…… اب اماں جانی کی خوشی تھی بول کے ہم نے نکاح پڑھا لئے۔ یہاں آ بھی گئے، پر اب ہم تھوڑی دیر آرام کر کو چھوٹی حویلی کو چلے جائیں گے۔''

وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔

''ہم اتا ضرور بول رہے ہئیں کہ تم نا اس ڈیوڑھی میں کوئی تکلیف نئیں ہوئیں کی…… ہم کیا کرنا…… نہ دل ہمارے بس کا ہے نہ اولاد…… دل چھوٹی حویلی میں ستارہ کے پاس ہوتا ہے، ہور اولاد خدا کے ہاتھ میں…… وہ مالک دینے والا ہوتا تو تین تین میں سے کسی ایک سے تو دیتا، مگر ہم کو لگتا کی اولاد کی خوشی ہمارے مقدر میں اچ نئیں……''

وہ دھیرے دھیرے آنسو بہاتی رہی…… رات گئے وہ چوروں کی طرح اٹھے۔ ادھر ادھر جھانک کر اطمینان کیا کہ سب رشتے دار سو چکے ہیں، سارے میں سوتا پڑا ہے۔ کچھ نوکر چاکر کام کاج میں مصروف ہیں، کچھ آڑے ٹیڑھے یہاں وہاں ادھ مرے پڑے ہیں…… پچھلے دروازے سے نکل کر سائیں کو جگا کر بگھی نکلوائی اور چھوٹی حویلی پہنچ گئے……

دستور اور قاعدے کے مطابق، پہلی صبح خوشی خوشی ساس دلہن کے کمرے میں پہنچیں کہ گل بوٹوں سے بھری چادر سمدھن کو مٹھائی کے ساتھ بھجوائیں کہ ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

چادر پر گل بوٹے تو کیا کھلتے، خود دلہن کے چہرے کا پھول بھی جوں کا توں، افشاں اور مسی سے سجا سجایا، ان چھوا پڑا ہوا تھا۔

''ائی اجاڑ…… یہ کیسی سہاگ رات منایا اجی نے……'' وہ بیٹے کو دل ہی دل میں پیار سے برا برا بولنے لگیں…… پھر خود ہی ہنسیں…… ''ائی اجاڑ ماری میری گل پو بڑھاپے سے پتھر پڑ گئیں…… دولن پاکی کا نہانا نئیں نہائی ہوئیں گی…… چلو آج نئیں تو دو چار دن کے بعد……''

ساس کے جانے کے بعد ستانے والیوں کی پوری فوج اندر گھس پڑی…… کوئی گالوں پر نیل

کے نشان ڈھونڈ رہی ہے، کوئی بستر پر نگوں کے جوڑوں کے گرے ہوئے نگ تلاش کر رہی ہے، کوئی سونا بائی چوڑیوں کے ٹکڑے ڈھونڈ رہی ہے، کوئی مرجھائے ہوئے پھولوں کو ہنس ہنس کر دیکھ رہی ہے۔

سنجلی دلہن چپ چاپ کھڑی تھیں۔

صابرہ ہونق بنی ایک ایک کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔

دبی دبی سرگوشیوں اور دوپٹوں میں مونہہ چھپا چھپا کر ابھرنے والی ہنسیوں سے پرے سنجلی دلہن بولیں، ‘‘تم نا یہاں کچھ بھی نئیں ملنے والا......’’ وہ کمرے میں موجود لڑکیوں اور عورتوں سے مخاطب تھیں، ‘‘نا گالاں پو نیل کے داغاں......نہ چوڑیوں کے ٹکڑے، نہ دھینگا مستی میں چوڑیوں کے گرے ہوئے نگاں......نہ پھولاں، نہ بکھرے ہوئے پتیاں......مرد لوگاں کو کیا کمتی......’’ وہ ہنسیں، ‘‘ہور پھر پیسے والے مرداں کو؟......جدھر آنکھاں اٹھائے ادھر عورتاں ملتے۔ پھر بازاری عورتاں کے نخرے، ہور چھنال گھنگھوٹے۔ ہے تمے کاں سے لاتے......؟ بس خوب کھاؤ......اچھے سے اچھا پہنو ہوڑو......سنے چاندی میں پیلے اجلے رہو......ہور یہ بھول جاؤ کی......’’ ان کی دھیمی دھیمی آواز ایک روتی ہوئی چیخ میں بدل گئی......ہور یہ بھول جاؤ کی جسم کی ایک بھوک ہوتی......’’

نہانے کی ضرورت نی ہونے پر بھی دولہن کے غسل کے ہنگامے زنانے میں بچ گئے۔ ڈیوڑھی میں نل نہیں تھے، احاطے میں باوڑی (کنواں) تھی۔ بھوئی کندھوں پر کلوڑ لٹکا کر پانی لا کر بھرتے تھے۔

‘‘اگے دولہن کے نہانے کو باوڑی سے پانی لانے کو بولو گے شمشاد بھوئی کو......مغلائی بی سارے میں چلاتی پھر رہی تھیں۔

‘‘شمشوا بی ابی مردانے میں پانی بھر کو سو گیا......دوسرے بھوئی کو بولوں؟’’ کوئی باہر سے پکارا۔

ائی وہ اجاڑ بڈ گا حذیر کیا بھریں گا جی......یہاں تو سارے ہیاں کی اچ سہاگ رات منی ہے......بھوت پانی ہونا......کوئی تیز طرار خواص بولی......

سارے میں ہنسی مچ گئی۔

پھر شمشو دو توں مضبوط کندھوں پر دو بڑی بڑی مشکیں اٹھائے آیا۔ سانولے چہرے پر وزن اٹھانے کی مشقت سے خون چھلکارے مار رہا تھا۔ کچھ پردہ کرنے اندر بھاگیں۔’’

ائی اجاڑ مرد مانے مونہہ اٹھا کر اندر چلے آرئیں۔ کوئی بولتا بھی نہیں کی گوشہ کرلیو......
کچھ جان بوجھ کت ٹھی ٹھی کھی کھی وہیں کھڑی رہیں۔

صابرہ اپنے لمبے چوڑے سجے سجائے چھپر کھٹ سے یہ منظر دیکھا کی۔

پہلے جمعے کی پہلی جمعگی ہوئی۔ نئے سرے صابرہ کو دولہن بنایا گیا۔ وہ پھر بھی کنواری ہی رہی۔

دوسرے جمعہ کو حویلی کے دستور کے مطابق پھر جمعگی کی رسم ہوئی۔ صابرہ پھر دلہن بنائی گئی۔ وہ پھر بھی کنواری ہی رہی۔

پانچوں جمعے یوں ہی نکل گئے۔

دولت نواب اسے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے دیکھتے......صرف دیکھتے......بہت ہوا تو کبھی اس کی پیٹھ پر نظر جا پڑتی تو ہنس کر بولتے، ‘‘کتے لمبے بالاں ہیں باپ......’’ کبھی خوب بڑا جوڑا بندھا دیکھتے تو بولتے ‘‘کیا کپہ کا کپہ (ڈھیر کا ڈھیر) ہے حضت......تم کو تو تکئے کی بھی ضرورت نہیں......’’

ایک دن صابرہ بڑے تیکھے انداز میں بول اٹھی ‘‘تکئے کی تو واقعی ضرورت نہیں، پن ہور کسی چیز کی تو ضرورت پڑتی ہوئیں گی......!’’

جس کا پیٹ بھرا ہوا اس کو دوسرے کی بھوک کا پتہ نہیں چل سکتا۔ نواب صاحب نے بغیر جانے سمجھے کہا ‘‘ڈیوڑھ میں کیا نہیں ہے بول کے جناب......آپ امنی حضور سے بول دیا کرو۔’’

صابرہ سر پیچھے ڈال کر اس بری طرح ہنس کہ اس کے سارے بال جوڑے سے کھل کر فرش پر بکھر گئے۔

‘‘میری شادی امی سے ہوئی کیا؟......ہور وہ میرے کو......’’ اک دم وہ بات پی گئی۔ پھر سنبھل کر بولی ‘‘ایک بات آپ میرے کو بتائیں گے؟......’’

‘‘جی ہو......آپ پوچھو تو’’

‘‘اللہ میاں ایک مرد کو چار شادیاں کی اجازت دی نا؟......’’

‘‘جی ہو......پھر؟......’’ وہ حیرت سے بولے۔

‘‘میں تو ابھی دہم جماعت میں پڑھ اچ رہی تھی کہ اٹھا کو میری شادی کر دئے ماں باپ......اتا علم میرے کو نہیں آتا، اس واسطے آپ سے بچھ رئی......ایک مرد کسی دن ایک عورت کے پاس، کسی رات دوسری عورت کے پاس......یا بھوت بھی بھوت ہوا تو چلو سمجھوانے دن باندھ دیا کی

جمعہ کی پہلی، شنبہ کو دوسری، یک شنبہ کو تیسری......اب میں پوچھتیوں کی فرض کرو وہ جمعہ والی بہت مستاڑی ہے، انے بولتی میرے کو خالی ایک دن نکو۔ روز روز میرے پاس آؤ......''

''اگے اگے اگے......'' دولت نواب غصہ سے بولے'' یہ انے شریف گھرانے کے ہو کے تم کیسے کیسے باتاں کرلے رئیں بی بی......''

''میں کوئی کپڑے اترے دے باتاں تو نہیں کر رئی۔ آپ سے ایک سیدھی سادی بات بچھ رئی......''

وہ ہانپ کر بولے'' ہم کو جتا معلوم ہے آپ کو بتاتے......دیکھو عورتاں ہیں نا۔ ہمارا مطلب ہے بیویاں......تو امی حضور ہور ابا حضور مولوی صاحب، سوب یہ بتائے کی بیویاں مرد کی زمین ہوتے، کھیتی ہوتے......ہور یہ کی مرد جب چاہا اپنی کسی بھی کھیتی میں جالے سکتا......''

وہ بات کلٹ کر چلائی'' وہ تو میں بھی سمجھی جی، کی بیوی مرد کی کھیتی ہوتی، پر کھیتی کو پڑ پت ڈال کو رکھے، سو وہ دہائی نہیں دیتی کیا؟؟......''

اس کے گالوں کے گلاب دہک رہے تھے......سرخ سرخ ہونٹوں کے کنارے پھڑک رہے تھے، آنکھیں شعلوں کی مانند ہو رہی تھیں۔ سیاہ لمبے لمبے بال آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ ڈھلے کرتے میں مسلسل سرکشی ہو رہی تھیں اور پنڈلیوں پر کسے تنگ پاجامے نے یہ راز کھول دیا تھا کہ وہ قابو سے باہر ہے۔

چار نکاحی بیویوں کے باوجود بھی دولت نواب یار جنگ پارسا نہیں تھے۔ یہاں وہاں مونہہ مارت رہتے رہتے تھے۔ اصل میں کیا ہے کہ کسی کے پاس بہت سارے کپڑوں کے جوڑے ہوں نا، تو پہلے دن جو جوڑا پہنا تھا اس کی باری بہت دنوں بعد آتی ہے یا آتی ہی نہیں، جو سامنے آیا اسے ہی چڑھالیا۔

وہ صابرہ کی طرف لپکے......وہ پیچھے ہٹ کے غصے سے بولی'' بڑے آئے ستر جوروں کے مردوئے......میرے کو ہاتھ نکو لگاؤ......''

''کیوں نکو لگانا؟......ہم مرد نہیں کیا تمہارے؟......''

''میری نمازاں خضا ہور ئیں آج کل''

انہوں نے سر پر ہاتھ مارا'' انے سارے باتاں تم ناکاں سے معلوم ہو گئے جی......ابی ابی تو

مدرسے سے اٹھائے اماں باوا......''

منجلی دولہن دوسرے دن خوشی سے سرشار، شاباشی دینے کے انداز میں بولیں'' تمہارے باتاں سوب سنی ہیں......بہوت لی بہوت اچھا کھرا کھرا بولے تھے......غصے میں تمہاری آواز بہوت اونچی ہو گئی تھی، میرے کو بھی کبھی ہاتھ نہیں لگاتے ماں......بس انوں کو باہر کے حرام زادیاں اچ ہونا......تمہارے ویسا جھگڑے تو میں کبھی نہیں کری۔ ایک دو بار دی زبان سے خالی ایسا بولی کہ میرے میرے کو اکیلے کمرے میں ڈر ہوتا، تو کیا بولے معلوم؟......'' میں سمجھ لیا......عورت مرد کی کھیتی ہوتی، جب چاہے آلے سکتا......جب میرا جی چاہیں گا آجاؤں گا......

صابرہ دانت پیس کر بولی'' ہور جب میرا جی چاہیں گا؟؟''......پھر لوہار کی دھونکی بن کر کہنے لگی بابا جی، فرض کرو ایک مرد ہے۔ اس کے چار جوان بیویاں ہیں۔ چاروں بولتیں کی آج میرے پاس رہو، آج میرے پاس رہو......چلو جانے دیو چاروں کو۔ خالی ان میں ایک اچ ایسی ہے کہ بولتی تم میرے کو روز ہونا......ہور وہ اس کے ارماناں روز روز پورے نہیں کر سکتا......ہور طلاخ بھی نہیں دیتا تو انے کیا کرنا؟؟

تسی، وی عورت کیا کرنا؟

منجلی دلہن اپنے گالوں پر دھیرے دھیرے تھپڑ مارنے لگیں'' توبہ......توبہ......تم کائے کو ایسا مکروہ لفظ مونہہ سے نکالتے ماں......جانے دیو گناہ ہوئیں گا۔''

''اللہ معاف کریں گا......غصہ کرنا بھی گناہ ہے بول کے......؟؟

دولت نواب اس ایک دن کے وقتی ابال کے بعد چھوٹی دلہن کو پھر بھول بیٹھے۔

شمشو بازو کی مچھلیاں نکالے وزنی وزنی مشکیں لٹکائے آیا تو مغلائی بولیں'' اگے بھوئی یہ دیکھ کے آنگن کی جھاری کتی سوکھ گئی۔ موا مالی کہتے کتے دن سے پلٹا اچ نہیں......ایک کلوڑا ادھر بھی ڈال دے ماں۔ پھولاں کھل جائیں گے بول کو......''

''ہوا امنی......اس نے پھولی پھولی سانسوں کے درمیان کہا، ابی اچ لے لیو......حمام میں بعد میں دوسرے پھیرے میں لا کو ڈالتاؤں......''

تھانولے میں کھڑی سوکھی سر سر کر کے شن شن کی آوازیں نکالتی، سارا پانی لس لس پی گئی۔

''ائی دیکھا ماں کتی پیاسی تھی......'' مغلانی بی شمشو کی بلائیں لے کر بولیں'' بڑا سیدھا ہے ماں تو......ہر ایک کا دل رکھ لیتا......اللہ تیکو اچھا رکھو......''

دوسری کلوڑ لے کر شمشو حمام میں پہنچا تو چھوٹی دولہن نے نہانے کے لئے کپڑے اتار کر کونے میں پھینک دیئے تھے اور آنگن کی جھاڑی کی طرح پیاسی کھڑی ہوئی تھیں......

دوسرا مہینہ لگتے ہی ابکائیوں اور الٹیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ساس تو واری صدقے جانے لگیں، دولت نواب کو پتہ ہی نہیں۔

اتنی بڑی ڈیوڑھی، اتنا سارا عملہ، پھر ماں سے ایسا کام بھی کیا پڑتا تھا کہ بار بار ملاقات کرتے...... بہت دنوں بعد امی حضور نے بیٹے کو دیکھا تو چٹ چٹ بلائیں توڑیں، اللہ میری سن لیا ماں...... مولا بڑا مہربان ہے ماں......''

وہ کچھ بھی نہ سمجھے۔

لیکن اس دن جب وہ چھوٹی دلہن کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ عو...... عو کر کے ابکائیوں لے رہی تھیں۔ ان پر چودہ چھوڑ چودہ کے پورے پہاڑے جتنے طبق روشن ہوگئے۔

یعنی کی...... یعنی کی......'' وہ الفاظ ڈھونڈھنے کی کوشش میں ہکلانے لگے ''یعنی کی آپ کو بچہ ہو رہا شاید......''

صابرہ نے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ موم کے ہوتے تو وہیں قطرہ قطرہ پگھل جاتے۔

مگر ہم تو غالباً آپ کو ابھی تک انگلی بھی نہیں لگائے بول کر......''

''صحیح بولے آپ، آپ کی انگلی بھی نہیں لگائے...... مگر آپ کو یاد ہوئیں گا نا آپ بولے تھے عورت مرد کی کھیتی ہوتی، زمین ہوتی...... میں کب تک پڑ پت زمین ہو رہے کار کھیتی کے ویسا پڑی رہتی...... آپچ بولے نا عورت تو کھیتی ہوتی! بس میں بھی ہل چلوالی...... اس نے طنز میں ڈوبی کٹیلی آواز میں کہا اور پھر معصومیت سے پوچھا، میں غلط کری کیا؟......''

* * *

پیش بندھی

''دولہا میاں کے پانی نہانے کی تیاری کرلیو گے چھوکریاں۔''

مما جانی کی آواز سنتے ہی دولہا میاں نواب ممتاز کے دل میں انار چھوٹنے لگے۔

دولہن والوں کی حویلی سے باندیوں کی ایک پوری فوج کشتیاں سر پر اٹھائے ابھی ابھی سرخ حویلی میں وارد ہوئی تھی۔ ان کشتیوں میں ہزار ہا روپے کا سامان لدا ہوا تھا۔ کھانے پینے کے سامان کی تو قیمت ہی کیا۔ یہی ہزار دو ہزار کا رہا ہوگا۔ لیکن محض ریت رسم نبھانے کی خاطر جو بیش قیمت زیور اور کپڑے دولہا میاں کے لئے آئے تھے ان کی لاگت کوئی جوڑنے بیٹھتا تو لاکھوں سے بھی اوپر تھی۔ یہ کوئی بندھی ٹکی عام ریت تو تھی نہیں۔ بس یہ تھا کہ نواب قدر یار جنگ کے بزرگوں سے چلی آ رہی تھی کہ جس دن دلہن اپنے گھر مایوں بیٹھتی، دولہا کے لئے بھی زرد جوڑا، مٹھائیاں اور زیور بھجوائے جاتے۔ زیور کا تو نام ہی تھا۔ بس ایک موتی کا ست لڑا ہوتا۔ لیکن قیمت میں یہ ایک زیور ہی ہزاروں زیوروں پر بھاری ہوتا۔ جوڑا ایسا ہی ہوتا جیسا نواب لوگوں کے گھروں میں پہنا جاتا۔ ساٹن یا سل سل کرتی شامو کا تنگ پاجامہ، اعلیٰ ریشم کا بند گلے کا کرتا، حیدر آبادی اونچی دیوار کی ٹوپی اور زرتار شیروانی یہ نواب ممتاز کے لئے جو شیروانی آئی تھی، اس میں سینکڑوں روپے کے سچے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ لیکن اس وقت جو نواب ممتاز کے دل میں چراغاں ہو رہا تھا تو اس لئے نہیں کہ ان کے لئے لاکھوں کا پہناوا آیا تھا، یا وہ سونے سے پیلے اور موتیوں سے اجلے ہونے والے تھے، بلکہ ان کے اندر باہر ساری اتھل پتھل تو یوں مچی ہوئی تھی کہ اب ان کے نہلانے کے سامان ہو رہے تھے اور محل کی یہ ریت تھی کہ دولہا مانجھے بیٹھنے کے لئے کبھی اپنے ہاتھوں نہ نہاتا۔ بلکہ دولہن کے گھر سے آئی ہوئی چھوکریاں، سالیاں، رشتے دار کی لڑکیاں اور نیلی پیلی نوکرانیاں یہ مبارک فرض انجام دیتیں۔ بھئی عمر بھر آدمی اپنے ہاتھوں نہاتا ہی ہے۔ یہ کوئی اس تپتائے ہوئے جسم

سے پوچھے جسے بیک وقت کئی کئی کنوارے ہاتھوں کی ٹھنڈک نصیب ہونے والی ہو۔

اوراصل میں تو یہ بات بھی نہیں تھی کہ نواب ممتاز محض چھوکریوں کے ہاتھوں نہانے کے نشے کی لذت کومرے جارہے ہوں، وہ تو قصہ ہی دوسرا تھا۔

انہیں معلوم تھا کہ آج چھوکریوں کی اس فوج میں وہ ''پیش بندھی'' بھی آئی ہوئی تھی جوان کی دولہن کا کام کرنے، اس کی پیشی میں سدابندھی رہنے کے لئے جہیز میں دی جانے والی ہے۔افوہ یہ بھی کیامزہ دارسلسلہ تھا۔دولہامیاں کےتو وارے نیارے ہوجاتے۔اس رواج کا سرا کہاں جاکے ملتا تھاپتہ نہیں، لیکن حیدرآباد کے اس مشہورنوابی گھرانے میں ایک بارایسا ہوا کہ بٹیا نے جنم لیا تو ایسی صورت تھی مانو بندریا۔بچپن تو جوں توں کرکے کٹ گیا، اصل مصیبت جوانی آنے کے بعد آئی۔پڑھ لکھ بھی گئی تھیں تو کیا ہو، ایسی صورت کون گلے لگاتا ؟ لڑکی دیکھنے والے آئے تو مصیبت کی ماری ماں نے بیٹی کی جگہ ایک چاند کا ٹکڑا بٹھادیا۔دولہا والے دیکھتے ہی لٹو ہوگئے......آفت یہ تھی کہ شادی کہ دن جو آرسی مصحف اور جلوہ نمائی ہوتی ہے، اس سے کیسے نمٹا جاتا......؟ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ٹھیک اسی لمحے جب آئینے میں صورت دکھائی جانے والی تھی، دولہن کو سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق سخت زوردار چکر لادیا گیا۔مونہہ لپیٹے سرخ گھونگھٹ میں دولہن وہیں ڈھیر ہوگئی۔سب ریتوں، رسموں سے فارغ ہونے کے بعد جب دولہن کواس کمرے میں پہنچایا گیا اور پیچھے پیچھے دولہامیاں بھی شب بسری کے لئے شرماتے جھینپتے وارد ہوئے تو داخل ہوتے ہوئے انہیں ایسا لگا کہ اصل چاند تو دروازے کی اوٹ سے طلوع ہورہا ہے.....گوشت کی بو پاکر شیر لپکتا ہی ہے، یہ کون سی نئی بات ہے؟ دولہامیاں ذرا ٹھٹھکے جھجکے اور رک گئے.....مگر وہ نہ ٹھٹھکی نہ جھجکی، مزے میں کھڑی مسکرا مسکرا کر انہیں پرچاتی رہی کہ اس مسکراہٹ کے صلے میں اس کے ماں باپ کا منہ پہلے ہی چاندی سے بھردیا گیا تھا۔لوگ میٹھے کی لالچ میں جھوٹا کھاتے ہیں۔دولہامیاں نے پہلے میٹھے سے کی، بعد کو جھوٹا کھانا پڑے تو جوتی سے اس وقت تو ترمال سامنے تھا !

بعد میں سسرال والوں نے بڑی لے دے مچائی کہ کون سی لڑکی بتائی، کون سی بیاہ دی ؟ لیکن دولہامیاں ایسے شریف تھے کہ کبھی بےچاروں نے گلہ نہ کیا۔کہہ دیا......''میری خسمت میں جو تھا میرے کومل گیا۔اب میرے کوکسی سے خطعی کوئی گلہ نہیں......''اور پھر پورے حیدرآباد میں یہ ریت پڑگئی کہ جہیز میں دولہن کے کام کاج کی خاطر کوئی طرحدارسی لونڈیا ساتھ کردی جائے۔جو ہردم

دولہن کی پیشی میں بندھی رہے۔دولہن کے کام کا تو بس نام ہوتا، ''اصل کام' دولہا کا ہوتا۔

حویلی میں جب بھی کسی شادی کی تام جھام مچتی، سارے لڑکوں میں رسہ کشی ہوتی رہتی کہ دیکھیں اس کے نصیب میں اب کون سی پری جمال لکھی ہوئی ہے۔ایسا بھی بارہا ہوتا کہ شریف لڑکے نظر اٹھا کر پیش بندھی کو دیکھتے تک نہ تھے۔انہیں جو کچھ بھی مطلب ہوتا اپنی بیاہی دولہن سے ہی ہوتا۔لیکن ایسے پارسا تھے کتنے؟ اور جو ایسے پارسا ہوتے بھی تو انہیں دوستوں کے طعنے سننے پڑتے۔''یارتم میں کچھ کمی معلوم پڑتی ہے۔نئیں تو یہ کیا بات ہے کہ شرینی تمہارے ہونٹوں کے اتنے خریب، ہورتم ہونٹاں چاٹتے تک نہیں ؟''

مردسب کچھ سہہ سکتا ہے، مردانگی پرطعن نہیں سہہ سکتا۔

اورنواب ممتاز بھی انہیں سے تھے جو ٹھنڈے پانی کی تلیا میں ڈبکی لگادینے کو سعادت سمجھتے ہیں۔

ایک دم رشتے کی بہنوں، سالیوں کا پرے کا پرا دوڑتا آیا اور ان کا ہاتھ زو. سے پکڑلیا گیا۔

''اللہ ممتاز بھائی چلونا۔آپ کو پانی نہلا کر مما جانی سے نیگ منگیں گے۔'

گھسٹتے ہوئے وہ لڑکیوں کے ہجوم میں کھنچے چلے گئے۔''مایوں نہلائی'' کی رسم بندحماموں میں نہیں، ڈنکے کی چوٹ کھلے آنگن میں آسمان تلے ہوتی ہے، جہاں چار سہاگن بیبیاں زرکار شامیانے کی ڈوریاں پکڑ کر چاروں طرف کھڑی ہوجاتی ہیں۔پانچویں سہاگن پہلے دودھ سے سر دھلاتی ہے اور پھر ساری لڑکیاں دولہا پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

''غم یہ ہے کہ نامراد شادی زندگی میں ایک بار ہوتی ہے۔''

نواب ممتاز نے دل میں سوچا اور لڑکیوں بالیوں کے سرسراتی انگلیوں کی بےپناہ گدگدی سے جسم چرانے لگے۔

''اگے اے گل چمن گدگدی کیوں کررئی گے ؟ دکھتا نہیں کہ دولہامیاں کو برابر سے بیٹھنا بھی نہیں آرہا ؟''ایک شریری لڑکی نے چبھتے ہوئے لہجے میں مسکرا کر اس لڑکی سے کہا جو نواب ممتاز کی پیٹھ پر کلیاں بکھیر رہی تھی۔

وہ چھن سے ہنس پڑی۔

نواب ممتاز نے ذرا سا پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ انہیں ایسا لگا کہ وہ جادو کے اثر سے پتھر ہوگئے ہیں۔انہوں نے محسوس کیا کہ اب پیٹھ سے ہوتے ہوئے وہ موسیقی بھری انگلیاں ان کے شانوں

سے ہوتی ہوئی پنجوں کی طرف آرہی ہیں۔ ابٹن اور مہکتے مسالے کی جی لوٹ پوٹ کر دینے والی خوشبو میں ڈوبتے ڈوبتے ابھر کر انہوں نے دیکھا...... لمبی لمبی کافوری انگلیاں جن کے سروں پر ناخونوں کی بجائے یاقوت ٹنکے ہوئے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کے حواس پر گر رہی ہیں۔

گل چمن......؟ انہیں یاد آیا، یہی نام تھا، یہی پکار تھی جو اتنے دن سے ان کے کانوں میں پڑ رہی تھی کہ دولہن کے ساتھ گل چمن ''پیش بندھی'' آرہی ہے۔ اب پیٹھ سے فارغ ہو کر وہ سامنے آگئی تھی...... پیر دھلانے وہ سامنے آئی تو نواب ممتاز اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

کم بخت کم تھی یا وہم ؟

انہوں نے دل ہی دل میں شہادت کی انگلی سے انگوٹھا ملا کر گول چھلا سا بنایا اور پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ ''اوہنوں ! یہ چھلا بڑا پڑے گا۔ کمر تو اس سے بھی پتلی ہے نامراد کی۔''

وہ بڑے انہماک سے رگڑ رگڑ کر پیر دھلائے جا رہی تھی۔ گھنے بالوں کے گچھے پیشانی پر جھول رہے تھے۔ گیہوں رنگ تپ کر سرخی مائل ہو رہا تھا۔ کرتا خدا کا شکر ہے بند گلے کا تھا، مگر پھر بھی صاف ظاہر تھا کہ اندر جو بھی تھا اپنے آپے میں نہیں تھا، ابھر آنے پر کمر بستہ تھا اور یہ ساری دھاندنی پیٹ کی پستیوں کی تھی۔ نہ پیٹ ایسا چپاتی ہوتا نہ ابھار یوں نمایاں ہوتے۔

اس دم پیچھے سے کوئی پکارا ''ایو یہ گل چمن کدھر مر گئی...... اس کا چھوکرا رو رہا ہے۔''

چھوکرا......؟ نواب ممتاز نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر وہ خوش ہو گئے، بہت سے لوگ کچے پھل کے شوقین ہوتے ہیں...... نامرادوں کو پتہ ہی نہیں کہ پکا ہوا پھل کیا چیز ہوتی ہے، ارے کچے پھل میں وہ بات کہاں جو پکے ہوئے رس دار پھل میں ہوتی ہے۔ ذرا ہاتھ لگاؤ اور ٹپ سے جھولی میں۔

پانچویں دن شادی تھی۔

مایوں سے لے کر شادی تک کے پانچ دن ممتاز نواب نے کیسے گزارے، اس کا پتہ صرف ان کے اپنے دل کو تھا۔ ان کی تو دولہن بھی بڑی خوبصورت اور نازک، کانچ کی گڑیا سی تھیں۔ لیکن وہ کمر جو جانے تھی بھی یا نہیں، ان کے وجود کو تہہ بالا کر گئی تھی۔ وہ ہنسی جو چھن کر کے ان کے حواس پر گری تھی، وہ رنگ وہی رنگ جو جنت سے آدم کے اخراج کا باعث بنا تھا، وہی دانہ گندم کا رنگ جو تپ تپ کر سونا ہو گیا تھا انہیں رہ رہ کر للکار رہا تھا ''کھا کر دیکھوں...... کیسا نشہ آتا ہے !''

کیسی عجیب بات تھی، ایسا بھنورا جو زندگی بھر کلی کلی کا رس چوستا رہا ایک ایسی کلی کے پیچھے دیوانہ

ہو رہا تھا جو ''مونہہ بند'' تھی بھی نہیں۔

شادی کی ریت رسمیں ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں، اور ادھر نواب ممتاز ضبط کی حدوں سے گزرے جا رہے تھے۔ جی تو کہتا تھا یہ سہرا وہرا اٹھا کر پھینکو اور ایک ہی جھماکے میں گود پیش بندھی کو بھر کر کسی کونے کھدرے میں جا دبکو، لیکن ڈیوڑھی کی ریتیں رسمیں، اللہ اللہ !

ساری فضول رسموں سے فراغت ہو گئی تو دولہا نواب نے اپنی بھاوج کو بلا کر راز داری سے کہا...... ''بھابھی جان میں آپ کو جتائے دے رہا ہوں کہ اگر کسی نے بھی میرے کمرے میں جھانکا تو میں صبح اس کا کھوپڑا پھوڑ دیوں گا۔''

نئے دولہا دولہن کے کمرے میں تانکنے جھانکنے کا سلسلہ بے حد عام تھا...... بے چارے بھولے اور شریف قسم کے لڑکے تو یہ بات جانتے بھی نہ تھے۔ اس لئے برے پھنستے۔ صبح کو ان کی وہ ہنسی اڑائی جاتی کہ پھر دلہن کے کمرے کی طرف قدم اٹھانے کی بھی ہمت نہ ہوتی...... جو جہاں دیدہ ہوتے وہ دروازوں کی جھریوں پر کاغذ چپکا کر نچنت ہو جاتے۔ بات بھی کرتے تو سرگوشیوں میں، اور جو اناڑی ہوتے تو ان کے بوسوں کی پٹاپٹ بھی چار کمرے دور تک سنائی دیتی اور اس کا بھگتان بھی وہ دوسرے دن بھگت لیتے۔

ممتاز نواب چاروں کھونٹ چوکس تھے، وہ ہر طرح اپنا انتظام پورا کر چکے تھے۔ آخر دو معرکوں سے گزرنا تھا غافل کیسے رہتے ؟

بھابھی جان ہنسیں اور شوخی سے بولیں...... ''میں تو کسی کو آنے نہ دیوں گی...... مگر تنہائی کا اتنا بھی ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ...... کہ صبح کو بے چاری دولہن کو اٹھنا بھی نہ آئے......''

دولہن کو......؟ نواب ممتاز دل ہی دل میں ہنس دیئے۔

دولہن کی سیج مما جانی والے کمرے سے ہٹ کر بڑا کمرہ جو تھا، اس میں سجائی گئی تھی۔ دولہن کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ایک اور کمرہ نما راہ داری تھی اس راہ داری میں پیش بندھی کو رہنا تھا کہ دولہن کو کام وام پڑے تو زیادہ دوری نہ رہے۔ لیکن اتنا زیادہ نزدیک بھی نہیں کہ دولہا دولہن کی بات چیت بھی پیش بندھی سن لے۔ ایک دروازہ دولہن کے کمرے میں تو تھا ہی، ایک راہ داری کا کمرہ نما جو تھا اس میں بھی تھا اور یہی دراصل نواب ممتاز کے ارمانوں کی سیج تھی۔

ساری لڑکیوں، بالیوں، میراثنوں اور ہلڑ بازیوں کو پیچھے چھوڑ کر نواب ممتاز راہ داری میں داخل ہوئے اور دروازہ بند کر لیا۔

سامنے ایک پلنگڑی پر وہی گل چمن مسکراتی ہوئی بیٹھی تھی...... جو سارے گلوں اور چمنوں کا نچوڑ تھی۔ دو مسکراتے ہوئے ہونٹ...... جیسے رس بھرے سنہرے آم کی اوپر تلے دو قاشیں رکھی ہوں اور کہتی ہوں۔ ''لیو اور چوس ڈالو'' ہونٹوں کا صحیح مصرف تو آج ہی نواب کی سمجھ میں آیا۔ وہ جو پانچ دن سے ترس رہے تھے اور یہ سوچے ہوئے تھے کہ ایک دم ٹوٹ ہی پڑیں گے۔ قدرت کی اس اصناعی کو حیران حیران کھڑے دیکھتے رہے۔ چونکے تو اس وقت جب ان کے کانوں نے یہ سنا...... ''کپڑے اتار دیوں ؟''

نواب ممتاز بوکھلا گئے...... ''کپڑے اتار دیوں'' وہ جو زندگی بھر ہزاروں لڑکیوں کے کپڑے تار تار کرتے آئے تھے اس بظاہر آسان سے سوال سے سٹ پٹا گئے...... وہ سوال جوان کی ملکیت کر رہی تھی۔

''کیوں ؟'' ایک عجیب احمقانہ سوال ان کی زبان سے نکلا۔

وہ ہنسی...... اس قدر بے باکی سے ہنسی کے ان کے اندر کا مرد بیدار ہو گیا۔

''کپڑے کا ٹیکوا تارا کرتے تھے نواب صاحب...... آپ نا اتا بھی نہیں معلوم......؟''

انہوں نے پاگلوں کی طرح دولہن کے دروازے کی کنڈی باہر سے چڑھائی اور پیش بندھی پر ٹوٹ پڑے۔

جب ہونٹ چاٹتے ہوئے وہ اس عارضی سے سیج سے اٹھے تو خوش ہو کر انہوں نے بٹوہ کھولا اور کھن کھن کرتے بیس روپے اس کی لرزتی ہوئی ننگی تھیلی پر رکھ دیئے......

وہ ابھی تک اس جوڑے میں ملبوس تھی جو عورت نے دنیا مین پہلا قدم رکھتے ہوئے پہنا تھا...... لیکن روپے پانے کی خوشی میں اپنی برہنگی سے بے خبر ہو کر وہ کھٹ سے اٹھ بیٹھی...... ایک، دو تین چار، پانچ کر کے اس نے اسی دم سارے روپے گن ڈالے اور نواب جو اتنی دیر میں ذرا آگے جا چکے تھے، جا کر انہیں جھنجھوڑتی ہوئی بولی......

''یہ روپے...... یہ بیس روپے آپ میرے کو دیئے ؟......''

نواب دھیرے دھیرے سے پھر پلٹ آئے، مسکرا کر کہا...... ''ہاں''......

وہ اس دیوانگی بھری خوشی سے بولی ''صرف ایک بار کے واسطے ؟''

نواب نے ہاں میں سر ہلایا تو لجاجت سے ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی...... ''تو ایک بار ہور...... بس ایک بار ہور۔'' وہ گڑگڑائی۔

نواب ممتاز نے غور سے اسے دیکھا، وہ پتہ نہیں کیا سمجھی۔ پھر گڑگڑا کر بولی۔

''بچے کو تو میں افیون کھلا کر سلا دی ہوں...... وہ ہرگز نہیں اٹھنے والا...... آپ کو قسم ہے۔ بیس روپے بہت ہوتے، نواب صاحب! یہ تو میرے سال بھر کا خرچہ ہے'' میرا مرد کتا خوش نین ہوئیں گا۔''

''تیرا مرد ؟'' نواب ممتاز ٹھٹھک گئے۔

ہو نواب صاحب وہ دولہن بھی کی حویلی میں دربان ہے مگر کتی کم تنخواہ ہے کہ ہمارے بچے کو دودھ ملتا نا ہم کو چاول...... یہ بیس روپے تو نواب صاحب سال بھر سے زیادہ چلیں گے......''

نواب صاحب نے ابھی ابھی جو نشہ پیا تھا، سر سر کر کے سارے کا سارا اتر گیا۔ انہیں اپنے حلق میں کھاری پن کا احساس ہوا...... کیا آنسوؤں سے ان کا حلق تر ہو رہا تھا......؟ انہوں نے رکتے ڈوبتے لہجے میں پیش بندھی سے پوچھا......

''تیرے میاں کو معلوم ہے کہ آج رات تو کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟''

''معلوم......؟'' اجی نواب صاحب اس نے تو خوشی خوشی یہ بول کر میرے کو بھیجا تھا...... نواب صاحب کو ضرور خوش کرنا...... وہ پانچ روپے سے کم نہیں دیں گے۔ مگر آپ تو......'' اور مارے خوشی اور احسان مندی کے اس کی آواز گھٹ سی گئی۔

نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ صدیوں کی خاموشی جیسے ان کے وجود پر چھا گئی...... وہ کہے جا رہی تھی...... ''آپ کو نہیں معلوم نواب صاحب پیش بندی کتی خوش قسمتی کی بات ہے۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ دولہا میاں آپ کا سا دل والا بھی ہو......''

''تو پڑھی لکھی بھی ہے ؟ نواب صاحب پاتال میں سے بولے۔''

''پڑھی لکھی ؟'' وہ ذرا طنز سے ہنسی...... ''ہاں اتی پڑھی لکھی تو ہوں جو یہ جان پاؤں کو چاند چمکتا بھی ہے تو ہم غریبوں کے گھروں میں اندھیرا ہی رہتا ہے ہور یہ کی روپیہ......'' اس نے ایک کھن کھنا تا روپیہ نکال کر نواب ممتاز کو دکھایا۔ ''یہ روپیہ جو ہے اس میں چاند اور سورج سے بھی زیادہ چمک ہوتی ہے......''

نواب ممتاز پتھر بنے سن رہے تھے۔ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''پیش بندھی بننا کتا برا ہے نواب صاحب......'' آپ یہ سوچو کی میں اتی شرمیلی لڑکی ہوں کہ اپنے میاں کو چراغ بجھائے سوا اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتی، مگر پیسہ...... یہ پیسہ......'' اس نے

بیسیوں کے بیس روپے کھن کھن کر کے فرش پر پٹخ دیئے...... ''اس پیسے کے مارے میں اپنے سارے کپڑے آپ اتار دی کہ آپ کو پرچالیوں، نئیں تو آپ یوں ہی چلے جاتے اور...... یہ تو میری آمدنی کی رات تھی۔

پیسے کے واسطے بے شرم بنناچ پڑتا ہے نواب صاحب''......

نواب ممتاز نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے گلے سے موتیوں کا ست لڑا اتارا اور اس کے پیروں میں ڈھیر کرتے ہوئے بولے...... ''تو اسی وخت اپنے میاں کے پاس چلی جا......'' الفاظ آنسوؤں کے بوجھ سے ان کے گلے میں ٹوٹ رہے تھے۔ ''شاید یہ تیری زندگی بھر کو کافی ہوجائیں۔ بہت قیمتی ہار ہے۔''

اس نے ہار اٹھا کر نواب صاحب کے گلے میں ڈال دیا اور ٹوٹے ٹوٹے لفظوں سے بولنے لگی۔ ''یہ ہار تو میرے کو اکیلی کو زندگی بھر کو کافی ہوجائیں گا...... مگر حیدرآباد میں کتی ساری غریب چھوکریاں ہیں نواب صاحب، جن کو کبھی نہ کبھی پیٹ کے واسطے پیش بندھی بن کو، پیسہ کمانے کو دولہوں کو پرچانا ہور سیج سجانا پڑیں گا...... نواب صاحب آپ بڑے آدمی ہیں، آپ میرے کو آج یہ وعدہ دیو کی حیدرآباد سے اس لعنت کو آپ ختم کر کے اچ دم لیں گے۔ دولہن کے واسطے کام کاج کے واسطے جائیں گی بھی تو کوئی بڈھی عورت...... میرے ایسی جوان لڑکی نئیں، جس کے دل میں پیار تو اس کے میاں کے واسطے ہو...... ہور جسم دولہوں کے سج پو......''

میں اکیلا...... حیدرآباد اتا بڑا...... میں کیسے اس خبیث ریت کو توڑ سکوں گا گل چمن ؟''

نواب ممتاز کے لہجے میں گہرے دکھ اور کرب کی چھاپ تھی۔

وہ بڑے اعتماد میں بولی۔ ''آپ کو اتا بھی نہیں معلوم نواب صاحب کی گھور اندھیرے میں روشنی پھیلانے کو ایک چراغ اچ بھوت ہوتا......''

نواب ممتاز نے غور سے اس حوصلہ مند لڑکی کو دیکھا جو انہیں اندھیروں سے روشنیوں کی طرف بلا رہی تھی۔ ان کی سوچتی ہوئی آنسو بھری آنکھوں نے ایک فیصلہ کر لیا اور انہوں نے اپنے سر سے زرتار اتار کر اس کے برہنہ جسم پر ڈال دیا۔

* * *

دھنک کے رنگ نہیں

رفیق میاں کندھے پر اچکن لٹکائے باہر نکلے تو پیچھے سے حوری لپکی ہوئی آئی اور پردے کو اپنے جسم کے آس پاس لپیٹ کر سر نکال کر بولی :

''اجی ماموں جان پاندان میں ڈلی نہیں ہے۔''

رفیق میاں پلٹے...... ''نہیں ہے تو نہ رہے، کون پان کھانے کا اتنا شوقین ہے؟''

وہ پھر سے بولے...... ''امی جان کہتی ہیں، واپسی میں ضرور لائیے گا''......اور وہ پاؤں نچانے لگی۔

''یہ تو بھئی خواہ مخواہ کے خرچے ہیں، بی بنو۔ بھلا......''

ابھی ان کی بات منہ ہی میں تھی کہ ان کی نگاہیں حوری کے تھرکتے پیروں سے جا ٹکرائیں...... ''ارے......؟'' اچانک ان کے منہ سے نکلا۔ ان کی نگاہیں حوری کے پیروں سے چپک کر رہ گئیں۔

''ارے یہ گلابی گرگابیاں؟......'' حوری نے اترا اترا کر پیر نچانے شروع کر دیئے۔

مخمل کی نازک نازک گلابی کامدار گرگابیاں جیسے دو مہکے مہکے گلاب حوری کے پیروں میں کھل اٹھے تھے۔ ان کا دل دھڑ دھڑ دھڑ کا...... اور پھر وہ دل مزے سے حلق میں آ کر جھولنے لگا...... اماں تو بوڑھی ٹھہریں، وہ بھلا ایسی گرگابیاں پہننے لگیں؟...... آپا بھی بے چاری بیوہ، سفید ساڑھی کے سوا کبھی انہوں نے دوسرے رنگ کی ساڑھی تک نہیں پہنی تو ایسی چمکتی دمکتی گرگابیاں کہاں پہنے چلیں؟...... وہ زہرہ دلہن، انہیں تو میں جانتا ہوں۔ ان کے اس بھی ایسی گرگابیاں نہیں...... پھر...... پھر...... انو میاں؟...... انو میاں ٹھہرے مرد۔ وہ آخر ایسی رنگین اور بھڑکیلی گرگابیاں کیسے پہن سکتے ہیں...... اور بچے تو بچے ہی ٹھہرے...... پھر؟...... ہو سکتا ہے آپا بی کے جہیز کی رکھی رکھائی

ہوں اور حوری نے مارے اتراہٹ کے پہن لی ہو۔ مگر آپا بی کا سارا جہیز تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔ اور جو کبھی جہیز کی باتیں ہوتیں تو بھی اتنے دنوں تک ان کی چمک دمک ماند نہ پڑ جاتی؟ …… ہو سکتا ہے کہ حوری نے ہی خریدی ہوں۔ اچھا گر حوری نے خریدی ہیں تو یہ اس کے پیروں سے اتنی بڑی کیوں ہیں کہ ایڑیاں تو اندر رہ گئی ہیں اور جوتی پیچھے سے باہر نکل گئی ہے۔ انہوں نے حیرت سے پھر حوری کے پیروں کو دیکھا۔ گوگابیاں تو اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتیں۔ ان کے زبان نہیں ہوتی …… پھر یہ کیسی گرگابیاں تھیں بھئی جو باقاعدہ پٹ پٹ باتیں کر رہی تھیں …… چہک رہی تھی …… اور رفیق میاں کو باقاعدہ مجبور کر رہی تھیں کہ وہ بھی چہکیں اور ان کے ساتھ باتیں کریں۔ بھلا آدم کے سنسان، ویران جنت کے باغ میں یہ کونسی حوا آ گئی ہے، کہ سارے گلاب مہکنے لگے ہیں۔ وہ جھلا کر بولے ……“

”ارے یہ کس کی گرگابیاں چڑھا رکھی ہیں؟ خراب ہو جائیں گی تو؟ ……“

حوری نے پردے میں پاؤں چھپانے کی کوشش کی پھر چلبلا کر بولی :۔

”ارے واہ خراب کاہے سے ہونے لگیں۔“

”اور جو تو مسلسل ناچے جا رہی ہے تو ایسی نازک گرگابیاں پھٹیں گی تھوڑی ہی ……“

حوری کس قدر منہ پھٹ تھی …… ”شکو باجی کا درد آپ کو کیوں ہو رہا ہے …… بھئی واہ …… جس کی چپلی وہ تو کچھ نہ کہے، تیسرا ہی دل اٹکاتا پھرے“ ……

”شکو باجی؟ …… وہ گڑ بڑائے …… یہ شکو باجی کون؟ ذرا حیرت، ذرا نرمی، ذرا گھبراہٹ …… ”یہ شکو باجی کون بھئی؟ ……“ بالآخر وہ کھل کر پوچھ بیٹھے ……

”وہی جو اندر بیٹھی ہیں، وہ دھانی رنگ کی ساڑھی باندھے ……“ وہ ایک دم پردہ چھوڑ کر باہر لپک آئی …… ”قسم خدا کی ماموں جان، ان کا سارا بکس لال، نیلے، پیلے کپڑوں سے بھرا پڑا ہے …… اتنے پیارے پیارے رنگ کے پوچھتے مت …… اور ایک چھوٹا بکسا ہے جس میں ڈھیروں چوڑیاں، ایک اور بکسا ہے جس میں ان گنت چپلیاں، ڈھیروں جوتیاں رنگ برنگی کہ نظر نہ ٹھہرے …… ایک اور بکس ہے جس میں“ ……

”اونہوں ہوں …… کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ تجھ سے اتنی ساری تفصیل کس نے پوچھی تھی اور یوں اچک اچک کر باتیں نہ بنا، کہیں آڑھا ترچھا پاؤں پڑ گیا تو گرگابی بے چاری ٹوٹ جائے گی، اتنی نازک جو ہے۔“

”تو کیا غضب ہو جائے گا خداوند۔ ڈھیروں تو جوتیاں ہیں، کچھ قحط تو نہ پڑ جائے گا۔“

”مگر دوسرے کی چیز لینا کچھ اچھا لگتا ہے؟“ …… وہ اسے ذرا سی غیرت دلانے پر تلے ہوئے تھے۔

”یہ دوسرا کیا ہوتا ہے میاں جی۔ میری پھوپھی ہی تو ہے اور بھلا پھوپھی کہیں غیر ہوتی ہے جی ماموں جان؟“

رفیق میاں نے حیرت سے دیدے کھول کر پوچھا۔ ”تیری پھوپھی …… تیری پھوپھی یعنی کہ اپنی آپا بی کی نند۔“

”ظاہر ہے۔“ وہ انتہائی لاپرواہی سے بولی۔

”مگر میں نے تو آج تک نہیں دیکھا۔“

حوری تنک کر بولی …… ”تو اس کا مطلب یہ کہاں نکلتا ہے کہ آپ نے نہیں دیکھا تو وہ میری پھوپھی نہیں ہوئیں۔“

”تو بڑی چرباںک ہے لڑکی۔ یہ نہیں سوچتی کہ میں تیرا بڑا ماموں ہوں اور تو ایسی زبان چلاتی ہے۔“

”واہ بھئی واہ …… میں نے ایسی کونسی بری بات کہی …… اپنا دل صاف نہیں …… اسی لئے جناب نے لتاڑ بتائی …… اور میں نے ذرا زبان ہلائی تو مجھ پر الزام۔“

رفیق میاں کو پہلی بات یاد آ گئی …… ”تو آپ اسی لئے ڈلی منگوانے پر اصرار کر رہی تھیں کہ گھر میں مہمان آ گئے ہیں۔“

”ظاہر ہے۔“ وہی لہجہ بیزاری بھرا۔

”حوری …… اے حوری …… اری حور“ …… اندر سے آپا بی کی آواز آئی اور حوری پردے کو جھلاتی سپڑ سپڑ اندر کو بھاگ گئی۔ نرم نرم گلابی گلابی گرگابیاں اس کے پروں تلے کس بری طرح رگڑے کھا رہی تھیں ……

رفیق میاں جھلا گئے …… ”اری کم بخت“ ……

کوئی آدھ پون گھنٹے بعد رفیق میاں باہر سے واپس آئے تو اپنے کمرے میں پہنچ گئے مگر ہمیشہ کی طرح انہوں نے پلنگ پر پڑ کر تھکی ہاری سانس نہیں لی، بلکہ اچکن کو ٹانک کر وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگے …… پیروں کی چاپ سن کر حوری پھر جان کھانے کو آ موجود ہوئی

تھی...... آتے ہی تنک کر بولی......

''ڈلی آئی یا نہیں؟......''

رفیق میاں نے خوشی خوشی اس کا ہاتھ پکڑ لیا...... ''آج بہت اترا رہی ہے ری، اور جو دو چانٹے جڑ ہی دوں تو!''

خوری شرارت اور گستاخی سے بولی...... ''اور میرے پیر تو غالبًا جناب نے دیکھے ہی نہیں؟......''

''اچھا......!'' وہ بناوٹی غصے سے بولی...... ''تو مطلب یہ ہے کہ آپ ان چپلوں سے ہماری خبر لیں گی نا؟......''

حوری کھی کھی کر کے ہنسنے لگی......

''اچھا لائیے...... چھالیہ تو دے دیجئے......'' وہ ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو گئی......

''تو چل میں خود ہی لے آتا ہوں''...... اور وہ پلنگ کے نیچے جوتے ٹٹولنے لگے......

آگے آگے حوری تھی اور گلابی مخملیں گرگابیوں کی ہلکی ہلکی دپ، دپ اور پیچھے پیچھے رفیق میاں تھے اور تازہ تازہ گلابوں کی مہک۔ حوری پردہ اٹھا کر اندر کہیں غائب ہو گئی تھی۔ سامنے باورچی خانے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اماں ہانڈی بھون رہی تھیں۔ رفیق میاں آگے بڑھ گئے...... پرلے دالان میں انو میاں کی بیوی بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھیں۔ وہ مایوسی سے اور آگے بڑھ گئے۔ سامنے والے کمرے میں حوری کی اسلم سے چھین جھپٹ جاری ہو چکی تھی۔ شاید گڑیا کی چوٹی کھینچے جانے کا سا کوئی سنگین معاملہ پیش تھا۔

انہوں نے زور سے چھالیہ کی پڑیا تخت پر پٹخ دی اور اماں سے بولے...... ''یہ چھالیہ کی پڑیا یاں رکھ رہا ہوں۔ پاندان جانے کدھر پڑا ہے ورنہ میں خود ہی کلیا میں ڈال دیتا''......

کونے والے کمرے میں جہاں سبز پردہ جھول رہا تھا ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور ایک دم رفیق میاں چکرا کر رہ گئے۔

دھنک کے رنگ......

قوس قزح کی رنگینیاں......

دھیرے سے پاندان تخت پر رکھ کر وہ بولی :۔

''امی پان کھا رہی تھیں، معاف کیجئے آپ کو تکلیف ہوئی۔''

نہ پھول مہکے،...... نہ کلیاں چٹکیں،...... نہ ہوائیں چلیں،...... نہ بادل جھومے...... بس آپ ہی آپ بہار سی آ گئی۔ جیسے سارے میں دھنک کے رنگ ہی رنگ بکھر گئے...... رنگ جو بہاروں اور خوشیوں سے عبارت تھے......

ہر آنچل پاندان کے کونے سے اٹک گیا تو وہ ذرا کی ذرا رکی...... مڑی اور ایک ہلکی سی...... ''اونہہ'' کے ساتھ آنچل چھڑا کر اندر چلی گئی۔ اور تو کچھ نہیں لیکن اس کی مخمل والی گلابی ایڑیاں وہیں رہ گئیں، جو اتنی تازہ اتنی نازک تھیں کہ جیسے گلاب کی کچی کلیاں...... قسم خدا کی یہ پاؤں نہیں گلاب ہیں...... رفیق میاں نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لئے...... کہیں دل کی بات زبان نہ کہنے لگے اور جو زبان کہہ دے تو کان نہ سن لیں...... تو یہ بات کھل جائے گی کہ دیکھو بھائی یہ رفیق میاں تو محبت کرنے لگے ہیں۔

اب جب کبھی اندر سے پانوں کی گلوریاں باہر بھجوائی جائیں تو رفیق میاں کو ان پانوں سے صفا گلابوں کی خوشبو آتی اور وہ حوری سے پوچھتے :

''ہاں حوری یہ پان کس نے بنائے ہیں ؟''

''شکو باجی نے''......

''کس نے؟......'' وہ جان کر دوبارہ پوچھتے۔

حوری چڑ جاتی...... ''شکو باجی نے...... شکو باجی نے...... اب سن لیا یا نہیں''......

''اری یہ تمہاری شکو باجی بڑھیا کی طرح دن رات پان ہی پان چباتی رہتی ہیں کیا؟''

وہ شرارت سے پوچھتے۔

''ہش''...... وہ ناک سکیڑ کر کہتی...... ''انہیں پان کھانے کی کیا غرض پڑی ہے، ان کے ہونٹ خود ایسے سرخ ہیں کہ بس...... لیکن آپ کو شکو باجی سے کیا لینا ہے جی...... وہ بھلے سے پان کھائیں، چھالیہ کھائیں...... آپ سے مطلب؟......''

رفیق میاں جھٹ سے بات کا رخ پھیر دیتے جو حوری کی سی طرار لڑکی بات چھوڑ دے تو سارے میں اودھم مچ جائے گی اور یہ گلوریاں تو دن بھر میں کم از کم چار پانچ مرتبہ چلی آتی تھیں کم بخت۔ ورنہ اماں جی کے ہاتھوں نہ کبھی پان ہی ملا...... نہ پان کی طلب کبھی محسوس ہوئی، اب تو جب دیکھو تب رفیق میاں کی چونچ لال ہے اور وقت بے وقت حوری سے فرمائش کئے جاتے ہیں......

’’اری حوری! ذرا پان تو بنوالائیو۔‘‘

’’ابھی ابھی تو پان کھایا تھا ماموں جان آپ نے، ہوا کیا ہے آپ کو؟‘‘

وہ چونک جاتے۔ واقعی مجھے کیا ہو گیا ہے؟ یا ہو رہا ہے؟‘‘

کوئی ہفتہ بھر بعد کی بات ہے، رفیق میاں مردانے میں بیٹھے کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہے تھے کہ پردو اٹھا کر اماں اندر آگئیں۔

’’کیا بات ہے اماں؟‘‘ انہوں نے اپنا ہاتھ روک کر ماں سے پوچھا۔

اماں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دیوار کے کنارے لگ کر بیٹھ گئیں......

’’تیری آپا بی کی نند اور ساس آئی ہیں، ......انہوں نے اپنے طور پر گویا بہت بڑی اور نئی خبر سنائی۔

انہیں تو آئے بھی غالباً چار چھ دن ہو گئے ہیں نا۔‘‘ وہ لاپروائی سے بولے......

اماں چپ رہیں......

بیٹے نے ماں کو چور نگاہوں سے دیکھا اور گلا صاف کر کے بولے:

’’آپ کچھ خاموش خاموش نظر آ رہی ہیں اماں کیا بات ہیں؟‘‘

’’نہیں تو‘‘ ......اماں نے خواہ مخواہ کی ہنسی چہرے پر لانی چاہی...... تجھے وہم ہو رہا ہے۔‘‘

’’آپ کو قسم ہے اماں جو آپ نے مجھ سے کوئی بات چھپائی ......ورنہ میں سمجھ لوں گا کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔

اے واہ میاں کیسی بات کرتا ہے۔ بھلا تجھ سے محبت نہ ہو گی، تو پھر کس سے ہو گی۔ اللہ کے بعد تو ہی تو میرا پہلا اور آخری سہارا ہے۔

اماں جی کا کلیجہ اٹھا۔ آنکھیں بھیگ گئیں

اور یوں بھرپور جوانی میں تجھ پر بڑھاپا آیا تو کس کے کارن؟ ......انہوں نے رفیق میاں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا...... جس پر اکادکا سفید بال جھلک رہا تھا۔

’’اونہہ‘‘ ......رفیق میاں نے پیار سے ماں کا ہاتھ جھٹک دیا...... میں نے ایسا کیا کر دیا ہے آپ کے لئے جو آپ بار بار یاد دلاتی رہتی ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے اماں کہ اللہ مجھے ہزار جنم دے میں ہر جنم آپ پر اور بھائی بہنوں پر یوں ہی وراتا جاؤں۔

بس بس...... اماں نے منہ میں پلو ٹھوس لیا...... اب ایسا نہ کہہ میرے بچے...... تیرے پاؤں پڑتی ہیں...... میرا جی کیسے کیسے کٹتا ہے کہ تو نے ہماری خاطر، میری خاطر، ان بچوں اور اس گھر کی خاطر کیسا سنجوگ لے لیا...... آج کو تیرا بھی گھر ہوتا، تیری بھی دولہن ہوتی، تیرے بھی بال بچے ہوتے، تیرے بھی جی کو ٹھنڈک پہنچتی، مگر......

اف، اماں بی، تو آپ کیوں یوں دل کو جلا رہی ہیں...... کیا مجھے کسی نے منع کیا تھا؟ ......کیا کسی نے میرا ہاتھ روکا تھا۔؟

وہی تو میں بھی کہتی ہوں...... وہ آنسو پونچھتی بولی...... اگر آج کو تیرے سر اتنی ذمے داریاں نہ ہوتیں تو کیا تو یوں ہی اکیلا پڑا رہتا؟ ......اب تو میرا جی رہ رہ کر یہ کہتا ہے کہ......‘‘ آنسوان کا گلا دبوچے لے رہے تھے۔

رفیق میاں نے ہنس کر بات کاٹی...... افوہ اماں ان سب باتوں کا بھلا یہ کونسا موقع ہے؟ اچھا بتایئے...... وہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔ آپ میرے پاس کس کام سے آئی تھیں؟

اماں نے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا...... بیٹا مہمان آئے ہوئے ہیں...... گھی ختم ہو چکا ہے۔ پراٹھوں اور انڈوں کے لئے گھی ہونا ہی چاہیئے۔ ذرا سا تھا تو اتنے دن چل گیا...... اب تو ڈول خالی پڑا ہے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں، میں منگوا دوں گا۔ اتنی اتنی سی باتوں کے لئے آپ پریشان کیوں ہو جاتی ہیں اماں؟

اتنی سی بات؟ ......اماں الجھ کر بولیں...... کیا تیرے قدموں تلے گنگا بہہ رہی ہے جو اتنی سی بات ہے یہ...... اور ماشاءاللہ سے کھانے کے لئے تو پورا گھر بھرا پڑا ہے۔ بھائی، بھاوج، تین بچے......‘‘

اماں...... اماں...... وہ ماں کے لہجے کو دھیما کروانے کے لئے خود بھی دبے دبے بولنے لگے......’’ آپ ذرا چپ رہا کیجئے۔ انو کو بار بار الاہنے نہ دیجئے۔ بدک گیا تو گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔

جاتا ہے تو سو بار جائے، ہمارا کیا لے جائے گا۔

ہمارا چین سکون لے جائے گا۔ رفیق میاں کھوئے کھوئے لہجے میں درد سے بولے...... آپ بھول گئیں، وہ ابا میاں کا کتنا دلارا تھا۔ اور ابا میاں نے مرتے مرتے آپ سے کہا بھی تو تھا کہ بیگم انو اور کوئی نہیں، میرا ہی دوسرا روپ ہے، اور ابا میاں نے مجھ سے بھی تو کہا تھا نا اماں کہ رفیق

بیٹے میرے بعد اور کون ہوگا جو اس گھر کو دیکھے ...... تم سے مجھے بہت ساری امیدیں ہیں ...... میرے پیچھے تم سا بیٹا ہو تو قبر میں بھی چین ہی چین ہے ...... آپ انو کو دیکھ دیں گی تو ابا میاں کی روح کہاں چین پائے گی؟"

تمہاری شہ پا کر ہی وہ اتنا غیر ذمے دار اور لاپراوہ گیا ہے ورنہ کس نے دیکھا ہے کہ جوان جورو کا مرد اور اتنے سارے بچوں کا باپ، یوں گھر، زندگی اور پیسے خرچے سے بیگانہ رہے کہ پھوٹی کوڑی دینے کا روادار نہ رہے۔ الٹے دھونس جماتا پھرے۔"

"سنبھل جائے گا اماں۔ آخر عمر ہی کیا ہے؟"

یہ لو اور سنو...... ڈھیر سے بچوں کا باپ ہے...... اور کیا عمر ہونی چاہیئے؟"

"ایسا چھوٹا دل بھی نہیں کرنا چاہیئے اماں، اوپر والا دیتا ہے۔ ہم کسی کو کھلانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں بھلا۔ سب اللہ کی دین ہے۔

وہ ٹھیک ہے بیٹا کہ اللہ کی دین ہے۔ مگر اللہ بھی کب تک دے گا۔ پھر ہاتھ سمیٹ لے گا۔"

ارے واہ اماں ...... یہ کیسے ممکن ہے بھلا۔ بھولے بھٹکے دو چار مقدمے تو مہینے بھر میں مل ہی جاتے ہیں۔

اور کھانے والے جو گاڑی بھر ہیں" ...... اماں تلخی سے بولیں۔

رفیق میاں نے جان بوجھ کر بات کا رخ موڑ دیا ...... اچھا تو اماں میں صبح ہی باقر کو بھجوا کر گھی منگوادوں گا ...... کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہلوا دیجئے گا۔"

ماں کی آنسو بھری آنکھیں وہ دیکھ نہ سکے۔ رہ رہ کر انہیں ان جھریوں بھرے چہرے کا خیال آرہا تھا، جس پر آنسو ٹیڑھی ترچھی لکیریں بناتے ہوئے بہے جا رہے تھے ...... اور کیا اماں کا رونا غلط تھا۔ دکھوں، سکھوں سے پالی گئی اولاد کا کون سکھ نہیں چاہتا۔ کس ماں کا یہ دل گردہ ہے کہ جوان اولاد کو کنوار پن کی تنہائیاں بھوگتے دیکھتے۔ نصیبوں کے ستم تو دیکھو کہ پھول کو بھی ہاتھ لگانا تو وہ کانٹا گیا۔ ماں باپ کے گھر کوئی ہن تو برستا نہ تھا۔ جیسا میکہ ویسی ہی سسرال ملی مگر اللہ نے آل اولاد سے خوش رکھا۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے، اب اور کیا چاہیئے تھا۔ روکھی سوکھی سے ہنسی خوشی سے بسر ہوتی تھی۔ بیٹی عمر کے 17ویں اٹھارویں برس میں آئی تو ماں باپ نے اچھی جگہ دیکھ کر سر کا بوجھ اٹھا دیا۔ مگر قسمت کی بیٹی تھی کہ بھری جوانی میں رنڈاپے نے آگھیرا۔ اوپر تلے چار بیٹے ہوئے ...... حوری باپ کی موت کے کوئی چھ سات ماہ بعد پیدا ہوئی۔

عورت کا سارا دم خم مرد کے دم سے ہوتا ہے۔ مرد ہی چھوڑ جائے تو کون اس کو پوچھے ...... کون اس کی عزت کرے ...... باپ اور بھائی نہیں چاہتے کہ، غریبی سے سہی، مگر نازوں، لاڈوں سے پالی کو سسرال میں یونہی چھوڑ دیں۔ سسرال والے بھلے سے لاکھ نا، نا کرتے رہے، مگر انہوں بیٹی کو گھر بلا ہی لیا۔ یہ پھر بھی اپنا گھر تھا، برے بھلے کی کیا بات تھی۔ جو یہ کھاتے، وہی کچھ وہ بھی کھاتی ...... جو یہ پہنتے، وہی کچھ وہ بھی پہنتی۔ یہ تو نہ تھا کہ عمر بھی سسرالیوں کی جھیڑ جھیڑ، پڑپڑ سنا کرتی ...... چار دن تو ہر کوئی اوپر اوپر کرتا ہے اور پھر بات بات میں گو سے نکال کر موت میں ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے سے میکہ کیا برا ہوتا ہے۔

جانے کون سا الو گھر پکار گیا تھا کہ ایک سے ایک مصیبت ٹوٹتی گئی ...... دن نہ گزرے تھے کہ باپ بھی چلتے ہوئے۔ دو دو بیوائیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ...... جو کچھ بڑا پن تھا وہ رفیق میاں ہی میں تھا۔ پڑھائی جا رہی تھی مگر اب ساری ذمے داری انہی کے سر پر آپڑی تھی۔ ماں نے پھر بھی اپنے اتنے حواس نہ کھوئے کہ بیٹے کی پڑھائی کی ختم کروادیتیں۔ پاس کا زیور، برتن بھانڈے کام آتے رہے۔ رفیق میاں کو وکالت کی ڈگری مل گئی۔ یہ تو ہوا کہ منہ بھگونے کو کوئی آسرا تو ہوا۔ ورنہ چھوٹے انو میاں تو بچپن ہی سے ماں باپ کے لاڈلے تھے۔ اب ان سے کیا آس تھی ...... ان کی اور رفیق میاں کی عمروں میں فرق بھی تھا۔ باپ بیٹے جیسا نہ سہی، مگر گنے جاتے یہ باپ ہی سے۔ وہ بھلا دیتے کیا اور یہ لیتے کیا؟ ...... بلکہ خود ہی چار آٹھ آنے کے لئے بھائی اور ماں کے آگے ہاتھ پھیلایا کرتے۔ ایسے میں وہ کسی کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں کیا رکھ سکتے تھے۔ دسویں کے بعد تو ان کی پڑھائی کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ بھائی نے لاکھ چاہا کہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جائے، مگر شاید ان کے مقدر میں کسی کے زخموں پہ مرہم رکھنا نہ لکھا تھا تو کرتے بھی تو کیا کرتے؟

یوں ہی برس بیت گئے۔ زندگی اتنی سپاٹ تھی کہ کوئی اونچ نہ نیچ اس قدر ویران تھی کہ رنگ نہ بو ...... آخر ماؤں کے جی میں بھی ارمان ہوتے ہیں۔ اماں بی اسی کونسی انوکھی تھیں اور بڑے بیٹے کی موجودگی میں، آخر کو بول ہی اٹھیں:۔

"اللہ نے جیسی بھی گزار دی، گزار دی۔ اس کا شکوہ کس سے کیا کریں ...... ہم سے بھی گئے گزرے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں ...... مگر میاں اب تو جی چاہتا ہے کہ میرے بھی آنگن میں بہو پازیب چھنکاتی پھرے ......"

اس سے پہلے بھی اماں نے ہزار بار کہا ہوگا مگر بیٹے ٹال ٹال گئے جس پر اتنی ذمے داریاں ہوں، وہ کیا گھر بسائے گا؟

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر آپ دیر کیوں کر رہی ہیں......سوچ کیا رہی ہیں......آخر کر کیوں نہیں ڈالتیں۔ ایک ہنگامہ......لے آیئے دلہن بھی......''

اماں کی آنکھیں چمک اٹھیں......''کلموہے......اتنے دنوں سے پھر منہ سے کیوں بیٹھا تھا......آج کو چار چار پوتے گھر بھر میں اودھم مچاتے لوٹتے پھرتے'' ......

''پوتوں کا کیا ہے۔ آج بہو لے آیئے، چند ہی سالوں میں پوتے پوتیوں سے آنگن بھر جائے گا'' ......وہ ہنسے......''مگر آپ نے کوئی ڈھنگ کی لڑکی بھی دیکھی ہے؟''

''تو تو کان ہی نہیں دیتا۔ پھر لڑکی دیکھ کر میں کرتی بھی کیا......اب تو نے حامی بھر لی ہے تو سمجھ لے میں نے لڑکی بھی دیکھ لی......'' وہ خوشی خوشی بولیں۔

رفیق میاں کچھ سمجھ کر چکرائے......''مگر اماں، میں تو انور میاں کی شادی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔''

''کیا کہا......'' اماں ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں......''انو کی شادی ہوگی اور تو یوں سانڈ بنا گھومتا رہے گا؟'' ......

''اماں!'' وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سنجیدگی سے بولے......''میرے حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں شادی کے بارے میں سوچ بھی سکوں۔''

''اوئی میں بھی تو سنوں کہ وہ کون سے حالات ہیں جو تیری شادی میں پتھر روڑے اٹکا رہے ہیں؟''

''اماں، میری حالت اس ستون کی سی ہے جو ساری چھت کو سنبھالے رکھتا ہے۔ ستون ذرا بھی اپنی جگہ سے ہلا کہ ساری عمارت نیچے......میں ایسی ناسمجھ کی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔''

''عقل والے ستون کو ہلنے بھی نہیں دیتے، قدم جمائے کھڑے رہتے ہیں۔ تجھے خود پر بھروسہ نہیں ہے؟''

''ہاں اماں......مجھے کھلے لفظوں میں اقرار کرنے دیجئے کہ خود مجھے اپنی ذات پر ہی بھروسہ نہیں۔ مجھے اتنے سارے مرحلے طے کرنے ہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی جورو مل گئی، جس نے گھر والوں میں پھوٹ ڈلوادی تو میں آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ یہ سارے لوگ کدھر بھٹکیں گے؟......''

''اے چل میاں......عورت پاؤں کی جوتی ہوتی ہے......اس سے اتنا بھی کیا دبنا''

''نہیں اماں......آپ عورت ہو کر عورت ذات کی بے حرمتی نہ کیجئے......عورت تو سر کا تاج ہوتی ہے......وہ ہر روپ میں قابل عقیدت ہوتی ہے۔ میں خود کو بہت کمزور پاتا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ سر کے تاج کو ٹھوکر لگا سکوں'' ......

''تو کیا تو اب شادی کرے گا ہی نہیں؟'' ......وہ ہنسنے لگے تو اماں کہنے لگیں......''تیری باتوں سے تو یہی لگتا ہے مجھے۔''

''جی نہیں اماں......''اس کا یہ مطلب تو نہیں نکلتا......میں شادی کروں گا ضرور، مگر ابھی نہیں......کچھ دن ٹھہر کر، جب حالات ذرا سدھر جائیں گے۔ دیکھئے نا اماں، آپا جی کے بچے ہیں، ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اتنے ساروں کی لکھائی پڑھائی......پرورش، تعلیم، تربیت، پہننا اوڑھنا، پھر انو ہے......اس کی شادی بیاہ۔ اس کے بچے ہوں گے۔ پھر گھرداری......کتنی ساری الجھنیں اور بکھیڑے ہیں اور'' ......

اماں بات کاٹ کر بولیں......''ارے پگلے تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اپنی الجھنوں اور بکھیڑوں کو بانٹنے والا بھی کوئی ہونا چاہیئے۔ مرد تھکا ہارا ہو، پریشان ہو، غم نصیب ہو تو کوئی تو ایسا ہو جو ممتا کی سی محبت سے اس دکھی دل کو سنبھال لے۔''

''آپ جو ہیں'' ......

''ماں ماں ہے بیٹا......بیوی، بیوی ہوتی ہے۔''

''میں آپ کی اس بات کو نہیں مانتا اماں......عورت بہرحال عورت ہے جو ہر حال اور ہر روپ میں محبت ہی تو دیتی ہے۔''

آدم اور حوا کا حوالہ دیتے ہوئے اماں صاف صاف بے تکے پن پر اتر آئیں۔

''وہ......وہ اماں۔'' بیٹے گھبرا گئے......''بات ایسی ہے کہ شاید آپ بھی ٹھیک ہی کہتی ہوں......لیکن اماں اصل بات یہ ہے کہ اف......آپ میرا مطلب تو سمجھتی نہیں ہیں۔ میں نے کبھی آپ کا حکم ماننے سے انکار کیا ہے؟......یہ تو مجبوری کی بات ہے اماں......اور آپ خود جانتی ہیں اور بوجھتی ہیں کہ میں شادی کرلوں۔ چار دن میں بال بچہ ہوگا......اپنی بیوی، اپنے بچوں اور اپنی گھر گرہستی میں گھر کر بس یہی سوچا کروں گا نا کہ میں اپنوں کا منہ مار کر دوسروں کا منہ کیوں بھروں۔ کیوں ان کی حق تلفی کروں......آخر اپنی زندگی بھی میرے سامنے ہے......دوسرے خود

کمائیں خود کھائیں، میں کیوں ان کا ساتھ دوں۔ کیا میں اکیلا کمانے کے لئے رہ گیا ہوں؟...... انو تو خیر مرد ہے کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا لیکن آپا جی کدھر ٹھوکریں کھاتی پھریں گی۔ پانچ بچوں کا ساتھ، چار دن میں لڑکی جوان ہو جائے گی، پھر کیا ہوگا؟...... یہ ظاہر ہے کہ ہانڈی ڈوئی آپس میں کھڑکھڑائیں گی ضرور ہی دو بہوئیں ہوں گی۔ دو بیٹے...... دن گزریں گے تو دانتا کلکل شروع ہو جائے گی۔ ہمارا کیا ہے، مگر کچلن میں کون آئے گا......؟ آپا جی اور اماں بی...... میرا تو کچھ نہیں جائے گا...... اچھا بتایئے آپ نے میرے لئے کون سی لڑکی ڈھونڈی اور پسند کی ہے؟...... میں کیوں یہ گناہ مول لوں کہ بڑھاپے میں ایسی محبت والی ماں کا دل دکھایا؟''

اماں نے غور سے بیٹے کی صورت دیکھی۔ کتنی سچی باتیں اس نے کہیں۔ وہی تو اس گھر کا کرتا دھرتا ہے، وہی منہ پھیر تو کس پر کیا گزرے، کون جانے...... یہاں تو سارا ہی کچا آوا تھا اور پھر یہ تو دنیا میں ہوتی آئی ہے کہ شادی کے بعد مرد کا دل اس کے اپنے بس میں نہیں رہ جاتا بلکہ ایسی کٹھ پتلی بن جاتا ہے کہ جس کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے کہ جیسے نچائے ویسا ہی ناچے...... بیٹے نے ماں کو کچھ اس طرح قائل کیا کہ پھر آگے منہ ہلانے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ جی بہلانے کو آپا جی کے بچے تھے، بڑے بڑے بھی تھے تو کیا ہوا، تھے تو بچے ہی...... ہاں یہ ضرور تھا کہ گھر میں بیواؤں کا راج تھا۔ پائل کی چھنک اور چوڑیوں کی کھنک مدت ہوئی اس گھر سے رخصت ہو چکی تھی۔ اب انو میاں کی دلہن آجاتی تو یہ ویرانی بھی رخصت ہو جاتی...... اپنے ہی قریبی عزیزوں میں بیٹی دیکھی اور انو میاں کی شادی رچ گئی۔ دالان کے ساتھ والا کمرہ میاں بیوی کو دیا گیا۔ اب دلہن جو چلتی تو پازیب چھن چھنا اٹھتی اور آنچل سنبھالتی تو چوڑیاں کھنکنے لگتیں...... اور کبھی جو انو میاں کو رات بے رات شرارت سوجھتی تو پھر پائل اور چوڑیاں دونوں مل کر چیخ و پکار مچانا شروع کر دیتیں۔ گھر کی فضا اب ایسی تھی جیسے برسوں پڑیت رہنے والی بنجر زمین میں کسی نے ہل چلا کر ہری بھری فصل اگا دی ہو...... پہلے تو یوں ہوتا تھا، کہ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن اور اپنے اپنے بکھیڑوں میں الجھے رہتے۔ لیکن اب ان اداس چہروں پر ہنسی کی چھوٹیں بھی دکھائی دے جاتی تھیں، جو مدت ہوئی مسکرانا تک بھول گئے تھے...... رفیق میاں، جب کبھی کوئی موٹی رقم ہاتھ لگتی تو چھوٹی دلہن کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لے ہی آتے۔ کبھی ساڑھی، کبھی جھمکے، کبھی چوڑیاں تو کبھی کنگن۔

دلہن تو بچوں کے لئے عجوبہ ہوتی ہے۔ گھیرے میں لے کر بیٹھ جاتے اور پہلیں ہوتیں...... اب کہیں اتنے دنوں بعد اس گھر میں قہقہے جاگے...... شادی کے ٹھیک دوسویں مہینے چھوٹی دلہن کے درد اٹھا۔ رات مصیبتوں سے کٹی...... ایک طرف انو میاں اور دوسری طرف خود رفیق میاں دروازے کے باہر بیٹھے گھڑیاں گنتے تھے...... اماں بدحواس...... نند پریشان...... پہلا پہل معاملہ اور چودہ گھنٹے گزرنے پر بھی مشکل آسان نہ ہوئی...... رفیق میاں کا دل رہ رہ کر ڈوبتا ابھرتا...... مصیبتوں نے ہمیشہ اس گھر کو تاکا تھا...... خدا نے کرے...... زہرہ دلہن کو کچھ ہو گیا تو...... وہ جان جوان دلہن اپنی جان سے جائے گی...... یہاں کیا ہے۔ آٹھ چار دن میں انو میں کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے گا۔ پھر ڈوبتے دل سے انو میاں کو دیکھتے۔ آنکھوں میں نمی گھلی پاتے تو خیال بدلنا پڑتا کہ گھر آباد ہوگا، تب آباد ہوگا۔ یہاں تو ایسے دہتک کے مارے بیٹھے تھے کہ بری بھلی جو خبر آجاتی تھی تو وہیں بیٹھے بیٹھے دم چھوڑ دیتے۔

''ہمارے قہقہے نہ چھین لینا خداوند!''...... انہوں نے کلپ کر دعا مانگی...... چیاں چیاں کی آواز آئی اور ادھر ان کا دل حلق میں آبیٹھا...... انو میاں چیاں چیاں سنتے ہی لپک پڑے۔ ادھر ماں بہن ہاں ہاں کرتی ہی رہیں۔

''اے میاں کیا کرتے ہو؟''

مگر وہ اندر پہنچ بھی گئے اور ہاہا ہوہو کر کے گوشت کے گولے کو ہنسانے کا جتن بھی کرنے لگے۔ انو میاں باپ بن گئے۔

رفیق میاں کا دل آج تک اس انداز سے نہ بھڑکا تھا۔ ماں نے ٹھیک کان کے پاس بھتیجا ہونے کی خوشخبری سنائی تو بھرے دل سے ہنس کر بولے:۔

''چلو بھائی آج ہم تایا بن گئے''

اس دن جب آئینے کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے آئینے کو خوشخبری سنائی کہ لو بھئی ہم تایا ہو گئے تو آئینے نے ہنس کر کہا...... ''اور آج ہم بھی تم کو ایک خوشخبری سناتے ہیں۔ وہ دیکھو تمہارے کان کے پاس ایک سفید تار سا جھم جھما رہا ہے۔''

''کہیں یہ بڑھاپا تو نہیں؟''

لوگ کہتے ہیں کہ گرمیوں کی شاموں کو جو سرسراتی ہوائیں چلتی ہیں، ان میں ایک جھونکا ایسا بھی آتا ہے جو تنہائی کا احساس دلا کر کانوں کے پاس شائیں شائیں کئے جاتا ہے...... ''اٹھو، کسی کا ہاتھ تھامو...... اٹھو، کسی کا ہاتھ تھامو...... اٹھو......'' یقیناً ایسے ہی کسی جھونکے نے آدم کو تنہائی کا احساس دلایا ہوگا۔ تبھی تو حوا نے ان کی پسلی میں اپنی سیج بنائی۔ مگر لاکھ ہوائیں

چلیں...... ہوائیں...... گرم گرم ہوائیں ٹھنڈی زندگی بخش پھواروں سے بدلیں...... پھواریں پھر سردیوں کا پیغام لائیں...... موسم کی اس آنکھ مچولی نے جی کو کیسے کیسے کلپایا...... کبھی سرد برف کے جھونکے، کبھی پروا، کبھی چھینٹے جو بدمست ہواؤں کے دوش بدوش آتے، اور یہ سرسر کرتے جھونکے کانوں میں سرگوشیاں کرتے...... اٹھو کسی کا ہاتھ تھام لو...... کسی کی مہکی ہوئی زلف کو اپنے چہرے پر بکھیر لو...... کسی کا آنچل جو دھنک رنگ ہے اس میں اپنے وجود کو چھپالو...... چھپالو...... لیکن رفیق میاں کے کان ایسے پٹ تھے کہ ان کے پردوں سے کبھی یہ آواز نہ ٹکرائی......

جانے ایک دن بیٹھے بٹھائے انہیں خود ہی یہ خیال کیوں آیا۔ زہرہ دلہن نے تو کبھی کسی بات پر زبان نہ ہلائی۔ ممکن تھا کہ شادی کر لیتا تو میری دلہن موم کی مورت ہی ملتی...... نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں...... اونہہ، اب غصے کی بات تو جانے ہی دو۔ بھلا کون انسان ایسا ہے جسے ایک آدھ بات پر غصہ نہ آتا ہو...... پھر میری دلہن ہی کیوں قصوروار ٹھہرائی جاتی؟......

یہ سوال انہوں نے اپنے دل سے کیا تھا۔ دل کچھ جواب نہ دے پایا...... دیتا بھی کیا، لیکن دوسرے ہی دن انہیں خود بخود جواب مل گیا۔

ننھے اسلام کے چھلے پر گھر میں دھوم دھڑ کا تھا۔ یوں تو اب گھر میں قہقہے سنائی دیتے ہی تھے مگر اس دن تو ہر طرف خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ماں بن جانے کے بعد عورت کا دل بڑا نرم و نازک اور وہمی بن جاتا ہے اور اسلم میاں تو یوں بھی ماں کو زیادہ ہی پیارے تھے کہ کڑے دردوں سے جنائے گئے تھے۔ گود بھرائی کی رسم کے لئے زہرہ دلہن جب اسلم کو گود میں لے کر بیٹھیں تو چاؤ کے مارے بیوہ پھوپھی بھی پھول پہنانے لگیں...... چھوٹی دلہن کے منہ سے جیسے آپ ہی سوچا سمجھا جملہ ٹپک پڑا...............

''آپا جی...... پھول پہنانے کو کیا آپ ہی رہ گئی تھیں۔ حوری بھی تو ایک ہلکا پھلکا ہار پہنا سکتی تھی۔''

دلہن نے اپنے حسابوں بڑی سمجھ داری کی بات کی تھی، لیکن آپا بی سے چھپا نہ رہ سکا کہ ان کا مطلب کیا تھا؟...... بھلا کون بہن اپنی بھابھی کے سہاگ کو یعنی اپنی ہی زندگی...... اپنے ہی بھائی...... اپنے ہی خون کو ٹوک سکتی ہے......

ارمان بھرا دل بھائی کی خوشی پر خوش ہی ہوا ہوگا۔ یہ تو نہ سوچا ہوگا کہ اپنا منحوس سایہ بھابھی پر ڈال دے اور بھائی بھرپور جوانی میں مر کر اپنے پیچھے اولاد کو یتیم چھوڑ جائے...... پھر زہرہ دلہن کے منہ سے یہ بات کیسے نکل پڑی...... اور پھر وہ اس انداز سے اسلم کو اپنے سینے میں سمیٹ بیٹھیں تھیں کہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہار تو گرا ہی گرا، ادھر آپا بی بھی گر پڑیں......

اماں بی کو دن رات جو کھٹک کھائے جاتی تھی کہ رفو میاں نے شادی نہیں کی...... شادی نہیں کی...... وہ کھٹک آج کھٹ سے کہیں اڑ گئی۔ آج انہیں یاد آیا کہ کیسی عقل مندی کی بات بیٹے نے کہی تھی کہ...... ''ہانڈی ڈوئی ساتھ رہیں گی تو کھڑکیں گی ہی'' ...... اگر آج یہ رفیق میاں کی دلہن نے کہا ہوتا تو کسی کو سہار ہوتی؟...... کوئی نہ کوئی کچھ کہہ اٹھتا اور پھر وہ میاں کے کان بھر دیتی...... اور مرد کس کی سنے گا؟...... ماں بہنوں کی یا اپنی دل لگ بیوی کی؟...... جو اس کا پہلو گرماتی ہے اور بچوں سے اس کا گھر بھر دیتی ہے......

رات کو رفیق میاں نے بڑی جھنجھناہٹ سے اپنے دل کو سمجھایا...... میں جانتا ہوں، تم عمر کے اس دور میں ہو کہ تم کسی پر نگاہ نہ ڈالو گے۔ لیکن پھر بھی آج تمہیں سنا دیتا ہوں...... کہ اپنے کان بند کر لو...... اپنی آنکھیں میچ لو...... ایسا نہ ہو کہ کوئی سریلی آواز اور مٹھاس بھری صورت تمہاری عبادت میں خلل ڈالے دے۔

دل نے دھیرے سے جواب دیا...... ''عمر کا یہی حصہ تو خطرناک ہوتا ہے، اسی دور میں تو آ کر عورت کے پیار کی...... اس کے محبت بھرے دل کی...... اس کے گرم نرم جسم کی خواہشیں بڑھتی ہیں۔ پیاسا تو پانی دیکھ کر ہی لپکتا ہے۔ کیا میں یونہی قصوروار ٹھہرایا جاؤں گا؟''

وہ ہنسے...... ''نادان! پیاس تو مدت ہوئی بجھ چکی ہے، اب کوئی خطرہ نہیں۔ یہ تو محض ایک دوستانہ مشورہ تھا۔''

دل بے تکے پن سے بولا...... ''بعض ملائم اور گستاخ ہونٹ ہوتے ہیں کہ بے صدا آواز سے پکارے جاتے ہیں...... ''ہمیں چوم لو...... ہمیں چوم لو......'' اگر ان گستاخ ہونٹوں پر پیار آ ہی گیا تو؟''

''نہیں......'' انہوں نے دھیرے سے مضبوط لہجے میں کہا...... ''ایسا کبھی نہ ہوگا...... میری روح کے سارے دروازے بند ہیں۔ یہاں کسی کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ چاہے وہ پیار کی درخواست کرنے والے ملائم ہونٹ ہوں یا چنگاریاں چھوڑتے ہوئے سرخ سرخ گال۔''

اس سے پہلے اماں نے ایک بار شادی کے لئے کہا تھا۔ بڑے پیار اور بڑی ضد سے انہوں

نے بیٹے کو قائل کرنا چاہا تھا۔

’’خواہ مخواہ عورتوں کو بدنام کرتا ہے۔ بھلا چھوٹی دلہن نے آج تک کیا کیا؟ بھلے کو بڑی ہی آتی تو دلی سکون ملتا۔‘‘

’’کیوں اب سکون نہیں ہے کیا؟‘‘ انہوں نے کہا تھا۔

’’ہے کیوں نہیں، مگر؟......‘‘

’’مگر کیا؟......‘‘

’’ارے کم بخت‘‘...... اماں گلا پھاڑ کر چلائیں...... ’’خواہ مخواہ ٹرٹر کئے جاتا ہے، کبھی تو اس ممتا کے مارے بوڑھے دل کا خیال کر‘‘......

اس روز اماں نے ایسی گونج گرج کے ساتھ ڈرا دیا تھا کہ ایک لمحے کو وہ جھک سے گئے تھے اور اماں بھی اپنی جگہ خوش ہو گئی تھیں...... مگر اس دن کی بات اور تھی اور آج کی بات اور...... زہرہ دلہن کی اتنی سی بات نے سارے گھر میں سناٹا پھیلا دیا تھا۔ انو میاں بن بات اپنی جگہ روٹھ گئے تھے جیسے واقعی آپا بی کا قصور ہو...... اور آپا بی کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسوؤں کی قندیلیں سلگ اٹھی تھیں۔

انہوں نے اماں سے جا کر بڑے دھیمے بھاؤ میں کہا:

’’میری آمدنی تو یونہی سی ہے اور کوئی ذریعہ آمدنی کا بھی نہیں۔ اور اماں شادی کرنا تو سراسر آبادی بڑھانا ہے۔‘‘

’’بھلا اتنے سارے لوگوں کے کھانے پینے پر کچھ نہ کچھ خرچ تو لگتا ہے۔ بس آپ سب لوگ میرے آس پاس ہیں۔ اماں مجھے سچ مچ بڑا غرور محسوس ہوتا ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہی کہ میں اتنے سارے لوگوں کا بڑا ہوں۔ ان سب کی دیکھ دیکھ کرتا ہوں۔ میرے دم سے ان کی خوشیاں ہیں اور میرے ہی دم سے......‘‘

اور ان کی بات کاٹ کر ان کا دل ان سے پوچھ بیٹھا...... ’’اور اپنی تو سناؤ۔ سچ کہنا، کیا تم نے کبھی ایک چاند سی دلہن اور پھول سے بچے کی آرزو نہیں کی؟‘‘...... یہ تمہارے وجود پر برف کی سلیں رکھی ہیں، جو راتوں کو پگھل پگھل کر تکیئے کو گیلا کر دیتی ہیں......

’’اور اماں...... (وہ دل کا الاہنا شربت کا گھونٹ جان کر پی گئے)...... سب سے زیادہ خوشی تو مجھے اس بات کی ہے اماں کہ...... میں آپ کا بھی بڑا ہوں......‘‘

اماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ سل جو راتوں کو چھپے چوری پگھل پگھل کر تولیہ بھگویا کرتی تھی۔ دن دہاڑے پگھل اٹھی۔

ٹپ...... ٹپ...... ٹپ......

شروع سے رفیق میں نے انو کو ایسی شہ دی، بات بے بات یوں پشت پناہی کی تھی کہ ان کو ذمے داری کا احساس ہوا ہی نہیں۔ انسان کے آگے پیچھے کوئی الجھا ایسا لگا رہے کہ بار بار اسی کا دھیان بندھا رہے تو وہ ذرا ذمے دار بن جاتا ہے...... یہاں تو شروع سے لے کر آخر تک ہر کام کو رفیق میاں نے سنبھال لیا، پھر بھلا ان میں کیا احساس پیدا ہوتا۔ اور تو اور پڑھائی بھی پوری نہ کر سکے۔ بھائی کی کمائی کو کبھی یہ سوچ سمجھ کر خرچ نہ کیا کہ یہ بھائی کی محنت کے پسینے کی کھینچ ہے اور انو میاں کا تھا ہی کیا...... سبھی رفیق میاں کے بل بوتے پر زندہ تھے۔ اگر رفیق میاں کی بھی کوئی بیوی ہوتی تو وہ اپنا حق جتا کر کچھ نہ کچھ تو سنبھال کر بچا رکھتی۔ مگر انہوں نے خود ہی یہ روگ نہ پالا...... اب تک جتنا بھی آیا سبھی کھائی میں گیا۔ ان کا جو کچھ تھا سب گھر والوں کا تھا...... بھولے سے بھی کبھی خیال نہ آتا کہ کبھی اپنی شادی بھی ہوگی...... دلہن گھر آئے گی...... اپنے بچے ہوں گے۔ اور ان کی بھی زندگی بنانی پڑے گی۔ جب آگے پیچھے کوئی فکر ہی نہیں تھی، تو اور کون سا خیال ہوتا جی سے چمٹا رہتا۔ بس آ جا کے یہی دکھ انہیں ستائے جاتا کہ میری جان پر بھلے سے جو گزرے سو گزرے...... لیکن سب چین اور امن خوشی سے رہیں۔ مگر اتنا سکھ ان کے نصیب میں نہ تھا۔ زہرہ دلہن کا منہ ایک بار کیا کھلا کہ ہمیشہ کے لئے کھل کر رہ گیا۔ روز دانتا کل کل ہونے لگی۔ کبھی کبھار تو اماں بول جاتیں، ورنہ اکثر خاموش رہتیں۔ مگر چھوٹی دلہن کا منہ بند ہونے میں نہ آتا۔

آپا بی کے بچے اسلم کے دیوانے۔ یوں بھی گھر میں ننھا بچہ ہو تو بڑوں چھوٹوں سبھی کے لئے کھلونا ہو جاتا ہے۔ بچے اسے ستائیں بھی ماریں بھی اور کھلا پلا کر پیار دلار بھی کریں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ بچے سے دشمنی ٹھہری ہے۔ کھلائے پلائے کی حد تک تو ممانی چپ تھیں، لیکن جہاں بچے کی چیں بھی سنی وہ آپے سے باہر......

’’اوئی بچہ نہ ہوا خدا کا غضب ہو گیا۔ کہوں، یہ کون تک ہے کہ ننھے بچے کو رلا رلا کر خوش ہوتے ہیں، ہنستے ہیں‘‘......

حوری ایسی طرار تھی کہ خاموش تو اس سے بیٹھا ہی نہ جاتا...... تیزی سے بولتی:

’’ہاں ہاں...... جان کر رلا رہے ہیں۔ سن لیا...... ارے کھاتا ہی بہت ہے تو چلائے گا

نہیں؟''

چھوٹی دلہن انگارے اگلنے لگتیں...... ''اے لیو اور سنو...... کیا تمہارے باوا جان جائیداد چھوڑ کر مرے تھے جو کھلائے پلائے کا الاہنا دیتی ہو۔ لو بھئی چار دن کی چھوکری ہمارے منہ آتی ہے۔''

آپا بی جو لپک کر دو چار دھول دھپے حوری کو جڑ دیں تو جڑ دیں...... ورنہ بات بڑھتی چلی جاتی اور جب تک رفیق میاں اپنے کاغذات کے انبار سے نہ نکل آتے تب تک صلح صفائی نہ ہوتی۔

انہی دنوں زہرہ دلہن کی چھوٹی بہن طاہرہ اپنی بہن سے ملنے آئی ہوئی تھی...... اچھی خاصی صورت، ڈھنگ گن بھی اچھے...... منہ کی ایسی میٹھی کہ بس بیٹھے باتیں ہی سنا کرو...... رفیق میاں سے پردہ تھا، لیکن آتے جاتے جھپک ضرور دکھائی پڑتی۔ اماں تو چھوٹی بہو کے تماشے دیکھ دیکھ کر دنگ تھیں مگر آپا بی چاہتی تھیں کہ رفیق میاں گھر بسا لیں...... جانتی تھیں کہ بھائی نے یہ ویرانی کسی اور کے لئے نہیں انہی لوگوں کے لئے اٹھائی ہے ورنہ آگے پیچھے بہن بھائی اور بھانجے بھتیجے نہ لگے ہوتے تو وہ کیوں ایسے ڈھائیں ڈھائیں پھرتے۔ لاکھ چاہا کہ بھائی ہاں کر دیں لیکن وہ کب ماننے والے تھے...... بہن نے بہت ہی جان کھائی شروع کی تو بولے......

''جیسی ایک بہن ویسی دوسری...... زہرہ دلہن نے بیٹھے بیٹھے کیسے ہاتھ پاؤں نکالے ہیں۔ اگر طاہرہ بی بی بھی ویسی ہی نکلیں تو؟...... پھر تو اس گھر کا اللہ ہی مالک ہے نا آپا بی...... میرے سامنے میرے ننھے منے بھانجے بھانجیاں ہیں...... ان کی زندگیاں ہیں۔ میرا اپنا بھائی ہے۔ لاکھ جان جوان سہی مگر مجھے تو یہ بات نہیں بھولتی کہ ابا میاں میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے کر گئے تھے۔ پھر اس کی بیوی بچے ہیں۔ آپ ہیں، اماں بی ہیں...... میں کیسے اتنے سارے لوگوں کو چھوڑ دوں؟...... میں اور کتنی بار دہراؤں کہ مجھے بار بار مجبور نہ کیا جائے...... میں اپنا ذہنی سکون برباد نہیں کرنا چاہتا۔ سب سے ٹھیک یہ ہے کہ اتنے سارے لوگوں کو چھوڑنے کی بجائے میں ایک دلہن کو چھوڑ دوں۔''

آپا بی خوش ہو گئیں...... ''اگر طاہرہ بی بی بھی ایسی ہی نکلیں تو؟''...... مطلب یہ کہ وہ شادی کے لئے راضی تو ہیں مگر وہ صرف اس وجہ سے آنا کانی کر رہے ہیں کہ کہیں بڑی بہو چھوٹی بہو کی طرح سے لڑاکا اور بدتمیز نہ نکل آئے اور گھر کا سکون لٹ جائے...... ''اے میاں تو کوئی اچھی سی میٹھے بھاؤ کی دلہن ڈھونڈ لاؤں گی۔''

سامنے ٹوکری میں سیب دھرے تھے۔ ایک سرخ سا سیب اٹھا کر وہ بولے...... ''یوں دیکھنے میں تو یہ اوپر سے اتنا خوبصورت نظر آ رہا ہے...... لیکن کون جانے یہ میٹھا ہے کھٹا؟''

آپا بی کی زبان پر تالے پڑ گئے......

ایک دن چھوٹی دلہن نے بڑی چاؤ سے باورچی خانہ سنبھالا اور مرچوں کا کھٹا سالن پکایا...... اور تو سب نے ہری مرچوں کا تیز اور کھٹا سالن مزے لے لے کر کھایا...... مگر اماں بی ایک تو بوڑھی...... دوسرے دس دن سے پیچش سے گھل رہی تھیں۔ سوں سوں کر کے جیسے تیسے انہوں نے بھی کھا ہی لیا۔ بہو کو یہ بات نہ بھائی کہ سب تو تعریف کریں اور ساس سوں سوں کر کے سب کی توجہ اس بات کی طرف دلائیں کہ...... ''دیکھو بھئی اس نے سالن مزے کا نہیں پکایا بلکہ مرچیں کچھ زیادہ ہی جھونک دی ہیں''......

وہ کھرے پن سے بولیں...... ''اوئی امی جان آپ یہ سوں سوں کیوں کئے جا رہی ہیں؟''

اماں نے بے چارگی سے دیکھا اور بولیں۔ ''بی بی، میں کچھ بہانہ تو نہیں کر رہی ہوں۔ دیکھ لو پیچش کے مارے زبان چھالوں سے لد گئی ہے۔'' انہوں نے زبان نکال کر دکھائی جو سرخ کھیر ہو رہی تھی۔

انو میاں سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''تمہیں معلوم تھا کہ اماں بیمار ہیں تو ایک پھیکا سالن الگ سے پکا دیتیں۔''

''اے واہ...... میں کوئی باورچن ہوں...... کیا میں نے ماما گیری کرنے کا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے کہ سارے گھر کا کام کاج کرتی پھروں...... ایسا ہی ہے تو چولہے کیوں نہ الگ کر لیں۔ وہ اپنی مرضی سے کھائیں، ہم اپنا من مانا پکائیں......''

بہو کی زبان چر چر چلی جا رہی تھی...... رفیق میاں نے ناگواری سے بھاوج کی طرف دیکھا...... مگر کچھ بولے نہیں۔ اماں بی بھی خاموش رہ گئیں...... مگر آپا بی سے چپ نہ رہا جا سکا، تیورا کر بولیں :۔

''دلہن ایک دن چولہے کے پاس جا کر جھانکا تو اتنی باتیں کر رہی ہو۔ آخر تمہیں اپنے بچوں سے فرصت ہی کب ملتی ہے کہ باورچی خانے کا رخ کرو...... اوپر کا سارا کام تو باقر ہی نبیڑ لیتا ہے۔ رہا روٹی تھوپنا اور ہانڈی بھون دینا...... تو آخر میں اور اماں پھر کرتی ہی کیا ہیں؟''......

''گویا میں تو مالک بن کر راج رچ رہی ہوں نا......'' وہ تیکھی ہو کر بولیں......

''میں نے تو نہیں کیا بی بی...... آپ کہہ لو تو میں کیا کہہ سکتی ہوں...... لیکن تم ہی کہو کہ شادی

کے اتنے دن گزر گئے تم نے کتنی بار باورچی خانے میں جھانک کر دیکھا۔ ایک دن ایک سالن پکا کر یہ کہہ دینا ذرا تو زیبا نہیں کہ میں باورچن نہیں جو سارے گھر کا کام کاج کرتے پھروں…… انسان ذرا تو ایمان کا پاس کرے'' ……

سارے گھر میں وہ ہلور مچی کہ توبہ ہی بھلی…… دلہن نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا……

آخر رفیق میاں کو ٹھنڈے دل سے کہنا پڑا :

''آپا بی، آپ غلطی پر ہیں، چھوٹی دلہن کا کہنا ٹھیک ہے۔ اگر ان کی مرضی ہو تو آپ چولہا ہانڈی الگ کر لیں'' ……

اماں جواب تک چپ تھیں، پھپھک کر بولیں…… ''اے واہ، ان کی مرضی…… یہ ان کی مرضی کیا ہوئی، کون سی بڑی ان کی کمائی دھمائی ہے۔ ذرا منہ تو ہو بولنے کے لئے…… دوسروں کے مال پر یوں چودھرائی کرتے ذرا شرم تو آئے۔''

انو میاں نے ندامت سے سر جھکا لیا…… ''بھائی صاحب آپ زہرہ کی باتوں کا اثر نہ لیں، سب ایک ساتھ ہی بھلے۔ خواہ مخواہ ایک فتنہ کھڑا کر دیا……'' وہ غصے سے بیوی کو گھورتے ہوئے بولے۔

بہو کو ساس کی بات تیر جیسی لگی……

''یہ دوسرے کے مال کی اچھی سنائی۔ آخر کو بڑے بھائی ہیں، کچھ تو حق لگے گا اور کیا ابا میاں یونہی خالی ہاتھ نہ مرے ہوں گے…… پھر وہ جمع جتھا کدھر ہو گئی، ہمیں تو پھوٹی دمڑی تک نہ ملی، ورنہ یہ بڑے بھائی آج وکیل اور چھوٹے بھائی ان پڑھ نہ رہ جاتے۔''

ایک تلوار تھی کہ سب کے دلوں کو کاٹتی ہوئی نکل چلی۔ کوئی کچھ نہ کہہ سکا…… کسی کے منہ سے ایک حرف تک نہ نکلا…… رفیق میاں اپنی جگہ سکتے میں رہ گئے۔ اسی کو دنیا کہتے ہیں۔ بھائی سے محبت کی اور ایسی کہ کبھی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ ہر ضد پوری کی۔ یہاں تک کہ پڑھنے سے جی چرایا تو ڈانٹ ڈپٹ تک نہ کی کہ دل پر بوجھ نہ پا لے۔ اسکول سے اس لئے اٹھایا کہ پڑھائی میں دل نہ لگتا تھا…… ماسٹر مار پیٹ کرتے تھے تو روتا ہی رہتا تھا اور ان کا اپنا دل دکھتا تھا۔ خود روکھا سوکھا کھا کر سب کی برابری کی۔ اپنے ارمانوں اور آرزوؤں کو تھپک کر سلایا…… اپنے جذبات کی خود ہی قدر نہ کی…… اور بھائی کی سیج سجا دی……

بھائی کی دلہن آئی تو ان کا اپنا بستر ان کے لئے کانٹوں کا بچھونا ہو گیا، مگر کسی سے بھی اپنے دل

کا درد نہ کہا۔ بھائی باپ بنا تو جگر پر آرے چل چل گئے، مگر جگر کے درد کو تکیہ بھگو بھگو کر مٹاتے رہے اور آج بھاوج نے کیا صاف صاف سنا دیا۔ پشیمان نگاہوں سے بھائی کو دیکھا…… لاکھ برے تھے انو میاں، مگر ان میں ایسی بری کوئی ادا نہ تھی کہ جس کی وجہ سے بڑے بھائی کا دل ان سے پھر جاتا۔ بس اتنی بات ضرور تھی کہ گھر بیٹھے روٹی توڑتے تھے اور کمائی نہ دھن۔ سال پیچھے بچہ جنتے تھے لیکن یوں کھری کھری تو کبھی انہوں نے بھی نہ سنائی۔

انو میاں نے بڑی شرمندگی سے بڑے بھائی کو دیکھا اور غم سے بولے…… ''بھائی صاحب زہرہ کی باتوں پر نہ جائیے۔ چولہے دو ہو جائیں گے تو دل بھی دو ہو جائیں گے۔''

''ہمیں کیا ایک دل لے کر چاٹنا ہے جی کہ آئے دن کی موئی لڑائیاں لپٹ گئی ہیں۔'' زہرہ دلہن کا غبار ابھی تک نہ نکلا تھا۔

''ہاں زہرہ تم ٹھیک کہتی ہو…… ایک جگہ رہ کر بکھرے ہوئے دلوں سے اچھا ہے کہ بکھرے ہوئے رہ کر ایک دل رہیں۔'' رفیق میاں نے ٹھنڈی سانس لے بھیگے بھیگے لہجے میں کہا۔

چولہے دو ہو گئے مگر دل پھر بھی ایک نہ ہو سکے۔ دل کی رنجشیں باقی ہی رہیں۔ چھوٹی موٹی باتوں پر آئے دن جھڑپ ہو جاتی۔ اماں تو طرح دے کہ ٹال جاتیں لیکن آپا بی برداشت نہ کر پاتیں۔ انہیں رہ رہ کر یہی دکھ ستاتا کہ آج بھائی کی حالت انہی کی وجہ سے تباہ ہے…… یوں بڑے نرم سبھاؤ کی تھیں، اپنی سسرال میں کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات تک نہ کی۔ اپنے سے چھوٹوں کی بھی عزت کی، بھلا بڑوں کا تو پوچھنا ہی کیا…… مگر بھاوج نے رات دن کے طعنوں مینوں سے ان کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔

پہلے پہل تو رفیق میاں گھر کے اندر ہی دالان کے دائیں ہاتھ والے کمرے میں رہتے تھے، مگر جب لڑائیوں کا زور شور بڑھا تو وہ مردانے میں اٹھ گئے۔

بیاہے مرد کو یہ احساس نہیں ہو سکتا کہ ایک کنوارے مرد کی زندگی کیسی کانٹوں کا بچھونا ہوتی ہے۔ عورت کا ساتھ کسی ٹھنڈے باغ سے کم نہیں ہوتا…… فکر ہو…… پریشانی ہو…… غم ہو…… الجھن ہو۔ ذرا جی ہارا اور عورت کا سہارا لیا…… اس کے پیار کے دو بول زندگی میں ٹھنڈک پیدا کر دیتے ہیں۔ غم کے اندھیروں میں اس کی محبت اور دلاسے چاندنی بکھیر دیتے ہیں…… ہر غم تو ایسا نہیں ہوتا کہ ماں بہن سے رونا لے بیٹھے۔ ماں بہن لاکھ کلیجے سے چمٹا لیں، وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی جو عورت محض ایک پیار بھری ترچھی نگاہ سے ہی دیکھ لے۔

رفیق میاں کی زندگی میں تو اس نگاہ کا گذر ہی نہ تھا...... رات ہو یا دن...... بیٹھک بھلی اور وہ بھلے۔ کاغذات سامنے دھرے ہیں، اور وہ وسوچ بچار میں غرق ہیں...... کبھی بچے اچھل پھاند کرتے پہنچ گئے، کبھی حوری شرارت کرنے جا پہنچی...... ورنہ وہاں وہی یک رنگی تھی...... ایک دن بڑے جتن سے انہوں نے اپنے دل کو سمجھایا تھا۔

اپنی آنکھیں میچ لو...... اپنے کان بند کر لو۔ کیا خبر کوئی چاند سی صورت تمہاری عبادت میں بادھا ڈال دے۔ اب ایسی بات سوچ کر انہیں ہنسی آتی تھی۔ بھلا میں بھی کتنا نادان تھا...... دل کو سمجھانے چلا تھا۔ بھلا میری زندگی میں کہیں چاند چمکا کرتے ہیں؟...... اور چمکیں بھی تو میں کہیں دیکھا کرتا ہوں؟...... اور وہ مزے میں ادھر ادھر ڈولتے پھرتے...... اپنے کھچڑی بالوں کو دیکھتے اور بولتے...... ''عبادت گاہ کے دروازے تو بند ہیں، اب یہاں کون آئے گا؟ کیسے آئے گا؟...... گرمیوں کی رسمساتی شاموں کا البیلا جھونکا کبھی تو ان کے کانوں میں کہہ سکا کہ ''اٹھو کسی کا ہاتھ تھامو''......

مگر اب ان سارا مان ٹوٹ کر رہ گیا۔ سرخ مخملیں چپلوں کو دیکھ کر ان کی ساری عبادت دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ نرم نرم گرگابیاں ان کے دل سے یوں چمٹ کر رہ گئی تھیں کہ نکالنے نہ نکلتیں۔ نہ کسی کی چاند ایسی صورت پر پیار آیا نہ کبھی کسی کی سریلی آواز نے کانوں میں رس گھولا...... نہ کسی کی نگاہوں کا تیر دل کے آر پار ہوا...... نہ کسی کی البیلی چال نے ان کا سیدھا راستہ چلتے قدم ڈگمگائے۔ اور تو اور کسی کے نے سرخ ہونٹوں نے یہ گستاخی نہیں کی کہ...... ''ہمیں چوم لو...... ہمیں چوم لو...... ہمیں''

جنے کیسا سمے تھا کہ بے پروں کے دل اڑنچھو ہو گیا...... ان کا دل چاہتا کہ نرم نرم...... گرگابیوں پر ہمیشہ کے لئے اپنا سر جھکا دیں...... میں تمہاری عبادت کرتا ہوں...... میں تمہیں پوجنا چاہتا ہوں...... میں تمہیں پیار کرنا چاہتا ہوں......

اور جب سے وہ سوکی اپنی پیٹھ موڑے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اپنی گلابی گلابی ایڑیاں ان کے دل کے زخموں پر مرہم کی طرح رکھتی چلی گئی تھی، اس کو ہمیشہ اپنے آس پاس گلاب کی ادھ کھلی کچی کلیوں کا ڈھیر سا محسوس ہوتا رہتا...... ہاتھ بڑھا بڑھا کر وہ ان کلیوں کو چھونا چاہتے تو جیتی جاگتی ایڑیاں بن جاتیں اور دھیرے دھیرے دور ہوتی چلی جاتیں۔ یہ لپکتے تو قہقہہ لگا کر کہتیں......

''ہمیں چھوؤ نہیں...... ہماری عبادت کرو...... ہم تو پوجے جانے کے لئے ہی بنی ہیں......

اور یہ کسی انجانی طاقت کے آگے سر جھکا دیتے...... کیا یہ محبت ہے؟...... وہ اپنے دل سے پوچھتے...... دل بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا'' عبادت خانے کے دروازے تو بہرحال اب کھل ہی گئے ہیں اور جیتا جاگتا اس میں داخل ہو گیا ہے۔ عبادت تو کرنی ہی پڑے گی۔ بھلے یہ کفر ہی سہی''

اب تک رفیق میاں کی شوکت سے مڈبھیڑ نہ ہوئی تھی۔ وہ تو اندر ہی گھس رہتیں۔ کھانا لگ جاتا تو اماں بھی ادھر سے آواز دیتیں:۔

''رفو میاں'' کھانا کھا لے بیٹا...... یا پھر حوری تھرکتی ہوئی آتی اور وہیں سے چلائے جاتی...... سب بھائی لوگ کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں ماموں جان...... اجی ماموں جان، چلئے نا بھئی کھانے۔''

پہلے رفیق میاں یوں ہی اٹ چھٹ کر آ جایا کرتے، اور اب گھر میں داخل ہونے پر یوں سنبھل جاتے تھے جیسے عبادت گھر میں داخل ہو رہے ہوں۔ سر جھکا ہوا، آنکھیں نیچی، ہلکے ہلکے قدم...... کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا کہ شوکت نظر آ گئی ہو...... مگر انہیں تو اڑتی خوشبوئیں آپ ہی بتا دیتی تھیں کہ وہ گلاب کس جگہ مہک رہا ہے......

انو میاں کے گود کے بیٹے کا عقیقہ تھا۔ ایسے کام کاج کے دن دو جگہ کھانا نہ پکنا سبھی ایک دستر خوان پر کھانا کھاتے۔ ورنہ جب سے لڑائی ہوئی تھی اس گھڑی سے آج کے دن تک الگ الگ ہی کھانے پکتے اور کھائے جاتے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کے گھر تو کچے کا حصہ بھجوا دیا گیا...... گھر میں تین چار رنگ کے سالن قورمے پکے میٹھا بنا...... پتلی پتلی چپاتیاں۔ کھانا کھانے سبھی بیٹھے...... رفو میاں نے ایک نوالہ منہ میں رکھا اور بے ساختگی سے بولے:......

قسم خدا کی اماں کیا ہی مزے دار قورمہ بنایا ہے؟

اماں شوکت کی طرف سیکھ کر پیار سے مسکرا دیں۔

شوکت عورتوں والے حصے میں کھانا پکا رہی تھی۔ اپنا ذکر اور پھر تعریف کے سلسلے سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں اٹھیں اور سیدھی ان بجلیوں سے جا ٹکرائیں جو اتفاقاً رفیق میاں کی آنکھیں تھیں...... رفیق میاں بری طرح گڑبڑا گئے۔

کھانا حلق سے اترا بھی نہ تھا کہ جلدی سے سامنے سے کھارے کی رکابی ہٹا کر میٹھے کی طشتری کھینچ لی۔

پھر شامت آئی۔ ماں سے اسی لہجے میں لاعلمی میں کہنے لگے:

اماں...... میں سمجھتا ہوں آپ نے اتنی مزے دار فیرنی تو آج تک شاید ہی کبھی بنائی ہو۔’’

اب کے ماں صاف صاف ہنس پڑیں...... اے لڑکے تیری عقل ماری گئی ہے۔

دوپہر سے گھر میں بلور ہے کہ آج کے کھانے شوکت نے پکائے ہیں اور اماں کی تعریف ہو رہی ہے۔ واہ۔

لوگ کہتے ہیں کیسی ہی پتھر دل عورت ہو، مرد کی تعریف سے بہہ جاتی ہے اور بھلا شوکت پتھر دل کب تھی؟

اب کی بار شوکت کی نگاہیں اٹھیں اور...... اب کے...... بجائے آنکھیں ملنے کے یوں ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اتر گئے اور آنکھوں کے راستے سیدھے دل میں اتر کر بیٹھ گئے۔ ہمیشہ کے لئے۔

بے تکے پن سے رفیق میاں اٹھے اور لپکے ہوئے باہر چلے گئے...... بھد سے اپنے پلنگ پر گر پڑے اور اوپر نیچے لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ پلٹ پلٹ کر ادھر ادھر دیکھتے اور گھبرا گھبرا کر آنکھیں بند کرتے اور پھر کھول دیتے۔

کچھ نہ سوجھا تو آئینہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور آنکھوں میں جھانکنے لگے...... سوچا تھا کہ وہاں شوکت ملے گی...... لیکن وہاں تو بس وہ ہی وہ تھے۔

تم کہاں چلی گئیں...... تم کہاں چلی گئیں؟......’’

‘‘میں؟...... میں تو تمہارا ہی ایک روپ ہوں...... میں تم سے الگ کب تھی جو مجھے کھوجنے کی ضرورت پڑی...... اپنی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو...... اگر اپنا ہی عکس نظر آئے تو جان لو کہ وہ تم نہیں...... میں ہوں میں، جو تم میں جذب ہو کر تمہارا ہی روپ دھار چکی ہوں’’......

پلکیں جھپکا جھپکا کر انہوں نے دور دور تک اپنی آنکھوں کی سیر کر ڈالی۔ وہاں ان آنکھوں میں شوکت بہار بن کر پھول کھلا رہی تھی...... پھول بن کر خوشبو مہکا رہی تھی...... اور خوشبو مہکا کر اپنے وجود کو نہلائے بیٹھی تھی۔ میٹھی میٹھی پھوار سے ان کا سارا جسم بھیگ گیا۔

وہ شوکت بڑی نازک تھی...... دبلی پتلی...... سرخ و سفید رنگت...... پیٹھ پر لمبی سی موٹی چوٹی سدا جھولتی ہوئی۔ وہ یوں تو جوہی کی ننھی سی کلی ایسی تھی، مگر اس کی ساری خوبصورتی آ کر ایڑیوں میں جمع ہو گئی تھی...... ایسی کومل کومل گلابی ایڑیاں کہ ایک دن رفیق میاں نے حوری سے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا :۔

‘‘ہاں حوری یہ تیری شکو باجی نے کہیں گلابی رنگ تو گھول کر اپنی ایڑیوں میں نہیں بھر لیا ہے؟’’

حوری ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ لوٹتے لوٹتے پھر اٹھ بیٹھی اور اٹھ کر اندر بھاگ گئی۔ اپنے قہقہوں کو روک کر اس نے بڑی مشکلوں سے پھوپھی سے کہا...............’’

‘‘شکو باجی کچھ سنا؟ ہمارے ماموں جان کہہ رہے تھے’’...... وہ سانس لے کر بولی...... ‘‘کہیں آپ نے ایڑیوں میں گلابی رنگ تو گھول کر نہیں بھر لیا ہے؟’’ ہی ہی...... ہاہا...... ہوہو۔

شوکت نے گھبرا کر اپنے پیروں کو دیکھا...... اپنے بازوؤں کو دیکھا، اپنی آنکھوں میں جھانکا...... اپنی انگلیوں کی سرخ سرخ پوروں کو پتلیوں سے قریب لا کر دیکھا اور پھر ہتھیلیوں میں ایڑیوں کو لے کر دیکھنے لگی۔ پھر وہی سرخی اس کے گالوں میں بھر گئی اور ہنسی اس کے چہرے پر چھا گئی...... ہنستے ہی ہنستے اس نے حوری کی ٹھوڑی پکڑ لی...... ‘‘بتا تو بھلا مجھے ہنسی کیوں آ رہی ہے؟’’

حوری اپنی ہنسی بھول بھلا کر شوکت کے چہرے کو دیکھنے لگی...... پھر جیسے عقل مندی کے انداز سے سر ہلا ہلا کر بولی :

‘‘معلوم ہو گیا جی...... وہ آپ کچے رنگ کے مخمل کی گرگابیاں اس لئے پہنتی ہیں کہ ان کا رنگ چھوٹ چھوٹ کر ایڑیوں میں لگتا رہے...... اور ماموں جان تعریف کرتے رہیں’’......

‘‘اررر......’’ شوکت گھبرا کر بولی...... ‘‘کیسی باتیں کرتی ہو حوری؟ بھلا میری چپلیاں کچے رنگوں کی ہیں۔ توبہ...... توبہ’’......

‘‘پھر آپ کی ایڑیاں گلابی کیوں ہیں؟’’

شوکت نے ہنس کر اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال دیں...... ‘‘اور کل تو یہ پوچھے گی کہ آپ کے گال اتنے سرخ کیوں ہو جاتے ہیں...... آپ کی آنکھیں اتنی گہری کیوں ہیں...... آپ چلتے میں جھومتی کیوں ہیں۔ آپ آئینے میں کس سے باتیں کرتی ہیں؟...... ایسی بے بنیاد باتوں کا بھلا میں کیا جواب دے سکتی ہوں...... اونہہ!!’’

پھر ایک دن یوں ہوا کہ تیسری تاریخ کا کچھ مدھم سا، کچھ چمکیلا سا، زیادہ مدھم، کم چمکیلا چاند، آسمان پر چمک رہا تھا۔ سب لوگ آنگن میں بچھے ہوئے تختوں اور پلنگوں پر لیٹے، بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ...... شوکت کی شادی کا ذکر چل نکلا۔

اماں نے اپنی سمدھن سے پوچھا...... ‘‘کیوں بہن، شکو بی بی کی بات کہیں ٹھہرائی ہے؟’’

بہن کے چہرے پر ذرا ناگواری کے اثرات چھا گئے۔

’’دوئی بہن اس کے باپ سے پوچھو، ہم سے کیا پوچھتی ہو۔ تم سے کیا چھپانا ہے۔ بیس اوپر دو برس کی بٹیا ہوگئی مگر قسم لے لو جو کبھی بھول سے بھی شادی کی بات چھیڑی ہو۔ لکھا پڑھا کر عاقبت خراب کردی ہے...... اب تو یوں آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ صفا کہتے ہیں کہ جب بٹیا کا جی چاہے گا تبھی کریں گے۔‘‘

اماں نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر دیکھا۔

’’دوئی یہ کیا بات ہوئی بھلا؟‘‘...... پھر بولیں...... ’’مگر کوئی لڑکا تو نظر میں ہوگا ہی؟‘‘

’’مجھے تو نہیں معلوم بی......‘‘ پھر ذرا طعنے سے بولیں، ’’کیا پتہ یہ لڑکا ڈھونڈنے کا اختیار بھی بیٹی کو ہی دے رکھا ہو۔‘‘

’’ساری روشن خیالی یہاں آکر اٹک گئی ہے...... صاف تو بولتے ہیں کہ مذہبی کتابوں میں لکھا ہے کہ کبھی لڑکی کی شادی اپنی مرضی سے نہ کرو۔‘‘

اماں اچنبے سے بولی:

’’بہن یہ تو آج تم نے نئی ہی بات سنائی۔‘‘

’’ہاں بہن‘‘...... انہوں نے ایک ٹھنڈا ٹھنڈا طعنہ چھوڑا...... ’’نئے زمانے کے لوگ ہیں، کوئی کیا کہے۔ بی اے تو پاس کر ہی لیا ہے بٹیا نے۔ اب باپ کہتے ہیں ایم اے بھی کروائیں گے۔ اب تک لڑکیوں کے کالج میں پڑھایا...... اب تو لڑکوں کے کالج میں پڑھانا پڑھے گا۔ میں کچھ زبان ہلاتی بھی ہوں تو بولتے ہیں کہ مذہبی کتابوں میں آیا ہے کہ جو بیوی اپنے شوہر کو خوش نہیں رکھے گی، سیدھا دوزخ میں جائے گی‘‘......

پھر تھوڑی دیر کے لئے تیسری کا چاند ایک بدلی کی آڑ میں چلا گیا اور سارے میں صرف چھالیہ کترنے کی چک چک باقی رہ گئی۔ مگر رفیق میاں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو تخت کے اس کونے پر ایک چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ ہلکے سبز رنگ کی مدہم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے رفیق میاں کو جا کر دیکھا...... اچھے خاصے تھے۔ چہرے پر جھری تھی نہ ماتھے پر شکن۔ انگوں میں تناؤ بھی تھا اور بدن بھی گھٹا ہوا نظر آتا تھا اور ہوتا کیوں نا۔ لیکن لہریں مارتے ہوئے سیاہ بادلوں میں یہ سفید سفید سی رہ گزر کہاں سے پھوٹ نکلی تھی۔

میں تمہیں چاہتا ہوں مگر...... مگر...... مگر کے ساتھ اپنے عکس سے مخاطب ہو کر کسی اور کو سنایا...... ’’مگر یہ تم میرے بالوں میں سفید تار دیکھ رہی ہو؟‘‘

’’دیکھ رہی ہوں...... یہ سفید تار نہیں، یہ تو تاروں بھری کہکشاں ہیں۔ اس پر شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ کیا محبت سیاہ بادلوں اور سیاہ چہرے ہی سے کی جاتی ہے۔ وہ تو دل سے کی جاتی ہے۔ پیار کرنے والے، پیار کو سمجھنے والے دل سے‘‘......

رفیق میاں گھبرا کر پلٹے...... اس راہ پر پاؤں دھرتے دھرتے...... قدم قدم چلتے کون ان کے دل کے اس قدر قریب پہنچ گیا تھا کہ اس کی آواز تک سنائی دے رہی تھی...... ملے جلے سبز اور سیاہ اجالے میں انہوں نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھا۔ اپنے دبلے پتلے جسم کو سمیٹے شوکت پردے کے پاس کھڑی تھی...... پردے کو اس نے اپنی پتلی کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا اور ساڑھی کے نیچے سے اس کے گلابی کافوری پیر نظر آرہے تھے اور وہ پردے میں سے چاند ایسا منہ نکالے دھیمے دھیمے مگر مظبوط لہجے میں رفیق میاں سے کہہ رہی تھی:

’’اس پر شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے...... کہکشاں تو راہ...... دکھاتی ہے۔ بھلا کہیں سفید روشن جھم جھماتے ستاروں کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا ہے کہ یہ اجالا کیوں بکھیرتے ہیں، کیوں؟...... کیوں؟......‘‘

رفیق میاں نے آنکھوں کے پٹ کھول دیئے۔

شوکت شرما گئی۔ اس نے دھیرے سے پردہ چھوڑ دیا...... اور گلابی گلابی ایڑیوں کو دھیرے دھیرے زمین پر ٹکاتی، اٹھاتی یوں دھیرے دھیرے چلی گئی کہ جیسے وہ ایڑیاں کانچ کی تھیں کہ ذرا زور سے پاؤں پڑتا اور چیخ چیخ جاتیں۔

ابھی ابھی جہاں ایڑیوں کے نشان تھے، وہاں سجدوں کے نشان ابھر آئے...... رات بھر رفیق میاں کا کمرہ گلاب کی کچی کلیوں سے مہکتا رہا......

عورت جب محبت کرتی ہے تو چاہتی ہے کہ ہر صورت اپنے محبوب کی خوشنودی حاصل کرے...... اس کی محبت کا مرکز اپنی ہی اپنی ذات کو بنالے۔ اس کی راہوں میں اپنی آنکھیں، اپنا دل بچھا دے اور جب محبوب کے قدم پڑیں تو اس کے قدموں تلے بچھی ہوئی زمین رہ رہ کر پکار اٹھے......

’’ہمیں تم سے محبت ہے...... ہمیں تم سے محبت ہے...... ہمیں تم سے...... ہمیں......‘‘

اور یہ بھی تو محبت ہی تھی کہ اب دستر خوان پر ہمیشہ چٹ پٹی نئی نئی چیزیں کھانے کو ملتیں...... جانے کیسے شوکت کو پتہ چل گیا تھا کہ رفیق میاں کو سوئیوں کی فیرنی پسند ہے...... ثابت آلوؤں کا سالن من بھاتا ہے...... چاول کھڑے کھڑے نہ پکیں تو ...... دستر خوان چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت، کنوار پن کی پھٹکار منہ پھوڑ پھوڑ کر بولتی ہے کہ ہم کنوارے ہیں...... ایسے میں جو محبت کی کہیں سے مٹھاس مل جائے تو چہرے پر نور بکھر جاتا ہے...... وہی رفیق میاں تھے، وہی گھر، وہی حالات، وہی خرچے، وہی خرچے کی تنگی...... وہی بھاوج اور ماں کے جھگڑے...... وہی بچوں کی جھڑ جھڑ، پھڑ پھڑ۔ مگر پھر بھی وہ، وہ رفیق میاں نہ رہ گئے تھے۔ کوئی فرق بھلے سے آیا ہو نہ آیا ہو لیکن آنکھیں سدا چمکتی رہتیں، جیسے آنکھیں نہ ہوں، آسمان سے توڑ کر دو ستارے ٹانک دیئے گئے ہوں۔

ایک دن باورچی خانے سے شوکت نکلی تو آنکھیں سرخ تھیں...... آنگن بیچ کھڑی ہو کر اس نے حوری کو پکارا...... ''حوری دیکھ تو میری آنکھ میں شاید بال پڑ گیا ہے۔''

شیشے کی سی نازک ایڑیوں کی مانوس مدھم چاپ سن کر رفیق میاں بھی اپنے کمرے سے نکل آئے تھے۔ حوری بازو میں کھڑی پھوپھی کی آنکھوں میں بال ڈھونڈ رہی تھی کہ اسی دم اسے رفیق میاں بھی اسی دنیا میں چلتے پھرتے نظر آ گئے۔

رفیق میاں کو سامنے دیکھ کر شوکت شرما سی گئی...... ٹالنے کو حوری سے بولی...... ''جانے دے کدھر بھی کھو گیا ہوگا''

حوری شرارت سے بولی...... ''اجی جناب!...... بال کی کیا بات ہے، آنکھوں میں تو بڑے بڑے آدمی کھو جاتے ہیں۔ بال بیچارہ تو اتنا نازک، اتنا باریک ہی تھا''......

''کیا مطلب؟'' شوکت گڑبڑا کر بولی۔

''مطلب یہی......'' وہ ہاتھ نچا کر بولی...... ''کہ ابھی ابھی میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماموں جان آپ کی آنکھوں میں اترے اور دیکھتے ہی دیکھتے کھو گئے۔''

شوکت اس سچی حقیقت کو سن کر پانی پانی ہو گئی۔

رفیق میاں نے بہت...... بہت دھیمے دھیمے کہا:۔

''وہ آنکھیں تو میرا وطن ہیں۔ میں وہیں پیدا ہوا...... میں وہیں پلا...... وہیں بڑھا...... وہیں میں نے زندگی بتائی۔ وہیں رہ کر میں نے محبت کرنا سیکھی۔ وہیں رہ کر میں نے جانا کہ ایڑیوں میں

گلاب کیسے کھلتے ہیں۔ وہیں میرے دل نے نئے انداز سے دھڑکنا سیکھا اور زندہ رہنے کا گر بھی تو میں نے اپنے وطن سے سیکھا...... کاش میں وہیں کھو جاؤں...... یوں کہ پھر کبھی کسی کو نظر نہ آؤں...... کبھی نہیں...... کبھی بھی نہیں...... اور ان پلکوں کے پیچھے میری زندگی یوں ہی خاموش خاموش سی بیت جائے۔''

شوکت نے بڑی مشکل سے پلکیں اٹھائیں، یوں جیسے ان پر ساری دنیا کا بوجھ تھا۔ وہ آنکھیں جو رفیق میاں کا وطن تھیں وہ ان کے سامنے کھلی تھیں...... پلکوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور کوئی بے صدا آواز جیسے خوابوں کی دنیا سے انہیں بلا رہی تھی......

''آ جاؤ...... چھپ جاؤ...... آ جاؤ چھپ جاؤ''......

خدا نہ کرے جو تمہیں جلاوطن ہونا پڑے۔

اور شوکت نے بڑے معنی خیز انداز میں آنکھیں بند کر لیں، یوں جیسے ہمیشہ کے لئے ان دو پتلیوں میں رفیق میاں کو بند کر لیا ہو۔

رات چمک دار تھی، فضا خوشبودار تھی، پھر یہ دل لگتا کیوں نہیں؟ انہوں نے اپنے پلنگ پر پڑے پڑے سوچا۔

میں بوڑھا ہو رہا ہوں، بھلا بوڑھے سے کون پیار کر سکتا ہے؟

میں کر سکتی ہوں...... میں...... جو ایک عورت ہوں اور سہارا دینا جانتی ہوں...... دو آنکھیں ان کی آنکھوں میں جھک آئیں اور دھیرے دھیرے سے بولیں:

''ذرا ان آنکھوں میں جھانک کر تو دیکھو، تمہارے سوا اور کوئی دوسری تصویر یہاں نظر آ جائے تو پھر جو جی چاہے کہنا۔''

اگر وہ آنکھیں شوکت کی تھیں تو پھر واقعی ان میں سوائے رفیق میاں کے اور کسی کی تصویر نہ تھی۔

رات کے سناٹے میں یہ آواز کہیں سے بھی آئی ہو، مگر ہے شوکت کی ہی۔ انہوں نے خوشی اور گہرے اطمینان سے سوچا۔

رفیق میاں نے اپنے ہاتھوں اپنے لئے ایسا راستہ بنایا تھا، کہ کوئی اونچ نہ نیچ، سیدھی سیدھی سڑک تھی۔ بار بار ماں اور بہن نے کہا، اور انہوں نے وہی ایک بندھا ٹکا جواب دیا:

''ناہیں شادی نہیں کروں گا۔''

اور آخر کتنی بار کوئی اصرار کرتا اور جب ان کے سر میں کھلم کھلا سفید بالوں نے راج رجنا شروع کر دیا تو یہ خیال ہی سبھوں کے دل سے مٹ گیا کہ کبھی ان کی شادی بھی ہو سکتی ہے۔ لاکھ وہ سفیدی فکروں اور پریشانیوں کی رہی مگر تھی سفید ہی۔ پھر کون ان کے دل پہ ہاتھ رکھنے چلا تھا۔ اور اب رفیق میاں کا دل اپنے پہلو سے اڑا تو کسی پل قرار نہ آیا۔ منہ پھوڑ کر ماں سے کیسے بولیں۔ کیا صاف صاف یونہی سنا دیں...... ''اماں، میری شادی شوکت سے کرا دیجئے نا۔''

کہنے کو کیا تھا کہہ دیتے۔ مگر ایک تو انہیں یہ خیال آتا کہ اس میں شوکت کی اپنی بدنامی ہوگی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اس کے ابا نے اسے شادی کا پورا اختیار دے رکھا تھا۔ ایسے میں یقینی بات تھی کہ سب کی نگاہیں اس کے دل کو ٹٹولنے لگتیں اور پھر دوسرے یہ کہ انہیں عمر کے اس دور میں پہنچ چکنے کے بعد یہ کہتے ہوئے بڑی شرم محسوس ہوتی کہ..........

''میں سہرا باندھوں گا۔''

ماں بہن لاکھ ماں بہن تھیں، لیکن اگر تڑ سے بول دیتیں کہ جب ہمارے دلوں کے ارمان نکلنے کا وقت تھا اور ہم نے بول بول منہ سکھایا تو کلموہے نے سہرا نہ باندھا اور اب اپنے قدم بہکے ہیں تو کیسے سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اس مخمصے میں رات دن الجھے رہتے کہ اچانک ایک دن اماں ان کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئیں اور ادھر ادھر نظریں دوڑا کر ذرا مطلب بھرے انداز میں بولیں :

''توبہ میلے کپڑوں کا انبار بھرا پڑا ہے، دھوبی کو کیوں نہیں دیئے؟''

''ارے''...... انہوں نے کھونٹیوں کی طرف دیکھا اور ذرا شرمندہ ہو کر بولے، ''ایک بات دھیان میں آئے اور اسی دم کر ڈالوں تو اچھا، ورنہ کام کاج میں دوسرے ہی لمحے بھول بیٹھتا ہوں۔''

اماں نے بڑے غور سے دیکھا...... ''ارے میاں، اپنے کمرے کی گت تو دیکھ ذرا...... یہ لے، یہ کچرا، یہ دھول، یہ پھٹے پھٹائے کاغذوں کے انبار۔ تجھ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ باقر سے کہہ کر ذرا جھاڑو پھروا لے۔ آخر تیرے مقدموں والے آتے ہوں گے تو کیا منہ پر تھوک کر جاتے ہوں گے۔''

رفیق میاں کے چہرے پر شرمندگی چھا گئی۔

''بولوں بھی تو ایک بار کے کہے میں سنتا بھی نہیں ہے اماں...... اسے بار بار یاد دلانا پڑتا ہے اور یہاں کسے اتنی فرصت ہے اور جب نوکر ایسا کم بخت ہو تو''......

تو اماں نے بات کاٹ دی...... ''یوں ناک بھوں چڑھاتا ہے تو سیدھے سے شادی کیوں نہیں کر لیتا...... کہ آپ ہی وہ سارے گھر کی دیکھ بھال کر لے گی۔''

رفیق میاں کے دل کا وہ چراغ جو اتنے دنوں سے مدہم مدہم سی لو دیتا تھا آج پوری چمک دمک سے جل اٹھا۔

''اب؟......'' وہ ہنسے...... ''کون بدنصیب اس بوڑھے کا ہاتھ تھامنا پسند کرے گی۔''

اماں نے غصے سے دیکھا۔ ''اونہہ بوڑھا۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ مرنے کے قریب ہوں۔ شرم نہیں آتی ذرا سی۔ تیری اور انو کی عمروں میں ایسا فرق ہی کتنا ہے۔ یہ سفیدی فکروں نے عنایت کی ہے۔''

رفیق میاں ہنسے۔

''دیکھو میاں میں ایک عورت کے دل کی بات جانتی ہوں۔ عورت کی فطرت میں خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ اسے خود پالنے پوسنے اور دیکھ ریکھ کرنے میں مزہ آتا ہے۔ یہ تو اللہ کا بنایا ہوا طریقہ ہے میاں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اولاد کو اللہ میاں عورت کے پیٹ کے بجائے مرد کے پیٹ سے پیدا کرتا۔''

رفیق میاں نے ماں کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

''عورت اسی مرد سے زیادہ محبت کرے گی...... جس مرد کی خدمت کا اسے زیادہ موقع ملے گا، اور پھر یہ تو دلوں کی بات ہے...... بیٹا عورت کا دل تو بس محبت کرنا جانتا ہے۔''

رفیق میاں کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ اماں کا دھیان کدھر ہے۔ آخر یہ تو وہ بھی دیکھتی ہی تھیں کہ بی شوکت نے آئے گھڑی سے چولہا چکی سنبھال لی تھی...... سب گھر والوں کا ثابت آلوؤں کا قورمہ اور کھڑے چاول کھاتے کھاتے ناک میں دم آ گیا تھا۔ اماں بی کے دانت روزانہ شکایت کرتے لیکن چپاتیاں ویسی ہی ہلکی اور پتلی پکتیں کہ کوؤں کے کانوں میں باندھ دو تو آسانی سے لے کر اڑ جائیں...... رفیق میاں کو مٹھاس زیادہ پسند نہ تھی۔ لے دے کے ایک سوئیوں کی فیرنی پسند تھی۔ سو آئے دن ایسی پھیکی فیرنی کھاتے کھاتے حلق میں پھندے پڑنے لگے تھے۔ اوپر سے موئی کڑکڑی، شکر چھڑک کر کھاؤ تو کھاؤ ورنہ وہ پھیکا گولہ نصیب میں بندھ کر رہ گیا تھا...... بچپن سے رفیق میاں کو گلابی رنگ پسند تھا۔ گھر پر جتنے بھی دروازے تھے اب سبھوں پر گلابی سر سر کرتے

پردے جھولتے رہتے تھے...... اب اماں کے دیدے پٹ تو نہیں تھے۔ ایسی باتوں کو دیکھ کر تو کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ پانی کا بہاؤ کس طرف کو ہے؟...... یہ ندی چاہے نکلی کہیں سے بھی ہو مگر بل کھاتی لہراتی آ کر رفیق میاں ہی کے قدموں میں سر پٹختی تھی۔ اور رفیق میاں بھی لاکھ سادھو مہاتما تھے کہ کسی پر آج تک اچھی بری نظر نہیں پھینکی تھی۔ اب ایسے دیوانے کائے سے ہو گئے تھے کہ بات تو کرتے حوری سے اور نگاہیں کھوجتی رہتیں شوکت کو...... بات کرتے میں حوری کے بجائے شوکی، شوکی نکل پڑتا۔ اور حوری ایسی تیز طرار کہ چار لوگوں کی موجودگی دیکھے نہ جھجکے، صفا بول پڑتی۔

“میں نے کہا جناب...... میرا نام حوری ہے، حوری۔ شوکی آپ کی وہ بیٹھی ہیں وہاں باورچی خانے میں آلو ابالتی ہوئی۔”

ہمیشہ تو رفیق میاں بڑھ بڑھ کر باتیں بنایا کرتے تھے، مگر آج ان کی زبان کو اماں کے آگے چپ لگ گئی تھی۔ بس بیٹھے بیٹھے منٹ منٹ کو ماں کے منہ کو تکتے رہتے......

“تیری مرضی ہو تو بول دے...... ورنہ پھر تو یہ لوگ چلے جائیں گے۔ وہ تو شوکت کا اصرار تھا کہ چھٹیاں گزارنے بھابھی کے پاس چلیں...... تو بہن آ گئیں۔ وہ کدھر، ہم کدھر”......

“تو آپ یہ غضب کر دیں گی کہ اپنے گھر بیٹھ کر ہی بات چھیڑ دیں...... نہیں اماں بی نہیں برا لگے گا...... جس گھر میں بیٹی آئی تھی وہیں بات چھیڑ دی...... آپ جانتی ہیں پرانے لوگ ایسی باتوں کا برا مانتے ہیں...... آپ ان کے یہاں سے جانے کے بعد ان کے ابا کو خط کیوں نہ لکھ دیں؟......” رفیق میاں معصومیت سے یہ سب کچھ سناتے رہے۔ وہ بھول گئے کہ ان کے بات کرنے کے انداز نے اماں پر ان کی محبت کا بھید کھول کر رکھ دیا ہے۔

شوکت کے جانے میں تین چار دن باقی رہ گئے تھے...... اس کے قدموں کے ساتھ ان کا دل بھی گھومتا پھرتا۔ مسکراہٹ ان کے روئیں روئیں سے پھوٹی پڑتی۔ کیسے سدا بہار گلابوں سے ان کا باغ مہکنے والا تھا۔

سردی کے دن تھے......

آتش دان میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں چٹختیں یا پھر انگیٹھی میں سرخ انگارے دہکتے...... پان چبائے جاتے...... کافی اور چائے کے گھونٹ بھرے جاتے۔ رات گئے تک باتیں ہوتیں...... ایسی ہی ایک رات میں آپا بی کمرے کے گرم ماحول سے اٹھ کر باہر کوئلے لانے گئیں...... اندر گرمی تھی...... باہر سردی نے جیسے ان کا سر جکڑ لیا...... واپس کمرے میں آئیں تو سر پکڑے ہوئے۔ اماں

نے دیکھا تو ذرا فکرمندی سے بولیں:

“کیا ہوا بیٹی؟......”

“کچھ نہیں اماں، ایسے ہی اچانک سر میں درد ہونے لگا ہے۔ جنے ہوا لگی یا کیا ہو گیا۔ ابھی ابھی تو بھلی چنگی تھی۔”

ماں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا، جو ٹھنڈا ہو رہا تھا...... رضائی اوڑھا کر لٹا دیا۔ صبح سے وہ گھر کے کاموں میں الجھ رہی تھیں...... کبھی کھلے آنگن میں بیٹھ کر گیہوں پھٹکے...... تو کبھی چاول صاف کیئے۔ برتن دھو دھلا کر رکھے تو مرچوں کے ڈنٹھل توڑنے بیٹھ گئیں...... کمر میں سخت درد ہونے لگا...... گھنٹے بھر میں بخار تیز ہو گیا۔ سارا گھر آپا بی کی تیمارداری میں جٹ گیا...... سوائے زہرہ دلہن کے...... وہ ادھر قیامت گزر جائے تب بھی اپنے دالان سے نہ نکلتیں۔ برائی کا بیج جو اتنے زمانے پہلے دل کی زمین میں بویا گیا تھا، اب پھل پھول کر ایک تناور درخت بن گیا تھا...... ان کو آ جا کے اس بات پر غصہ تھا کہ میں تو میاں والی ہو کر بھی خالی ہاتھ رہتی ہوں اور آپا بی...... سارے گھر پر راج رجتی پھرتی ہیں۔ آٹھ چار دن میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ سارے گھر میں پھر ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن گزر گیا......

دوسرے دن بھی بخار میں کمی نہ ہوئی۔ جسم تھا کہ پھنکا جا رہا تھا...... سانس میں آنچ کی سی لپیٹیں تھیں...... آنکھیں سرخ انگارہ ہوئی جا رہی تھیں......

ڈاکٹر آیا...... دوا، انجکشن، سبھی، کر کے گیا، مگر بخار اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ نہ آنکھوں کی سرخی کم ہوئی...... سر تھا کہ درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا......

حوری ماں کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔

“اف...... آپا بی درد کے مارے کراہیں۔”

“امی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟”

ماں نے آنکھیں کھولیں۔ دل رکھنے کو ذرا مسکرائیں۔ “اچھی خاصی ہوں بٹیا، بس سر میں درد بہت ہے۔”

“آپ بستر پر پڑ گئی ہیں امی تو سارا گھر ہمیں اداس اداس نظر آ رہا ہے۔” وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔

‘‘مجھے ہوا ہی کیا ہے؟......وہ بچوں کا دل بڑھانے کو بولیں......’’

‘‘ذرا سر میں درد زیادہ ہے وہ ابھی اچھا ہو جائے گا۔’’

‘‘بام مل دوں امی؟’’

‘‘شیشی تو خالی پڑی ہے......رات ہی ختم ہو گیا تھا۔ رہنے دو یونہی ٹھیک ہو جائے گا۔’’

‘‘ٹھہریئے میں زہرہ ممانی سے پوچھتی ہوں، ان کے پاس شاید ہے’’......

آپا بی منع ہی کرتی رہیں اور وہ دالان کی طرف دوڑ بھی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ادھر سے تیز تیز آوازیں آنے لگیں۔

رفیق میاں نے سر اونچا کر کے سننے کی کوشش کی......آواز زہرہ دلہن کی تھی۔

‘‘اے ہے......درد ورد خاک بھی نہیں......اب وہ شوکت بیگم چلی جا رہی ہے نا......سوچا چولہا چکی پھر نصیبوں میں آ رہی ہے تو کیوں نہ بیمار پڑ جاؤں کہ ادھر میرے گلے سارے گھر کی مصیبت آ جائیں......’’

حوری کی غصے بھری آواز آئی......‘‘ذرا چل کر خود ہی دیکھ لیجئے نا، مارے درد کے تڑپ رہی ہیں۔’’

‘‘اے بی بی درد کی نہ کہو......درد آج تک کسی کو دکھائی دیا ہے؟ بخار کہو تو ایک بات بھی ہے۔’’

‘‘بخار اور کیسا ہوتا ہے، جسم تو جلا جا رہا ہے۔’’

‘‘سر سے پاؤں تک رضائی اوڑھ کر جسم تپا لیا اور بخار کا نام بدنام......ہونہہ......’’

حوری تیز آواز سے بولی......‘‘ذرا سا بام مانگا تو ستر باتیں سنا ڈالیں......تھو ہے......بڑے ماموں جان کی کمائی پر اتنی کنجوسی؟......اور جو خود کی کمائی......’’

ابھی اس کی بات منہ کی منہ میں ہی تھی کہ دھن دھن کی آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی گرجدار ڈانٹ......‘‘بالشت بھر کی چھوکری اور زبان اتنی بڑی۔ نکل یہاں سے بدتمیز کہیں کی اور خبردار ادھر کے دالان میں کبھی پاؤں بھی دیا۔ ٹانگیں چیر ڈالوں گا کم بخت کی۔’’ آواز انو میاں کی تھی۔

حوری سرخ سرخ آنکھیں اور بجھا بجھا چہرہ لئے سسکتی ہوئی آ کر بڑے ماموں سے لپٹ گئی۔

‘‘کیا ہوا بی بی، کیوں روتی ہے حوری؟’’

حوری نے ہچکیاں لے لے کر روتے روتے سنانا شروع کیا۔

‘‘ماموں جان......ماموں جان......ہم ذرا امی کے لئے بام مانگنے گئے تو زہرہ ممانی نے سو

باتیں سنا ڈالیں اور غصے میں آ کر ہم نے کوئی جواب دے ڈالا تو چھوٹے ماموں نے آ کر چار چھ تھپڑ مار دیئے’’......وہ روتے روتے اور زور سے ان سے چمٹ گئی اور بولی......‘‘اچھا ہوا آپ نے شادی نہیں کی ورنہ بڑی ممانی کی باتوں میں آ کر آپ بھی ہمیں چھوٹے ماموں کی طرح مارتے......ہمیں ڈانٹتے......پھر کوئی بھی ہمیں پیار کرنے والا نہ ہوتا......زہرہ ممانی بے حد بری ہیں،......اچھا آ......’’

وہ سنہری چراغ جو زندگی بھر کے اجالوں کا امین تھا، حوری کے آنسوؤں سے اسی دم بجھ گیا۔ سارے میں اندھیرا اچھل گیا اور رفیق میاں اسی لمحے میں اسی برس کے بوڑھے بن گئے۔

جھریوں بھرا ہاتھ وہ حوری کے سر پر رکھ کر بولے :۔

‘‘مت رو بیٹی مت رو۔ میں تو تجھ سے محبت کرتا ہوں نا۔ میں تو تیرا اچھا ماموں ہوں نا......میں نے تو کبھی’’......

برآمدے میں ہوا کے سرد جھونکے آ رہے تھے......اندر کمرے میں شوکت اپنی بجلی بھری نگاہوں سے رفیق میاں کو تاک رہی تھی......اک دم رفیق میاں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ تھام لیا تھا، کانپتی ہوئی آواز میں بولے :

‘‘اماں یہ دروازہ بند کر لیجئے’’......

◆

جھوٹن

''حرامزادے پاواں دباریا کی مذاخ کرریارے؟ بڑے سرکار نے زور سے لات ماری اور کلوا ایک لڑھکنی کھا کر دور جا گرا۔

''ہاتھاں کا دم کائے سے چلا گیا؟ حرام خوروں کو کتا بھی کھلاؤ پلاؤ۔ خون میں جو مستی ہور کام چوری کی عادت ہیں سو ہے، اٹھ ذرا زور دے کر دبا۔

کلوا اپنی مٹھی بھر ہڈیاں کو سمیٹتا سہلاتا اٹھا اور پھر بڑے سرکار کے شان دار بستر پر ڈرتا، سہتا چڑھ گیا، آج اس کے ہاتھ پاؤں واقعی کام نہیں کر رہے تھے۔ اسے ان میں دم ہی محسوس نہیں ہور ہا تھا۔ پیٹ میں کچھ ہو تو انسان میں طاقت بھی آئے۔ یہاں تو زندگی کا طور ہی نرالا تھا۔

ڈیوڑھی کام کاج کرنے والوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک تو انائیں تھیں، جو غریب، مگر شریف گھرانوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائی جاتی تھیں۔ تا کہ نومولود پاشا لوگوں کو دودھ پلائیں...... ان کی چاندی ہی چاندی تھی۔ بیگمات بیبیوں کا سا، بلکہ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر کھانا ملتا۔ تا کہ نئی نسل اچھی طرح پروان چڑھے اور بچوں کو دودھ کی کمی نہ رہے۔

دوسرے درجے پر مامائیں تھیں جو مطبخ کی کرتا دھرتا تھیں۔ پہلے ان ہی کے ہاتھوں سے ہو کر کھانا پاشا لوگوں تک پہنچتا تھا۔ چکھتے چکھتے ہی اتنا اڑا جاتیں کہ پیٹ بھر جاتا۔ اور جو یہ نہ ہوتا تو چرا چرو کر پیٹ بھر لیتیں۔

تیسرے نمبر پر اوپر کے کام کاج کی چھوکریاں اور چھوکرے مابلی، تمبولی ...... چوکیدار اور چاؤش آتے تھے۔ جن کا کھانا ڈیوڑھی ہی سے ملتا تھا۔ ان کا کھانا کھٹی دال، چاول، سبزی پر مشتمل ہوتا۔ بڑی سرکار کھانا بٹنے کے وقت خود آ کھڑی ہوتیں...... وہ اچھے خاصے چمچوں کو جن میں ذرا بھی گہرائی ہوتی، ٹھونک پیٹ کر سیدھا کرا لیتی تھیں کیوں کہ ڈونگے اور گہرے چمچوں میں زیادہ سبزی اور دال چلی جاتی ہیں اور خواہ مخواہ اناج کی بربادی ہوتی ہے۔ اب یا تو الٹے چمچ سے کھانا پروسا جاتا یا ان ٹھونکے پٹے چمچوں سے...... بہر حال پیٹ تو سب کا پل ہی رہا تھا۔

اب چوتھے نمبر پر سارہ مصیبت ان اوپر کے کام کرنے والے چھوکروں کی تھی جو مرادنے میں محض ''سوکھے'' پر نوکر تھے۔ دو روپے کلدار ان کی تنخواہ ہوتی کھانا انہیں اپنے گھر پر جا کر کھانا پڑتا۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ ڈیوڑھی کے ہنگاموں میں چھٹی مل بھی نہ پاتی اور کام کرتے کرتے انہیں ایسی زور کی بھوک لگتی، کہ آنتیں الٹ الٹ کر منہ کو آنے لگتیں اور گھر جا کر بھی کون سے ترتراتے پراٹھے، پلاؤ اور میٹھے ان کے استقبال کو موجود ہوتے۔ وہی کھٹی دال چاول جو انہیں شاید صدیوں سے ورثے میں ملا ہوا تھا......

کلوا اس لحاظ سے بڑا خوش نصیب تھا کہ بڑے سرکار کے منہ چڑھا ہوا تھا...... منہ چڑھا ان معنوں میں کہ ان کے بستر کا راز دار تھا۔ ایک سے ایک طرحدار چھوکری اس نے لا کر بڑے سرکار کے بستر پر ''نون غنہ'' بنا دی تھی...... اور بڑے سرکار کو اس کی اس خوبی کا پتہ بھی نہ چلتا اگر ایک دن وہ اسے زنان خانے میں جا کر پان لانے کو نہ کہتے۔ اب پاندان پر تو مشتری حکمران تھے۔ جسے چاہے دے اور جسے چاہے دھتکار دے۔ اور ایسی حرافہ کہ کچھ پوچھو نہیں۔ اس لئے کلوا ڈرتے ڈرتے کان کھجا ''پاشا'' پان لانے کا آپ حمید کو بولو نا......''

''وہ کائے کو''؟ نواب صاحب نے غصے سے کہا ''تیرے ہاتھاں مہندی میں لپٹے کیا؟ اب کی بار کلوا کان اور سر دونوں کھجا کر بولا۔ نہیں پاشا ویسی بات نہیں۔ وہ مشتری ہے نا، انے......'' وہ چپ رہ گیا۔

''کیا کرتی مشتری؟ بڑے سرکار چڑ کر بولے۔

پاشا......'' وہ منمنا کر بولا۔ ''وہ نمبر ایک کی چھنال ہے۔ انے میرا ہاتھ لے کو اپنے سینے پر رکھ لیتی۔'' پھر وہ بڑے معصوم لہجے میں شرما کر بولا۔ ''ہور پاشا مولبی صاحب بولے کے شریف مرداں بس اپنی بیوی کے سینے کو ہاتھ لگانا، انے تو غیر ہوئی نا''......؟

بڑے سرکار کو اس وقت نہ مولبی صاحب سے غرض تھی نہ ان کے وعظ سے...... ان کے تصور میں جگمگاتی ہوئی مشتری گھوم رہی تھی جو اتنی بے باک تھی اور کمبخت زنان خانے میں چاکری کر رہی تھی۔

پھر کلدار ایک...... پورا ایک روپیہ، یعنی آدھے مہینے کی تنخواہ پوری کلوا کے ہاتھ میں آ گئی۔ یعنی

تنخواہ کے علاوہ، بدلے میں وہ مشتری کو پٹا کر مردانے تک رات کے اندھیرے میں لے آیا اور رات کے اندھیرے میں ہی تو چاند جگمگاتا ہے۔

بس اس کے بعد تو یہ معمول ہوگیا کہ کلوا بڑے سرکار کا مشیر خاص بن گیا۔ خانہ باغ سے لے کر معظم جاہی مارکیٹ سے لے کر، چار مینار کے اطراف سے لے کر، کوٹلہ عالی جاہ سے لے کر، میر عالم کومنڈی سے لے کر، پنچھی براق سے لے کر محبوب کی مہندی تک، کوئی جگہ ایسی نہ بچی جہاں کے پھیرے اس نے نہ مارے ہوں اور بڑے سرکار کی خدمت اقدس میں ہر رات ایک نیا چاند طلوع نہ کر دیا ہو......

وقت اور بیوپار سلیقہ بھی سکھا دیتے ہیں۔ اب وہ محض ایک روپے کے عوض ایک چاند سپلائی نہ کرتا۔ کسی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تو دو سے لے کر پانچ روپے تک بھی بنا لیے۔ کبھی دس تک بھی نوبت پہنچی، کبھی کبھار اس سے بھی زیادہ لیکن رہا وہ ہی ڈیوڑھی کا ‘‘باہر کا پوتا’’۔ سارا پیسہ وہ اضلاع میں رہنے والے ماں باپ کو بھجوا دیتا، جن کی حقیر سی زمین مستقل قرضوں میں پھنسی ہوئی تھی...... کھانا کلوا کا ابھی تک اس کے ذاتی گھر میں ہی ہوتا، جہاں اس کی بیوی کھٹی دال، موٹا چاول پکا کر اس کا راستہ دیکھتی ہوتی۔ لیکن بڑے سرکار کا مشیر خاص بننے کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا آئے دن اسے رات کے کھانے میں سے بچی ہوئی انواع واقسام کی نعمتوں سے بھرا طشت یوں ہی مل جاتا، بڑے سرکار تھے دل والے...... شراب، کباب اڑانے کے بعد ویسے بھی انسان کو کتنی بھوک باقی رہ جاتی ہے۔ جنت کی سی نعمتوں سے بھرا طشت خاص الخاص بڑے سرکار کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا...... کیونکہ نشے کے مارے ان کے لئے اپنے آپ چلنا بھی دوبھر ہو جاتا۔ یوں ہی تھوڑا بہت ٹونگ کر کھلانے والے خادم سے کہتے :

طشت واپس نکو لے جاؤ...... انے کلوا بیٹھا ہے باہر، اس کو دے دیو...... یہ جھوٹن اس کا اچ حصہ ہے......’’

کھلانے والا خادم اس عنایت پر جل بھن کر خاک ہو جاتا اور اپنے جی کی جلن مٹانے کے لئے باہر بیٹھے ہوئے کلوا سے پکار کر کہتا...... ‘‘یہ لے جھوٹن کھا کو برتن خالی کر کو جلدی سے دے دے میرے کو......’’ وہ ‘‘جھوٹن’’ پر زیادہ زور دیتا۔

لیکن نعمتوں سے بھرے ہوئے خوان اسی صورت میں کلوا کو ملتے تھے جب بڑے سرکار کہیں مدعو نہ ہوتے، جس دن وہ کہیں دعوت پر تشریف لے جاتے یا جس دن ان کی طبیعت سست ہوتی اور

وہ زنان خانے میں کہلوا دیتے کہ آج کھانا نہ بھجوایا جائے تو کلوا کی میت اٹھ جاتی۔ دن بھر کا بھوکا پیاسا، نہ ہاتھوں میں دم، نہ انگلیوں میں جان، بس یوں ہی ہل ہل کر برائے نام پاؤں دبائے جاتا۔ اس طرح کہ بڑے سرکار کے پیروں پر تو کم وزن پڑتا اور کلوا خود اپنے جسم کو زیادہ جھکولے دیتا رہتا اور اسی جھکولے میں غصے سے بھرے ہوئے سرکار کی ایک آدھ لات ایسی کراری پڑتی کہ کلوا مسہری سے دھپ سے نیچے جا گرتا، دوبارہ اپنے آپ کو سمیٹتا اور پائینتی پر چڑھ جاتا۔

ایسی ہی لات اس کے آج پڑی تھی، مگر آج جو سرکاری نے اس کے لات ماری، تو اس میں پاؤں اچھی طرح نہ دبانے کی سزا کم اور کوئی اچھی سی لڑکی نہ ڈھونڈ لانے کی سزا زیادہ تھی۔ اتنے دنوں سے مسلسل یہ ہو رہا تھا کہ روز ایک نئی لڑکی آتی۔ مگر اتنی بہت سی نئی لڑکیاں آخر آئیں کہاں سے؟ حیدرآباد دکن کا ایک بڑا مشہور سبزی ترکاری کا بازار تھا، جسے عرف عام میں ‘‘میر عالم کی منڈی’’ کہتے تھے۔ لڑکیوں کی بھی ایسی ہی کوئی منڈی ہوتی تو کیا بات تھی۔ بس گئے، پیسے دیئے اور بیل گاڑی بھر لڑکیاں تلوا کر لے آئے۔ لیکن لڑکیاں تو جناب ڈھونڈ ڈھانڈ کر حیلے بہانوں سے، روپے، پیسوں کا لالچ دے کر ہی لائی جا سکتی تھیں اور وہ بھی ایسی صورت میں جب ان کا وجود ہو، جتنے پتے ٹھکانے معلوم تھے، وہاں کی خوبصورتیاں بستر کی زینت بنائی جا چکی تھیں۔ اور ادھر نواب صاحب کا جسم ٹوٹا جا رہا تھا۔ ناگنوں سے ڈسوانے کی ایسی لت لگ چکی تھی کہ گھر کی بیوی اب پھس پھسی معلوم ہونے لگی تھی، ویسے بھی وہ اس طرح سوچتے تھے :

‘‘دنیا کا آنے عجیب وغریب دستور ہے، کپڑا پرانا ہوتا، دل سے اترتا، آپ کسی بھی بھی دے دیتے۔ کوئی کچھ نئیں بولتا، جوانی پرانی ہوگئی، آپ پھینک دیتے یا دوسری خرید لیتے، کوئی کچھ نئیں بولتا، ایچ کھانا کھائے کھاتے آپ کا دل بھر جاتا آپ بول کو دوسری ہانڈی پکوا کر کھا لیتے، کوئی کچھ نئیں بولتا، ہور تو ہور میں سال کے سال ہاتھ کی گھڑی بدل دیتا، کوئی کچھ نئیں بولتا...... پن آپ ذرا بیوی سے اکتا جاتے ہور چھوکری باندی سے دل بہلانا چاہتے تو ساری دنیا ناماں رکھتی۔ یہ دنیا بڑی عجیب وغریب ہے......’’ اور اس عجیب وغریب دنیا کا چلن بدلنے اور نئی ریت قائم کرنے کے لئے ہی وہ روز ایک نئی تبدیلی کے خواہاں تھے۔

اور آج کے غصہ کی وجہ ہی یہ تھی کہ سرکار کا حکم تھا کوئی نوی چیز ہونا۔’’

پاؤں ذرا سمیٹ کر نواب صاحب نے ذرا نرمی سے پھر بات شروع کی۔’’

ہورے تو روپے پیسے کے مارے تو پیچھے نئیں ہٹ ریا......’’؟

اونگھتا ہوا کلوا ایک دم چوکنا ہوگیا، وہ کاروبار میں منجھ چکا تھا، سمجھ گیا، چوٹ لگانے کا وقت اور موقع یہی ہے۔ بظاہر بے پروائی سے بولا :

’’جی ہو پاشا، آپ سچی سمجھے، مگر میں آپ سے اس واسطے نئیں بولا کہ آپ نئیں تو سمجھتے کہ میں اچ خرد برد کر ریا......‘‘ پھر ذرا رک کر کہنے لگا......’’پاشا اس ماں پچیس روپے کلدار مانگ رئی تھی۔‘‘

بڑے سرکار ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئے......پچیس روپے ؟ ایسی کونسی خوہ خاف کی پری ہے اُنے ؟‘‘

کلوا پر چانے کی انداز سے بولا۔ ’’جی ہو پاشا‘‘ کوہ خاف کی پری اچ ہے اُنے نئیں پری ویسی نکلی تو کلیم الدین سے پلٹ کر میرا نام کلوا رکھ دینا‘‘......پھر ذرا آگے جھک کر ادھر ادھر دیکھ کر بے حد رازداری سے بولا......’’پاشا، کبھی لال مٹی کا کورا برتن دیکھے آپ؟ پانی پڑتے اچ کیسا سن سے بولتا۔ بس ایسا اچ کورا برتن سمجھ لیو پاشا......سن، سن......‘‘

کچھ ایسے انداز سے کم بخت نے نقشہ کھینچا، بڑے سرکاری کی رگ رگ سن، سن کرنے لگی، تڑپ کر کھڑے ہوگئے۔ اچکن کی جیب سے کھن کھن کھن کر پچیس روپے نکالے اور کلوا کی طرف اچھال کر بولے......

’’جا کو بس ابی ابی لے کو آ جا وہ چھوکری کو......‘‘

کلوا روپے دونوں مٹھیوں میں دبا کر تیزی سے نکلا اور برق رفتاری سے بھاگتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا۔

’’سکو......اگے او سکو۔ کاں مر گئی ؟‘‘

حواس باختہ سکینہ سامنے کے دالان میں نکل آئی......’’کائے کو اتا چلائے رئیں۔‘‘ ’’اگے کھانا کھائیں گی؟......مرغا، بریانی، ڈبل کا مٹھا، دہی کی چٹنی، کش مش والے نان......‘‘

’’چچ، چچ، چچ......‘‘ سکینہ افسوس سے بولی۔

’’بھوک کے مارے سچ مچ جی تمے پاگل دیوانے بن گئے۔ پن میں بھی کیا کروں، آج تو دال چاول کو بھی پیسے نئیں تھے، فاخہ اچ سمجھو......‘‘

’’اگے فاخہ نئیں......دعوت بول، دعوت......دیکھ یہ روپے......‘‘ اور اس نے روپے دالان میں اچھال دیئے......

سکینہ پاگلوں کی طرح روپیوں پر لپکنے لگی۔ ایک دم کلوا اسے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر کہنے لگا......’’بس پہلے ایک چھوٹا سا کام کردے میرا، پھر یہ سارے روپے اپنے سال بھر کو پورے پڑ جاتے اتے تو۔

’’کیا کام ہے؟ جلدی بولو نا۔‘‘ سکینہ خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے بولی۔

کلوا نے محراب میں ٹھونسے ہوئے کپڑوں میں جھٹ سے ایک ململ کا سفید کرتا نکالا اور اپنے ہاتھوں سے سکینہ کے جسم پر سے میلا کرتا گھسیٹ کر اتارنا شروع کر دیا۔ وہ چلائی بھی......’’اگے اگے، یہ کیا کرتے جی تمے؟ بے شرم کدھر کے۔ کیا میرے کو کپڑا پہننا نئیں آتا ؟‘‘......لیکن اتنی دیر میں کلوا اس کا کرتا اتار، قدرت کی صناعی کی داد دینے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

’’سکو......تو مال ہے، سچی تو مال ہے......تو پچیس روپے کے اچ لائخ ہے، چل جلدی کر......‘‘

پھر اس نے مبہوت کھڑی سکو کو اپنے ہی ہاتھوں کرتا پہنایا، دوپٹہ اڑھایا، اور گھسیٹتا ہوا لے چلا۔

بڑے سرکار کی جو نظر اٹھی تو اٹھی ہی رہ گئی......غریبی جب ململ کا کرتا کسی غریب کو پہنا دیتی ہے تو نوابوں کو بھکاری بنا دیتی ہے۔ بڑے سرکار ایک بھکاری کی طرح اسے تکے جا رہے تھے......گریبان تک جو بٹنس پٹی لگی ہوئی تھی اس میں ہلکی سی گلٹ کی زنجیر میں بجنے والے بٹن جگمگا رہے تھے۔ اور زنجیر اور بٹن کے دائیں اور بائیں گلابی کٹوریوں میں جیسے کھیر بھری رکھی تھی، جسے چاٹنے کے لئے بڑے سرکار بے قرار ہوئے جا رہے تھے۔ انہوں نے فاقہ زدوں کے انداز سے کلوا سے مڑ کر کہا، ’’پچیس روپے تو بہوت بھی بہوت کم بولا تمہارے تو......پچیس روپے تو فخط اس پوسے وار کو پھینک دینا۔‘‘

روتی دھوتی سکینہ باہر نکلی تو کلوا وہیں جھاڑیوں میں دبکا بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھگاتے ہوئے ڈیوڑھی سے باہر لے آیا۔ ایک ہاتھ سے رکشا روک کر اس نے نامپلی اسٹیشن کے ایک بڑے سے ہوٹل کا پتہ دیا، جو رات گئے تک کھلا رہتا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے مرغی، بریانی، میٹھے، دہی کی چٹنی، نان۔ ایک سے ایک بڑھیا چیز کا آرڈر دے ڈالا۔ بیرا ایک ایک چیز لا کر چنتا گیا۔ اب پہلی بار اس نے نظریں چرا کر سکینہ کی طرف دیکھا۔

’’رونے کو تو ساری رات پڑی ہے، بلکہ ساری زندگی پڑی ہے گے۔ ذرا سن پہلے پیٹ بھر کر

کھانا تو کھالے۔ تیری اچ تو کمائی ہے۔“

سکینہ نے پہلے تو اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ پھر پاس پڑا ہوا چمچہ اٹھا کر تڑاتڑ زور زور سے اس کے سر پر مارنا شروع کیا۔

”اگے اگے...... یہ کیا کرتی ہے؟ اگے دیکھنا تو کب سے مرغے کی خوشبو بھی نئیں سونگھی ہوئیں گی۔ بریانی کا مزہ کیسا ہوتا، یہ بھی تیرے کو یاد نئیں ریا ہوئیں گا...... پر اب دیکھنا۔ دیکھ دیکھ ! کیسا بہوت سا کتا مزے دار کھانا ہے۔ تو بھی تو صبو سے بھوکی اچ تھی نا ؟“

چمچہ چھوڑ کر سکینہ نے کھانے کی طرف دیکھا اور اس کی بھوک اسے ڈسنے لگی۔ اس نے دیوانوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے منہ میں بیک وقت کئی کئی چیزیں ٹھونسنی شروع کر دیں۔

کلوا کا پروگرام سوچا سمجھا تھا۔ سال بھر کی تنخواہ ایک ہی ساتھ مل گئی تھی، بیوی کی عزت گئی اس کا اسے دکھ ضرور تھا۔ لیکن سوکھے پیٹ نے اسے جواز بھی سمجھا دیا تھا۔

”اتے زمانے سے میرے ساتھ سوتی تھی، بس ایک رات بڑے سرکار کے ساتھ سوگئی تو کون ہیرے موتی جھڑ گئے...... بات تو ایک اچ ہوئی نا۔ سرکار کے ساتھ سونے سے کم سے کم سال بھر کی تنخواہ ایک ساتھ تو مل گئی۔“

اب اس نے یہ سوچا تھا کہ چپکے سے نکل کر سکینہ کو ساتھ لے کر ماں باپ کے پاس اضلاع میں چلا جائے گا اور باقی زندگی کھیتی کے کام کاج میں چین اور عزت سے گزارے گا۔ روز روز کی لاتیں اب اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔

دو دن تیاری میں نکل گئے۔ ان دو دنوں میں وہ ڈیوڑھی ہی نہیں گیا، اور جانے کی اب ضرورت بھی کیا تھا؟ اپنے حسابوں تو اس نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ لیکن ادھر جو نواب صاحب کو پہلی دھار کی طرح چڑھ گئی تھی۔ وہ لڑکی اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ دو دن تو اسی انتظار میں نکل گئے کہ کلوا آئے تو پھر اسی کوری لال مٹی کی صراحی کو بلوائیں، مگر جب کلوا پلٹا ہی نہیں بڑے سرکاری خود ہی شکرم لگوا کر اس کے گھر پہونچ گئے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ دو دن سے کلوا نہیں آیا، تو وہ خیریت پوچھنے آئے ہیں۔

کلوا اس وقت کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا، گھر میں صرف سکینہ تھی...... نواب اقتدار یار جنگ کا کلوا ایسی حقیر فقیر کی مڑگی (جھونپڑی) تک آجانا ایسی کوئی معمولی بات تو تھی نہیں، سارے محلے میں شور مچ گیا۔

”اگے ایک بہوت بھی بہوت بہت خوبصورت بڑی بھاری شکرم آئی گی...... کوئی نواب صاحب آئے گئے......“

سکینہ بھی تیزی سے باہر نکلی۔ نواب صاحب سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں...... نواب صاحب کا دل اچھل کر سینے سے باہر نکلنے لگا۔ جس کے لئے وہ یوں تڑپ رہے تھے وہ اس قدر آسانی سے مل جائے گی، اس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔ مگر رعب داب قائم رکھنے کی خاطر پوچھا...... ”کلوا کا گھر کون سا ہے ؟“

”یہی اچ ہے سرکار۔“ کئی آدمی ایک ساتھ بولے۔

”تو اس کے گھر یہ چھوکری کون کھڑی ؟“

”یہ...... ؟ انے تو اس کی مکان والی (بیوی) ہوتی سرکار۔“

نواب صاحب کبھی سکینہ کو دیکھتے، کبھی محلے والوں کو۔ دل میں غصہ کا ابال سا اٹھا۔

”توانے حرام زادہ، سور کا جنا ہم کو دھوکا دیا۔ پورے پچیس روپے کا دھوکا......“

”اچھا بچہ جی......“ وہ سکینہ سے مخاطب ہو کر بولے...... ”یہ ہمارا چاؤس تمہارے گھر پو بیٹھا رہے گا۔ کلوا آئے تو اس کو فوراً ڈیوڑھی پو بھیج دیو۔“

کلوا بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا، جب زیا زپ بید پر بید پڑ رہے ہوں تو اچھے اچھے بھی بید مجنوں کی طرح کانپنے لگتے ہیں...... اور وہ تو تھا ہی پیچی کی طرح۔

”کیوں بے حرام کی اولاد...... جب اپنے گھر کی آپس کی اچ بات تھی تو تو میرے سے روپے کیوں لیا ؟ اتنی خوبصورت تیری بیوی تھی تو تیرا کام نئیں تھا کی ویسا چ لا کو پیش کر دیتا۔ کیا میرا نمک نئیں کھاتا تا تو ؟“

کلوا کچھ نہ بولا

”اب تیری سزا یہ ہے کہ وہ روپے میرے کو واپس کر، ہور سزا کے طور پر ایک مہینہ روزانہ اپنی بیوی کو میرے پاس بھجوا......“

کلوا کچھ نہ بولا......

”ہور سن...... تیری ایک سزا یہ بھی ہے کہ جب ہم ہور تیری جوروں اندر رہیں تو تو دروازے پوہی بیٹھا رہو...... پھر تیرا جی تو جلنا کی اندر تیری جورو کا کیا حشر ہو ریا۔

کلوا کچھ نہ بولا......

پھر سرکار نے کھانا کھلانے والے خادم کو بلا کر زوردار الفاظ میں تنبیہ کی :

''اب سے ہماری جھوٹن اس حرامزادے کو نکو دیتے جاؤ۔ بہوت حرام خور ہے انے..... کھا کھا کو مستی چڑھ گئی اس کو.....''

خوف کی زیادتی کبھی کبھار انسان کو بے خوف بنا دیتی ہے۔ اب کلوا پہلی بار بولا :

ہو..... آج سے میں اچ سرکار کی جھوٹن نئیں کھاؤں گا..... کیونکہ اب تو سرکار میری جھوٹن کھارئے.....''

بڑے سرکار کے ہاتھ سے بید چھوٹ کران کے اپنے پیروں پر آپڑا.....

* * *

حمیدی

بھوک

بڑی پاشا کا غصہ اپنے شباب پر تھا۔

''اجاڑا نے دیوان صاحب اتا سا کام اب تک کر کو نئیں دیئے۔ کتے دفعے بول بول کے بھیج دی پرانوں کے کاناں جیسے پٹ ہیں۔ کیا پورے محلے پرے میں ایک بھی پیٹ والی سیدانی نئیں مل رئی ہوئیں گی؟''

مغلانی بی بادام کشمش، منقہ، چھوہارے، میووں اور زعفران کے ڈھیر میں ڈوبی بیٹھی تھیں۔ وہیں سے اک ذرا سرا اونچا کر کے بولیں، ''اوئی پاشا اتا گھابرے بھی نکو ہوا بھی دولہن پاشا کی زچگی کو خود دس پندرہ دن پڑے ہیں ملچ جائیں گی۔ گلی گلی سیدانیاں پڑے ہیں، ایک چھوڑ دس مل جائیں گے۔''

''تم بھی کیا باتاں کرتے ماں..... ایک چھوڑ دس مل رے........... میں بولتیوں اچ مل جائے سو غنیمت............. ایک دن بھی دیر سے ملی تو ناخ بے چاری دولہن کو تکلیف..........''

مغلانی بوا نے ذرا گڑبڑا کر بڑی پاشا کو دیکھا۔

''ہو پاشا نو مہینے پیٹ میں رکھے سو تکلیف نئیں ہوئی۔ اک ذرا دودھ پلا لینے سے کائے کی تکلیف ہو جائیں گی؟ ماں پھر ماں ہوتی اچ ہے ہور پاشا کوئی میرے سے پوچھے تو میں یہی اچ بولوں کی سب سے اچھا دودھ اپنی ماں کا.....''

بڑی پاشا نے ذرا تیور بدل کر انہیں دیکھا..... ''لیو اور سنو..... ہو ہی تمے اتا نہیں معلوم دولہن کو سولہواں بھر کو ابھی اچستراہواں لگا۔ اتی سی جان دھان پان..... کیا انے بچے کو دودھ..... پلائیں گی؟ اول اچ تو کیسی زرد زعفران ہو کر رہ گئی..... اس دن تمے سنے بڑے سرکار جو ڈاکٹرنی بھجائے تھے، انے دیکھ کو کیا بولی؟..... بہوت کم طاخت ہے۔''

مغلانی بوا کشمش کے تنکے چنتی چنتی اس بے نیازی سے کہے گئیں۔

’’دوئی پاشا یہ ڈھونگ دھتورے سوب موئے ڈاکٹران پھیلائے سوہئیں، نئیں تو کدو کی بیل کو بھی اس کا پھل بھاری نئیں جاتا۔ یہ تو انسان اچ ہے۔‘‘

بڑی پاشا نے گھور کر مغلانی بوا کو دیکھا......ان کی بزرگی اور سفید سر آڑے آجاتا تھا......... ورنہ ایسے موقعوں پر ان کا جی چاہتا، بڑھیا کا چونڈا پکڑ کر ڈیوڑھی سے نکال باہر کریں۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی، جب سے وہ بیاہ کر اس ڈیوڑھی میں آئی تھیں، تب سے ہی زنان خانے میں ہر بات میں مغلانی بوا کا سکہ چلتا تھا......... بڑے سرکار کے والد جب تک زندہ تھے وہ بھی نوکر شاہی سے واقف تھے۔ کبھی کبھار وہ مذاق میں ہنس کو کہہ بھی دیتے تھے۔ ’’مغلانی بوا، اب کبھی سرکار سے......... (ان کا اشارہ حضور نظام فرماں روائے دکن طرف ہوتا تھا) ملاخات ہوئی تو ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ آپ ہماری مغلائی بوا کا سکہ چلا دیو۔‘‘

مغلائی بوا جانے کون سا آب حیات پی کر آئی تھیں کہ بڑی پاشاہ کے دیکھتے دیکھتے چالیس برس ان پر سے جیسے چالیس مہینے ہو کر نکل گئے تھے۔ وہی سیاہ بال، وہی مسی بھرے جمے ہوئے دانت، وہی مضبوط کاٹھی اور وہی عمل دخل۔ سارے پاشا لوگ ان سے ایسے دبتے تھے جیسے سچ مچ وہی گھر کی مالکن تھیں۔ البتہ بڑی پاشا سے ان کی کبھی کبھار بڑی تکرار چلتی تھی۔ ڈیوڑھی میں کتنے زچگی جاپے ہوتے تھے کتنی انائیں کتنی کھلائیں مامور کی جاتیں، کوئی حساب ہی نہ تھا۔ لیکن ہر بار مغلانی بوا کا یہی کہنا ہوتا......... ’’ماں کا دودھ ضروری نہ ہوتا تو اللہ میاں عورت کے سینے میں دودھ اتار کر تاج کیوں؟‘‘ مگر ان کی وہی حالت تھی کہ ’’چاکر لاکھ کا نہ مالک خاک کا۔‘‘

پالکڑیوں۔ کنیزوں اور رکھیل چھوکریوں کی کی ایک پلٹن کی پلٹن بیٹھی زچہ اور کھلائی کی خوراک صاف کرنے میں منہمک تھی کہ اتنے میں باہر سے خواجہ سرا اندر وارد ہوئے، ’’حضور وہ دیوان صاحب تو بڑے سرکار کے ساتھ بگھی پر کہیں ترشیف لے گئی ہیں، اس واسطے یہ خادم کچھ فرمانا چاہتا ہے۔‘‘

خواجہ سرا جو دہلی کی ایک بارات کے کچھ اہل زبان حضرات کے ساتھ چند روز گزار کر خود بھی ’’زبان دان‘‘ بن چکے تھے، ساری ڈیوڑھی کے لئے تفریح کا سامان تھے۔ بڑی پاشا زیر لب مسکرا کر بولیں۔

’’اچھا ہوا دیوان صاحب ترشیف لے گئے۔ آپ نئیں، نئیں تو یہاں کے سب کا ماں چوپٹ

ہو جاتے۔ بولو کیا فرمانا ہے؟‘‘

’’جی......... وہ ایک سیدانی شکرام میں بیٹھ کر ایک مردانے میں ہور زنانی کے ساتھ آئے ہئیں۔ کرایہ بھی دینا ہے ہور انوں آپ سے ملنا بھی بنے بولتے یہ چٹھی انوں دئے سو ہے۔‘‘

بڑی پاشا نے مڑی تڑی چٹھی کو کھول کر دیکھا۔ ڈیوڑھی کا ہی پتہ تھا، دیوان صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ بڑی پاشا خوش ہو کر بولیں، ’’مغلانی بوا دیکھو تو وہ......... دیوان صاحب جگہ جگہ بول کو رکھے تھے۔ سوان میں سے کوئی آیا کی۔‘‘

مغلانی بوا کی رہبری میں ایک جوان سی لڑکی، بڑا سا پیٹ لئے، تھکی تھکائی ایک بڑی بی سن کا سفید سر لئے، میلے کچیلے کپڑے پہنے اور ایک بڑے میاں جھکے جھکے سے، جیسے دکھوں کا گٹھر سر پر دھرا ہو کہ سر اٹھا کر چلنے نہ دیتا ہو......... زنان خانے میں داخل ہوئے تو بڑی پاشا وہیں سے ذرا ترش ہو کر پھنکاریں۔ ’’آئی بڑی میاں تم اور بیچ رہو......... یہاں چھوکریاں گوشہ پردہ ہے۔‘‘

’’جیسی حضور کی مرضی.........‘‘ وہ وہیں ٹھٹک گئے۔ بڑی بی اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھیں۔ لڑکی نے چاندی کے تھالوں میں رکھے ہوئے بادام، کشمش، چھوہارے۔ منقہ اور مکھانوں کے ڈھیر کو دیکھا اور زعفران کی بے پناہ خوشبو کو گھونٹ گھونٹ پیتی وہیں ننگے فرش پر بیٹھ گئی۔ بڑی بی نے سہم کر بیٹی کی وکالت کی، ’’میں کہوں نواں مہینہ بھرا جا رہا ہے، تھکی تھکی جاتی ہے۔‘‘

’’کچھ پروائیں.........‘‘ بڑی پاشا رسان سے بولیں۔ دائی کتے دنان بتائی؟‘‘

’’بس اسی ہفتے دس دن میں چاند چمکے گا۔‘‘ بڑی بی خوشی خوشی بولیں۔

بڑی سرکار نے چونک کر انہیں دیکھا اور پوچھا، ’’کہاں کے رہنے والے جی تمے؟‘‘

’’جی، ہم خانماں برباد اسی دہلی کے ہیں جو ہزار بار اجڑی اور ہزار بار بسی۔ اب قسمت نے یہاں لا پھینکا ہے۔ اس سرکار کا نام سن کر چلے آئے تھے جس کی بادشاہت میں.........‘‘

بڑی پاشا بات کاٹ کر ناگواری سے بولیں۔ ’’ابا کتے بکواسی ہئیں جی تمے۔ چپ کے چٹ پٹ پٹ لگا دئیں۔ میں جو جو پوچھوں۔ بس اتے کا جواب دینا۔‘‘

’’بہت بہتر میری سرکار۔‘‘ بڑی بی بغیر برا مانے بولیں۔

’’تمھارا خاندان کونسا ہے، ہور تمھارے سسرال کا کون شا؟‘‘

’’جی سرکار ہم لوگ نجیب الطرفین......... خاک چاٹ کر کہتی ہوں کہ ہمارا سلسلہ آل رسول خاندان سادات سے ملتا ہے۔ میرا میکہ سید تھا، سسرال بھی.........‘‘

خدا کی مہربانی سے بیٹا کو بھی سسرال سید گھرانہ ہی ملا۔ تین سیڑھی اوپر، تین سیڑھی نیچے تک ہمارے خاندان، میں کہیں کھوٹ نہیں.........نوکری کی، مزدوری کی، چاکری کی، لیکن شکر اس مالک کا اور کرم اس رسول کا کہ کبھی کسی کی دی خیرات نہیں لی۔ نہ صدقہ کھایا نہ زکوۃ لی۔ وہ ہاتھ پاؤں چلا کر ہی پیٹ بھرا سرکار۔ جس کے لئے خدا اور اس کے رسول نے بھی کوئی ممانعت نہیں فرمائی ہے۔’’

‘‘ٹھیک ہے۔ ہم نا بھی تم کو نوکری کے واسطے اچ بلا بھیجیں۔ ہمارے پوتے کو یا پوتی کو، جو بھی اللہ دیا سو، تمھاری چھوکری سال بھر دودھ پلانا، مگر اپنے بچے کو اوپر کا دودھ پلانا کیئے۔’’

‘‘جی؟.........پہلی بار لڑکی بغیر مخاطب کئے خود سے بول پڑی۔’’

چپکی رہو زینب.........بڑوں کے بیچ میں زبان نہیں ہلایا کرتے۔ ماں بیٹی کو گھر کی دی اور وہیں سہم گئی۔

بڑی پاشا نے سنانا شروع کیا.........پانچ روپے مہینہ تنخواہ، کھانا پینا ہماری طرف۔ صبح اچ صبح بڑا گلاس بھر کو بادام، زعفران اور گڑ ملا ہوا دودھ، ہمارے وہاں زچہ کو ٹھنڈی رہتی بول کو شکر نئیں دیتے۔ پھر دو گھنٹے سے ناشتہ۔ وہ انڈے، پراٹھے، چوزے کا شوربہ.........پھر کھانے سے پہلے بھوک لگی تو طشتری بھر کو میوے، مکھانے، تلا ہوا گوند، بادام کشمش۔ دوپہر کے کھانے پو روز ایک مرغی، بکرے کا شوربہ، روغنی روٹی.........چاول ہمیں زچہ اور انا کو نئیں دیتے۔ ٹھنڈے ہوئے بول کو.........چار بجے ایسی بھینس کا دودھ جس کو ہے لوگاں خاص زچہ کے واسطے پالتے کی۔ سوائے میوے اور تھوڑی سرکی کے اس کو کچھ نئیں کھلاتے.........رات کو بچے کا دودھ ہضم ہوئے نہ ہوئے کر کے بہت ہلکی غذا ہے دیتے۔ بس پرندوں کا بہت گلا ہوا گوشت دلئے میں پکا کو۔ اور رات کو سوتے وخت وہی دودھ۔’’

بڑی بی اور زینب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کوشش کرتیں تب بھی شاید ہی پلک بند ہو پاتی۔

‘‘اتا سوب اس واسطے کی ہمارا بچہ طاخت ور ہوتا۔ ایک بات یہ کی برتناں ہے سوب چاندی کے استعمال کرتے۔ حکیم صاحب بولتے چاندی میں بہوت طاخت رہتی ہور کپڑے بھی دیں گے۔ روز صبح تلی ہور صندل کے تیل سے مالش کر کے ایک خادمہ نہلائیں گی۔ تب بچہ گود میں۔ غلیظ عورتوں ہم نئیں رکھتے۔’’

‘‘بہت بہتر میری سرکار۔’’ بڑی بی مارے ممونیت کے دہری ہو کر بولیں، ‘‘سب ٹھیک ہو جائے گا سرکار____’’ وہ ادھ مری سی زینب کی طرف دیکھتے ہوئی کہنے لگیں____ ‘‘اس کا بھی پہلا بچہ ہے سرکار____ پہلے تو اچھی خاصی تندرست تھی لیکن کیا کہیں سرکار____ پیٹ کا بچہ کیا کچھ نہیں مانگتا پھر بھی شکر ہے، اس کا مالک کا سرکار جس نے یہ زندگی دی۔’’

بڑی پاشا نے قدرے ناگوری سے انہیں دیکھا۔ تمہاری زبان کتی چلتی جی، ذرا تو چپ کرو____ وہ مغلانی بوا سے مخاطب ہوگئیں____ ‘‘دیکھو وہ دولہن پاشا کے محل سے ملا ہوا جو کمرہ ہے کی نئیں وہ انا کے واسطے خالی کرا دیو۔’’

ایک دم زینب ننگے فرش پہ لوٹ گئی۔ ننھی بچیوں کی طرح پاؤں پٹک پٹک کر وہ چیخنے چلانے لگی، ‘‘میں اپنے بچے کا دودھ کسی دوسرے بچے کو نہیں پلاؤں گی، نہیں پلاؤں گی____ نہیں پلاؤں گی____ اماں مجھ پر ظلم نہ کرو۔’’

چاندی کے طشت میں میوے ملے دودھ کے گلاس، مرغ، بکرے، پرندوں کے گوشت سے بنے ہوئی لذیذ قورمے، روغنی روٹیاں، پراٹھے___ ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں کے سامنے اترنے لگے۔ وہ اسی طرح تھکی تھکائی ننگے فرش پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ چیخی تھی نہ چلائی تھی۔ پتہ نہیں اس کے دل کے کن گوشوں سے چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ زبان تو خاموش ہی تھی۔

سجے سجائے کمرے میں جہاں ساز و سامان ایسا تھا جیسے کسی شاہزادی کا کمرہ ہو۔

زینب دم بخود کھڑی تھی____ سفید مسہری ریشمی جالی سے مڑھی ہوئی۔ شفاف چادر تکئے اتنے نرم کہ جیسے اندر پھول بھرے ہوں____ موٹا گدا____ پائتی پر نفاست سے تہہ کی ہوئی کشمیری شال____ انگاروں کی طرح گرم، مگر پروں کی سہی ہلکی____ نیچے فرش پہ قالین۔ ایک طرف آئینہ۔ سنگار میز، بڑی مسہری سے ہٹ کر چھوٹی سی مسہری۔ اس نفاست او راہتمام سے جیسے کسی شہزادے کے لئے ہو۔

‘‘کس خوش نصیب کیلئے ہے یہ؟’’ زینب نے دکھے دل سے سوچا۔

تھوڑی دیر میں ایک خادمہ درزن کو لئے آموجود ہوئی۔

‘‘بی بی اپنا ناپ دلوا دیو، تمہارے واسطے کپڑے تیار ہونا ہئیں____ تمے جب تک یہاں رہیں گے یہاں کے اچ کپڑے پہننا پڑیں گے۔

‘‘ٹھیک ہے۔’’ وہ کسی معمول کی طرح ہر بات سنتی اور کرتی گئی۔

جب کمرہ سب لوگوں سے خالی ہوگیا تو بڑی بی نے اطمینان کی سانس لی، ''خدا کا شکر ہے بٹیا، بڑی سرکار نے تمہارے شوہر کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا ____ ''

''اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ تم بیوہ ہو تو ممکن ہے وہ اسے برا شگون سمجھتیں، کہ ہمارے بچے کو ایسی عورت دودھ پلا رہی ہے جس کا شوہر ہی نہیں تو تمہارے نصیب ایسے نہ چمک پاتے۔''

زینب پھوٹ پھوٹ کر رو دی ____ ''اماں یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ____ اسے نصیب کا چمکنا کہتے ہیں، میں ماں ہو کر اپنے بچے کو دودھ نہ پلا سکوں۔ اس سے بڑی نصیب کی تاریکی کوئی اور ہو سکتی ہے اماں؟''

''بٹیا ____ کئی بدنصیب بچے تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ماؤں کو ایک سرے دودھ اترتا ہی نہیں۔ کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے پیدا ہوتے ہی ان کی مائیں مر جاتی ہیں خدا کا شکر ہے کہ تمہارے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں۔ اتنا کھاؤ گی اللہ بھرپور ندیوں جیسا دودھ بھی تمہیں دے گا کہ اس بچے کو پلا کر تھوڑا بہت اپنے بچے کو بھی پلا سکو۔ تم دل کیوں چھوٹا کرتی ہو؟''

''اماں دل ہے ہی کس کم بخت کے پاس جو چھوٹا یا بڑا ہو؟''

جس سیلاب کو بڑی بی اتنی دیر سے روک رہی تھیں، جیسے پھٹ پڑا ایک دم انہوں نے زینب کو سینے سے لگالیا۔ آنسوؤں نے ان کی گویائی چھین سی لی۔

''آج تمہارا شوہر ہوتا تو ____ مگر اس کی غیرت تو ایک جملہ بھی نہ سہا رسکی ____ تمہارے ابا نے بس یہی تو کہا تھا کہ اللہ ایسوں کو اولاد دیتا ہی کیوں ہے، جو اسے پال بھی نہیں سکتے۔ غریبی بری تو ہوتی ہے بٹیا، مگر ایسا بھی کیا کہ اپنی جان ہی لے ڈالی۔ ہم نے بھی تو اک عمر اسی غربت میں کاٹ دی کہ صبح کھایا تو شام کی آس نہیں۔ شام ملا تو صبح کا یقین نہیں۔ آج وہ ہوتا تو دیکھتا کہ خدا کتنا بڑا ہے، جہاں فاقے مرنے کی نوبت تھی

وہاں شاہی نعمتیں۔ ایسی کہ انسان جن کا تصور بھی نہ کر سکے۔ پھر اوپر سے پانچ روپے ماہانہ ____ تمہاری تو زندگی ہی سنور گئی بٹیا۔''

''ٹھیک کہتی ہو اماں، میری تو زندگی ہی سنور گئی ____ '' وہ آنسوؤں سے بھری دکھ سے بھاری آواز میں بولی ____ ''کیا دنیا میں کھانا ہی سب کچھ ہوتا ہے؟''

بڑی بی نے آنسوؤں سے چمکتی آنکھوں سے [illegible] دیکھا اور بالوں کو [illegible] بولیں،

[illegible] ان بالوں پر سے ہو کر [illegible] سفید [illegible] اور اس زمانے [illegible]

یہی بتایا کہ سب سے بڑا دکھ ہے، سب سے بڑی خرابی سارا جھگڑا کا ہے بٹیا نہ ہوتی تو خدا کو کون پوچھتا؟''

اسی دم مغلانی بوا کمرے کا پردہ اٹھا کر داخل ہوئیں اور زینب کو سمجھا کر بولیں ____ ''دیکھو بی بی ____ زچگی کے بعد سال بھرے تک جب تک بچہ دودھ پیئیں گا، تمھارے شوہر یہاں نہیں آنا۔'' پھر وہ بڑی بی کو دیکھ کو ذرا مسکرائیں ____ ''اب تمے بڈھے بڑے ہیں تم کو کھول کو سمجھانے کی ضرورت نئیں نا؟''

دوسرا دن زینب کے لئے بڑا عجیب ثابت ہوا۔ پہلے ایک دائی اماں آئیں، جو اسے ٹٹول ٹٹول کر کہہ گئیں کہ دو دن بھی مشکل سے نکلیں گے۔ پھر ایک کرسچین لیڈی ڈاکٹر آدھمکی، جس نے ہر قسم کے معائنے کئے اور شوہر ماں باپ سے لے کر سب ہی تک صحت کے بارے میں پوچھ پچھ کر ڈالی۔ بہت ساری گولیاں اور پینے کی دوائیں اس کی سرہانے والی میز پر جمع ہو گئیں۔ یہ سب سے بڑا ڈاکٹر حکیم جو کچھ تھا وہ اوپر ہی والا تھا۔ زچگی تک کے لئے ڈاکٹر نے بہت ہلکی غذائیں، زیادہ تر دودھ اور پھلوں کے رس تجویز کئے ____

لیکن اس سارے معاملے میں، ان پڑھ دائی ماں زیادہ تجربہ کار ثابت ہوئیں۔ اس لئے کہ اسے ڈیوڑھی میں آئے تیسرا ہی دن تھا کہ شام ہوتے ہوتے وہ ایک ننھے منے سے لڑکے کی ماں بن گئی۔ چوبیس گھنٹے گزرنے پر اس نے وہ زندگی بخش تناؤ اور درد اپنے سینے میں محسوس کیا جو پکار پکار کر کہتا ہے، ''میں ان داتا ہوں، مجھ سے کچھ مانگو ____ ''

معاملہ بڑی پاشا کے دربار میں گیا۔ وہ بولیں، ''ٹھیک ہے ابھی تو دولہن پاشا کی زچگی کیا معلوم کب ہوئی۔ جب دودھ کا زور ہوچ را تو بچے کا منہ لگا دیو۔''

وہ سارا ہفتہ زینب نے جنت یا جنت سے بڑھ کر اعلیٰ، حسین اور خواب آگئیں ماحول میں گزارا ____ ایسی غذا جو شاید بے حد نیک روحوں کو جنت میں عطا کی جاتی ہوگی۔ کام نہ دھام، ننھا ننھا سا گول مٹول بیٹا پہلو میں۔ وہ پاکیزہ نہریں اپنی شدت سے جاری ہو گئیں ____ زینب کا جی چاہتا کہ اپنے بیٹے کو لے کر کہیں دور بھاگ نکلے ____ اس طرح کہ کوئی نہ دیکھے کوئی پیچھا نہ کرے۔ بس وہ ہو اور اس کی ماتا کا پھول۔ لیکن مستقبل اپنا بھیانک منہ پھاڑے آ کھڑا ہوتا۔ غریب باپ جو [illegible] کام کرتے ____ بوڑھی ماں جو اکثر روزے سے

[illegible] کر فاقوں کی [illegible]

اور پانچ روپے ماہانہ ان کی اپنی گزر اوقات کے لئے بھی مقرر کر دیا۔ بھلے سے وہ اپنے گھر چلی بھی جائے مگر ابا کی نہ کے برابر آمدنی کیا سکھ دے پائی گی؟ ____

نوکری وہ کرنے سے رہی۔ ابا اماں نے کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں اور پھر بچے والی کو ماما گیری پر رکھتے لوگ کتنا بدکتے ہیں۔ ہر طرف اندھیر ہے وہ ساری فکروں سے نجات پانے کے لئے اپنے لال کو کلیجے سے لگا لیتی ____

آٹھویں دن ڈیوڑھی میں وہ ہنگامہ بپا ہوا کہ سب اپنا بھول گئے۔ لیڈی ڈاکٹر کی اس نقار خانے میں بھلا کون سنتا؟ ڈھول، تاشے، گاجے باجے ____ ڈومنیاں، مراثیاں، زچگیوں کے گیت، جاپوں کے گیت، خیر خیرات، پکوان، تلن، ایک شادی کی دھوم دھام تھی۔ بڑی سرکار اور بڑی پاشا کی خوشی کا اندازہ نہ تھا ____ اللہ تعالیٰ نے انہیں پوتے سے نواز دیا تھا۔ اس دن پہلی بار زینب نے چھوٹے سرکار اور دولہن پاشا کو دیکھا ____ چاند سورج کی جگمگاتی جوڑی ____ ڈیوڑھی میں چھوٹے سرکار کے بارے میں متضاد رائے تھیں۔ چند چھوکریاں کہتی تھیں ____ ”دولہن پاشا کے دیوانے ہیں انوں ____ اور چند بتاتی تھیں ____ ”سوب دکھاوا ہے، جب موضع ملے تانک جھانک کر لیتیں ____ ”مگر جس والہانہ انداز سے اپنی بیگم پر جھکے ایک ساتھ بیٹے اور بیوی کو دیکھ رہے تھے۔ اس انداز نے زینب کے دل سے ہر خدشہ دور کر دیا۔

رات گئے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی زینب جب دولہن پاشا کی خبر لینے ان کے محل میں پہنچی تو انہوں نے بڑے دوستانہ انداز میں اس سے شکایت کی ____ ”اب تمے ہمارا بابا چھین لیں گے نا انا؟“

زینب پر سے، اس کے دل پر سے، اس کے ہوش وحواس پر سے کئی آندھیاں ستاتی گزر گئیں۔ کتنی ہی دیر وہ یوں ہی کھڑی رہی، پھر اپنی ساری قوت گویائی جمع کر کے بولی، ”خدا آپ کا سہاگ، آپ کی ماما سلامت رکھے بی بی ____ میں ایسا سوچوں بھی تو جل جاؤں۔“ وہ رونے پر آ گئی۔

”ایو رو مت انا۔ نئیں تو بابا کا دودھ سوکھ جائیں گا ____ ” دولہن پاشا لہجے میں ممتا بھر کر بولیں۔

زینب نے سر اٹھا کر پوچھا۔ ”کس نے کس کا بچہ چھینا ہے بی بی ____ سوچ کر جواب

دیجئے گا ____ ”مگر یہ بات اس نے کہی کب تھی؟ اس کی زبان تو خاموش تھی۔

چھوٹے پاشا جو چاند پاشا کے نام سے پکارے گئے، جب چوبیں گھنٹے کے ہو گئے تو دودھ سے لگا دیئے گئے۔ انا کا بچہ جو دس دن میں ماں کے دودھ کا عادی ہو گیا تھا، کس طرح دودھ چوسنی یا نپل کو منہ نہ لگاتا تھا۔ چاند پاشا چسر چسر دودھ پی رہے تھے اور انا بار بار پلٹ کر دیکھتی کہ رونے کی آواز سننے سے پہلے میرے کان بہرے ہو گئے ہوتے تو اچھا تھا۔ پرلے صحن سے بڑی پاشا کی محبت سے بوجھل آواز آئی ____ اگے انا تمھارے بچے کو کسی چھوکری کے پاس دے کو باورچی خانے میں بھیجا دیو جی۔

چاند پاشا کو چین سے دودھ پلاؤ۔ نئیں تو اس کے رونے کی آواز سن کو تمھارا دودھ سوکھ جائیں گا۔“

متواتر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے اور گولیاں کھانے سے بھی لیڈی ڈاکٹر کو پھر بلوایا گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے خوشامد بھری جھاڑ پلائی، ”بے بی ہم تم کو گرم پانی کی بوتل سے سینکائی کرنے کو بولا۔ یہ ٹھنڈا پانی کی پٹیاں کون رکھا؟“

دولہن پاشا کا چہرہ درد ضبط کرنے سے واقعی کھنچا کھنچا سا تھا۔ جھلا کر بولیں۔ ”معلوم نئیں ڈاکٹر یہ لوگاں کیا کیا کرے رئیں ____ آپ پلیز ____ میرے کو انجکشن دیو یا کچھ بھی، مگر تکلیف کم کر دیو۔“

”مگر بے بی ____ ”ڈاکٹر پیار سے بولی ____ ”تھوڑا دن بابا کو دودھ پلانے میں کیا حرج ہے؟“

انگریز گورنس سے پڑھی ہوئی ”بے بی“ بہت دلار سے ٹھنک کر بولیں ”اوہ ڈاکٹر، سارا فیگر ہو جاتا۔ میں نئیں فیڈ کرتا۔“

انا پر ایک خادمہ مامور ہو گئی، جس کا کام صرف یہ تھا کہ کڑی نگرانی کرتی رہے کہ انا کہیں اپنے بچے کو دودھ نہ پلا دے۔ انا کا بچہ جب بہت بلبلا کر روتا تو اس کے منہ میں چوسنی دے دی جاتی، جسے چوستے چوستے اس کے جبڑے پچک گئے۔ ڈبے کا دودھ کبھی اسے ہضم ہوتا کبھی نہ ہوتا۔ گول مٹول بچہ ہڈیوں کی مالا ہو کر رہ گیا۔ دن رات نوکر خانے سے اس کے رونے کی آواز آتی رہتی، اور انا کی اپنی گود میں، اور کبھی مسہری میں بڑی پاشا کا پوتا گہری نیند سوتا رہتا۔ ایسی نیند جو پیٹ بھر کھائے بعد ہی آتی ہے۔

رات گئے جب سب گہری نیند میں ہوتے تو انا چپکے سے اپنے بچے کو اٹھا لاتی۔ اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ____ سینے سے لگاتی، مگر وہ جس کا سلسلہ آل رسول خاندان سادات سے ملتا تھا، کبھی یہ سوچ تک نہ سکی کہ اپنے ہی گوشت پوست کے ٹکڑے کو، اپنے ہی بچے کو اک ذرا سا اپنا دودھ پلا دے۔ نمک حرامی کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی، کیونکہ اسے تو زندگی بھر اسی ڈیوڑھی کے آقاؤں کے نمک کھانا تھا۔ بڑی پاشا اس کا مستقبل محفوظ کر چکی تھیں ____ وہ اسے اطمینان دلا چکی تھیں کہ ایک بار جو اس ڈیوڑھی میں آ گیا سو آ گیا ____ بچے کا دودھ چھڑانے کے بعد بھی اناؤں کو برخواست نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ اس ڈیوڑھی کے آقاؤں کی شان کے خلاف تھا ____ وہ جن کی ڈیوڑھی کے دروازے اتنے اونچے تھے کہ ایک کے اوپر ایک کر کے تین اونٹ کھڑے کر دیئے جاتے تو بھی آسانی سے پھاٹک سے گزر جاتے۔ وہ کیسے، اتنی چھوٹی سی بات سوچ سکتے تھے کہ اپنا کام نکل جانے کے بعد کسی کو دھتکار دیا جائے۔

ہر مہینے ایک ڈاکٹر سب نوکروں کے معائنے کے لئے آتا تھا۔ اس بار آیا تو اس نے انا کے بچے کو دیکھ کر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ دیوان صاحب سے کہنے لگا، ”اس بچے کی حالت اچھا نہیں ہے۔“

بچے کے ہاتھ پاؤں سوکھ گئے، پیٹ نکل آیا تھا۔ انسان کا بچہ عجیب مکوڑے کا سا ڈول ہو گیا تھا۔ بڑی پاشا تک یہ خبر گئی تو وہ ہولا کر بولیں:

”اگے ڈاکٹر سے بولو، اس کا اچھا علاج کرو، کبھی مر مرا گیا تو غم کے مارے انا کا دودھ سوکھ جائیں گا اور چاند پاشا کی صحت خراب ہو جائیں گی۔“

مگر ڈاکٹر نے کہہ دیا، ”بہت دیر ہو چکی ہے، اس کے سوکھے کا مرج لاعلاج ہو چکا ہے۔ ماں کا دودھ ملے تو شاید کچھ ہو سکے ____“

کسی دوسری عورت کا دودھ اسے دینے کی کوشش کی گئی تو اس نے منہ تک نہ لگایا۔ اس لئے ان سارے مہینوں میں عورت کے نرم گرم اور زندگی بخش سینے کی پہچان تک سے محروم ہو گیا تھا۔

ادھر ادھر ہاتھ مار کر اس نے اپنی چوسنی تلاش کی اور منہ سے لگا لی۔ ڈاکٹر کے معائنے کے ٹھیک ساتویں دن، دوپہر کے بارہ بجے انا کا بچہ اپنے بستر میں مرا ہوا پایا گیا۔ بڑی دیر سے وہ خاموش تھا، [illegible] یں جاری رہتی تھی ____ خادمہ نے ڈبے کے دودھ سے بھری شیشی اس کے [illegible]

”انا ____ انا ____“ خادمہ زینب کے پاس پہنچ کر بے حد گھبرائی ہوئی آواز سے دھیرے سے بولی ____ ”تمھارا بچہ ____“

”کیا ہوا میرے بچے کو؟“ زینب نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ رک کر جھجک کر بولی ____ ”شاید مر گیا ____“

زینب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ نہ روئی نہ سسکی۔

جب انا کا دوپہر کا کھانا لگا، اس وقت تک پوری ڈیوڑھی میں انا کے بچے کی موت کی خبر پھیل چکی تھی۔ کھانا لگنے کی اطلاع سن کر حسب معمول بڑی سرکار نے آ کر دسترخوان کا معائنہ کیا ____ مرغ، بکرے کا شوربہ، روغنی روٹی، قورمہ، پانی کے بجائے دودھ، سب ٹھیک تھا۔ وہ روزانہ ہر چیز کا جائزہ لیتی تھیں کہ ایسا نہ ہو کھانے میں کمی رہ جائے اور چاند پاشا کے دودھ پر اس کا برا اثر پڑے ____ دسترخوان کا جائزہ لے کر انہوں نے روز کی طرح آواز دی:

”انا چلو کھانا کھا لیو، پھر بچے کو بھی دودھ پلانا ہے ____“ زینب ایک معمول کی طرح اٹھی، ہاتھ دھوئے اور دسترخوان کے کنارے بیٹھ کر مقوی کھانا کھانے لگی کہ بچے کا دودھ نہ سوکھ جائے..........“

* * *

ستا گوشت

''پان تو بنا کردے دی، اب ہونٹاں بھی دے دے۔''

بھولی نے سنا، مگر یوں ہی احمقوں کی طرح کھڑی ان کا منہ دیکھتی رہی۔

''ہم کیا بول رئے تو سنی نئیں کیا چھوکری؟''

پھر بھی وہ نہ سمجھ سکی...... یہ ٹھیک ہے کہ محل کے اندر داخل ہوتے ہوتے اس کی ماں نے کافی ہدایتیں اس کے کانوں میں انڈیل دی تھیں۔ جن کا خلاصہ کیا جا چکتا تھا تو بس یہی کہ نواب صاحب جو بھی کرنے کو بولے تو تو وہی اچ کرنا۔'' لیکن وہ خصوصیت سے اس وقت بہت حیران تھی کہ ''ہونٹوں میں ہونٹاں'' کیوں کردے۔ ویسے اس سے پہلے نواب صاحب اس سے جو بھی سوال کرتے رہے تھے وہ بڑی ہی سعادت مندی سے ہر سوال کا جواب دیتی رہی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے تو ایک کونے میں قالین سے ہٹکر ننگے فرش پر سر جھکائے بیٹھی تھی...... انہوں نے اسے وہاں سے اٹھ کر دیوان میں بیٹھنے کو کہا تھا، تو ہو جھجکی ضرور تھی...... کہ ایسے مخملیں گدوں والے دیوان پر کیوں جا چڑھے۔ لیکن ''امی'' نے کہہ دیا تھا کہ ''نواب صاحب کا کہنا ٹالیں گی تو ٹانگاں رکھ کو چیر دیوں گی۔'' اس کئے وہ بڑی متانت سے ایک کونے میں سکڑی سمٹی سہمی جا بیٹی تھی۔ پھر نواب صاحب نے قریب آکر، ذرا، مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا۔ ''نام کیا ہے بی بی تمہارا......؟''

بچپن سے اب تک تیرے میرے گھروں کے برتن بھانڈے دھوتے، جھاڑو بہاڑو کرتے اور چھنال بندوڑی، حرام زادی جیسے خطاب سنتے سنتے جس کا سارا وقت کٹا ہو...... اچانک انے آپ کو ''بی بی'' جیسے خطاب کا اہل پا کر اس قدر خوش اور ساتھ ہی حیران سی رہ گئی کہ اس لمحے اس نے فیصلہ لیا۔ ''اتے اچھے نباب صاحب تو بچی جو بولے تو وہی اچ کرنا...... میرے جیسی غریب چھوکری

کو بی بی قبول لے رئیں تو ضرور انوں بہت اچھے ہوئیں گے۔''

اسے خاموش دیکھ کر نواب صاحب نے اپنا سوال دہرایا تھا۔ ''ہو بی بی...... تم اپنا نام نئیں بتائے۔''

''جی...... بھولی''

نواب صاحب پر ہنسی کا دورہ سا پڑا۔ بڑا عجیب وغریب نام تھا...... کم سے کم اب تک تو ان ک کانوں سے ہو کر گزرا نہیں تھا، مگر اب جو انہوں نے غور سے دیکھا تو واقعی وہ انہیں اتنی بھولی نظر آئی کہ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا...... ہونا بھی نہیں چاہئے تھا۔

''کچھ پڑھی وڑھی ہے تو......؟'' انہیں پیار آیا تو ''تم'' سے فوراً ''تو'' پر اتر آئے......

''ایسا اچ معمولی سا'' وہ ناک کو خفیف سا سکوڑ کر بولی...... بس خط پڑھے لکھے جتا۔''

اپنے ماحول سے اسے مانوس کرانے کے لئے وہ خواہ مخواہ کی باتیں کئے گئے۔

''ہور کھانا پکانا آتا؟''

''جی ہو'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولی۔

''کیا کیا آتا؟''

جی......؟ دال خشکہ، روٹی، سب، سالنے، املی کا کٹ، تلی کی چٹنی، ٹماٹے کا کھٹا...... سب غریبانہ پکوان......

نواب صاحب مزے لے لے کر سب سالنوں کے نام سنتے گئے...... پھر بیچ میں بولے...... ہور شامی کباباں، خورمہ، بریانی، پلاؤ پسندے...... خیمے کے پراٹھے یہ سوب نئیں آتا؟''

وہ بڑی حیرت سے ان کے مونہہ کو دیکھ رہی تھی۔ جب وہ رکے تو وہ ذرا اٹک اٹک کر بولی۔ ''مگر یہ سوب چیزاں تو گوش سے بنتے نا؟''

اب کے پہلی بار وہ ہنسی اور نواب صاحب کو ایسا لگا کہ اس کی معصوم اور دلکش ہنسی کی چھوٹ جو پڑی تو کمرہ جیسے اجالوں سے بھر گیا۔ وہ ہنستے ہنستے بولی۔ نباب صاب، ہمارے ہاں گوش نئیں آتا۔ ہور جب گوش ہی نئیں آتا تو گوش کے پکواناں کیسے آئیں گے؟''

''تو مطلب یہ کی تم لوگاں گوشت کھاتے ہی نئیں؟''

''نئیں نئیں، ایسا تھوڑی ہے...... ہم سال کے سال بخر اعید پر کھا......'' پاس پڑوس والے خربانی ہوتی تو حصہ بھجواتے کی نئیں؟''

اچانک انہوں نے موضوع بدل دیا۔ پتہ نہیں کیوں ان کا دل اس چھوکری کی غریبی کا حال سن کر بے چین ہوگیا تھا۔ وہ بڑی محبت سے بولے۔

ہور پان بنانا آتا کی نئیں؟''

''اس نے خوشی خوشی جواب دیا۔ ہو، پان بنانا تو بہوت اچھے سے آتا'' میری امنی پان کھاتی ہے۔ وہ کام میں ہوتی تو میرے کواچ بولتی ...... ''بھولی، ذرا پان تو بناکے دے دے ایک...... ''کبھی کبھی تو میں خود بھی کھالیوں تو امنی بہوت ڈانٹتی۔ پن آج تو میرے کو امنی خود کھلالے کو آئی...... یہ دیکھئے......''

اور اس نے اپنے سرخ انگارے جیسے ہونٹ نواب صاحب کو گھوم کر دکھائے تو وہ خود بھی انگاروں کی طرح دہک اٹھے۔

''ایک زوردار پان'' انہوں نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں سمجھایا۔

شراب کباب...... پھر مرغن کھانوں، ترتراتے میٹھوں سے نپٹ کر وہ سیدھے اس کمرے میں چلے آئے تھے، جہاں روزان کی سیج پر ایک نئی اور کوری جامدانی کی طرح سل سل کرتی لڑکی موجود ہوتی۔

میٹھے میں شکر زیادہ تھی، حلق تک چلا آرہا تھا۔ ایسے میں پان کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

بھولی نے پان بنا کر دیا تو اپنے ہونٹوں سمیت ان کے قریب چلی آئی تھی۔ وہ تپ رہے تھے......

''انگلیوں میں پکڑ کر پاناں تو ماداں بہنا بھی کھلا سکتے......'' وہ ایک گرم سی ہنسی ہنسے......

''یہ ہونٹاں کس واسطے ہیں؟ پان تو بنا کو دے دی...... اب ہونٹاں میں ہونٹاں بھی دے دے......''

جالی دار کھڑکی کے نیچے کھڑی امنی منتظر رہی کہ اب بوسوں کی پٹاپٹ شروع ہوگی...... مگر معلوم ہوتا تھا کہ بھولی یا تو کچھ سمجھ نہیں رہی ہے یا شرما رہی ہے...... وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی......''اب یہ انے چھنال بے فضول کی شرم لے کو بیٹھ گئی تو بھلا نباب صاب کائے کو انعام و اکرام دیتے پھرین گے؟ یہ ہور یہ وخت تو پھر بار بار آنے والا نہیں...... موتی کی آب ایک بار اتری سو اتری وہ تو کھورانڈ کی حسمت تھی کہ ''نخفل کھلائی'' کے واسطے کٹنیوں کی نظر میں وہ بچ گئی...... نئیں تو ایسے ایسے تو کتے کتے چھوکریاں حیدرآباد میں پڑے سڑے ہوئیں گے۔'' امنی نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے آپ میں گم کوسا پیٹی شروع کردی۔

''آگ لگے چھنال کی شرم کو...... پہلے اچ جتا کو اندر ابھجائی تھی کہ شرمانا درمانا مت۔ جو بھی بولے سو کرنا۔ کوئی بات نکو نکو مت رنا۔ آخر دس روپے خرچہ کرا سو آدمی کچھ تو منگے گا...... اب یہ مونڈی کئی......''

مگر خوشی بختی کے نقارے کی طرح آخر وہ چوٹ پڑ ہی گئی۔ بڑھیا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ ''مالک تیری دین کے سو طریقے ہیں۔ شکر ہے......''

ن ہونٹوں کا سارا رس جیسے ان کے جسم میں پھیل گیا۔ انہوں نے سرشار ہوکر کہا۔ ''اب یہ سوب کپڑے اتار دیئے''......

اس نے منہ پھیر کر ایک ایک کر کے سب کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔

اوپر سے جو بھی تھی سو تھی، اندر سے تو سنگ مرمر کا مجسمہ نکل آیا ہو جیسے۔

وہ لمبی لمبی ہانپتی کانپتی سانسیں لے کر بولے ''اب ادھر آ کا''

اس نے مارے شرم کے اپنے کھلے بال دو حصوں میں سامنے کر کے عریانی ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کی۔

وہ اٹھے، اسے اپنے قریب کیا۔ خوبصورت نوخیز مرمری ابھاروں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر انہیں ایک دوسرے سے قریب کر کے انہوں نے بیچ میں اپنی ناک رکھ دی۔

''ہا...... زور سے سُونگھ کر انہوں نے کہا...... ''خدا کی قسم، تو بالکل کوری اور کنواری ہے۔ ہم نوی چھوکری اور نوے کپڑے کی خوشبو سونگھ کو ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ استعمال شدہ ہے کی نوا۔''

ان کے ہاتھوں کی لمس سے اس کے کنوارے جسم پر چھوٹے چھوٹے روئیں ابھر آئے...... وہ بہر حال ایک سولہ سال کی لڑکی تھی۔ پاکباز سہی، لیکن جب ان حالات سے دوچار ہونا پڑے تو اتنی عقل تو آہی جاتی ہے، جو یہ سمجھ سکے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ بہر حال اس کی امنی کو پیشگی دس روپے دیئے جا چکے تھے اور دنیا میں کوئی کسی کو یوں ہی پیسے نہیں دیا کرتا...... ویسے یہ اس کا اپنا حسن اور خدا کی مہربانی ہی تھی کہ اسے دس روپے دیئے گئے تھے...... ورنہ ''قفل کھلائی'' کی رسم کے دو روپے تو بندھے ہوئے تھے......

نواب صاحب اسے اس قدر دبوچ کر گہری نیند سو رہے تھے کہ وہ ہل جل بھی نہیں سکتی تھی۔

اترتی رات میں انکی نیند کچھ ہلکی پڑی تو اسے بھی سکون سے سانس لینا نصیب ہوا۔ نواب صاحب کے برابر سونا اسے کچھے عجیب سا لگا۔ چاہا کہ اتر جائے...... سوچا ناراض ہو جائیں گے۔ اتے بڑے نواب ہیں۔ کھڑے کھڑے مروا دیا تو......؟ زندگی تو ہر حال میں پیاری ہوتی ہے۔ غریبی سے ہی سہی۔ زندگی، زندگی ہے۔ وہ پائینتی کے طرف لیٹ گئی۔ نیند تو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے...... وہ تو پائینتی تھی...... پائینتی بھی کس کی اور کیسی؟ نواب صمد یار جنگ کی۔ مخمل کی اور ریشم کی وہ وہیں سو گئی۔......

صبح نیند کے زور میں نواب صاحب نے ایسی زور کے لات ماری کہ وہ پٹ سے نیچے جاگری۔ بوکھلا کر دیکھا تو سورج نکل آیا تھا اور وہ بالکل ننگی تھی۔ اس نے لپک کر اپنے کپڑے اٹھانے چاہے...... سامنے قد آدم آئینہ تھا...... خوب صورت اور بے مثال مخملیں جسم پر یہاں وہاں نیل، چٹکیوں کے نشان گردن سے نیچے...... اور نیچے...... دانتوں کے نشان جو رات بھر میں کتھئی رنگ اختیار کر چکے تھے...... جیسے کتے...... چت گوشت جو بھنبھوڑتے ہیں......

اس نے ڈر ڈر کر، پلٹ کر سوئے ہوئے نواب صاحب کو دیکھتے ہوئے محرم کرتا، پاجامہ سب چڑھایا...... دوپٹہ اوڑھا اور ہولے سے دروازہ سے باہر نکل گئی۔

دیوار سے لگی بڑھیا اونگھتے اونگھتے چونکی...... اور اپنی بچی کو پہچان کر لپکی ہوئی آئی......

‘‘کچھ انعام ملا کی نئیں بھولی...... کیوں کی سبھی لوگاں بولتے کی نواب صاحب بہوت سہی بہوت غریب پرور ہیں’’

دوپٹے کے کونے میں بندھے ہوئے، رات نواب صاحب کے دیئے ہوئے پانچ روپے کھن کھنا رہے تھے۔ اس نے کونا ماں کی طرف بڑھا دیا اور زخمی آواز میں بولی۔ ‘‘نواب صاحب بہوت دل دلے ہیں، بہوت رحم والے ہیں۔’’

صبح کو ناشتے میں شامی کباب اور سارے لوازم دیکھ کر اچانک نواب صاحب کو رات والی لڑکی یاد آگئی۔ انہوں نے اپنے معتمد خاص کو بلایا اور ذرا فکر مند لہجے میں پوچھا۔ ‘‘رات کو جو چھوکری محل کو آئی تھی وہ کاں رہتی؟’’

معتمد خاص ہڑبڑا گیا۔ نواب صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک بار جو بھی چیز استعمال کر لیں، چاہے وہ لڑکی ہو یا جوتی، کپڑا ہو یا موتی، دوبارہ ہرگز استعمال نہیں کرتے...... تو پھر آج یہ گزری ہوئی رات کے سائے میں پیچھے لپکنا کیسا؟ ذرا رکتے ڈرتے اس نے جواب دیا۔ ‘‘جی حضور...... وہ چار مینار سے کچھ آگے گوٹلہ عالی جاہ ہے نا، اسی کے خریب اس کا گھر ہوتا۔’’

گوشت کے پکوان اور شامی کباب ان کے حلق میں اٹک رہے تھے انہوں نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اٹھتے ہوئے بولے...... ‘‘ڈرائیور سے بولو، کی گاڑی نکالو ذرا......’’ اور سیدھے زنان خانے کی طرف لپکے۔

بی اماں چاندی کی پلنگڑی پر چاندی کا پاندان کھولے اپنی رعیت میں بیٹھی تھیں۔ سرکار کو آتا دیکھا تو ساری رعیت چھٹ گئی۔ نواب صاحن جا کر ماں کے گلے کا ہار ہو گئے۔ بی اماں بڑی حیران کہ بے بات آج یہ پیار کیوں پھٹا پڑ رہا ہے۔ الگ ہو کر دعائیں دیتے ہوئے بولیں۔

خدا خیر کرو، آج یہ ہاتھاں میرے گلے کا ہار کائے کو ہو گئیں؟’’

‘‘اماں جانی’’۔ انہوں نے ہنس کر کہا...... ‘‘ہم ایک لڑکی پسند کر لئے...... آپ کی اجازت ہو تو شادی بھی ہو جائے......’’

بی اماں کو وادبدا کر غصہ آگیا ‘‘میاں بن ناخ کو میرا جی نکو جلاؤ۔ اتا بول بول کے یہ عمر کر لئے۔ چالیس سے اوپر ہی ہوئیں گے تہیں۔ تمہارے عمراں والے تو ناتی نواسوں والے بن بن کو گئے او تمے بس میرے کو جلا لیتے ہی بیٹھے’’......

بی اماں جانی، ہم سچی بول رئے ہیں۔ آپ خود دیکھیں گے تو پتہ چلیں گے...... کتی اچھی لڑکی ہے۔ بس یہ ہے کہ ذرا کم پڑھی لکھی ہے ہور ذرا غریب گھر کی ہے۔’’

بھی اماں کے چہرے پر ذرا سے یقین کی پرچھائیں ابھری، دل کی خوشی کو چہرے پر آنے سے روک نہ سکیں، مسکرا کر کہنے لگیں...... ‘‘اگے میاں ہمنا کون سے بہو کو نوکریاں کرنا ہے، کی اس کو بہوت تعلیم ہونا...... خط لکھی پڑھی سو بس ہے، ہور غریبی کی بات تو یہ ہے میاں کو ہم کو اللہ اتا دیا۔ سو اب بیٹی والوں کی غریبی کا کیا غم؟ اتا ہے کہ بس عزت دار لوگاں ہونا......’’

عزت......! نواب صاحب کو رپچھتاوے کے ساتھ گزری ہوئی رات کا خیال آیا۔ وہ کلی جو انکے اپنے ہاتھوں میں پھول بنی تھی، کیا اس کی پاکیزگی، اس کا بھولپن کسی اور ثبوت کا محتاج تھا؟ وہ ذرا غم ناک سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ‘‘اماں جانی، وہ لوگاں تو اتنے عزت والے اور اتے پاکیزہ اور بھولے ہیں کہ فرشتے بھی انکے دامن پو نماز پڑھنے میں اپنی بڑائی سمجھنا......’’

‘‘جی ہو......’’ اٹھتے اٹھتے انہوں نے سعادت مندی سے کہا۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگے...... ‘‘دس روپے پیشگی اور پانچ روپے بخشش کے...... ان پندرہ روپوں کا کفارہ بس اسی طرح

ہوسکتا ہے کہ مہر پندرہ لاکھ بندھوالیں۔

موٹر میں بیٹھنے سے پہلے انہیں کچھ خیال آیا تو وہ پھر الٹے پاؤں بی اماں کے پاس آئے۔

''ایک بات سنئے اماں جانی......شادی بھر جتے بھی پکواناں پکیں گے......سب گوشت ہوئیں گے۔''

بی اماں نے ان کے چہرے کو ذرا حیرت سے دیکھا اور کہا۔''ائی میاں تے گوشت کے اتے بھی شوخین کب سے ہوگئے......؟

وہ منہ سے کچھ نہ بولے۔ مگر ایک میٹھی سی مسکراہٹ نے ان کے پورے چہرے کو چاند کی طرح روشن کردیا۔

* * *

حمیدی

ناگن

''ایو پاشا......جلدی سے پردہ کرلیو......بڑے سرکار ادرچ آرئیں''......مغلانی بی کی چھوکری کریمن کی آواز سنتے ہی مہر آراء ایک دم زنان خانے کی طرف لپکی..................''

حویلی میں بے حد پیاری اور حواس گم کردینے والی شام کا افتتاح ہورہا تھا۔ خواجہ سرا فانوسوں میں رکھی ہوئی شمعیں روشن کرتا ادھر ادھر آجارہا تھا......مالن موتیا کی مست کردینے والی خوشبو سے لدے تازہ کھلے پھولوں کے گجرے سب کے کمروں میں رکھتی پھر رہی تھی۔ پرلی طرف صحن میں کامدار نے خس کی جھاڑو سے آنگن صاف کرکے گلاب اور عنبر کے پانی سے چھڑکاؤ کرنا شروع کردیا تھا۔ مہر آراء گرما کی شام کو صندل کے پانی سے غسل کرکے حمام سے نکلی ہی تھی۔ ابھی جوان جسم کی مہک صندل سے پوچھ ہی رہی تھی کہ تم زیادہ توبہ شکن ہو یا میں......؟ کہ کریمن کی آواز نے اسے بولا دیا۔ لانبے لانبے بالوں میں سے ابھی موتی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر ہی رہے تھے، ابٹن کی خوشبو ابھی سراپا کے گرد طواف کرہی رہی تھی، حسین آنکھوں میں، جو پہلے ہی کم قاتل نہ تھیں، سیکا کائی پرانے سے گلابی ڈورے گھرے ہوکر قتل عام کی دعوت دے ہی رہے تھے۔ کہ کریمن کی آواز آئی اور آواز بھی کیا کہ ''بڑے سرکار ادرچ آرئیں......'' اسنے سوچا......''ہائے انوں اگر مجھے اس انداز میں دکھ لیں تو......؟ انوں تو آگے اچ ہزار بار تاک جھانک کرنے کو بیٹھے ہیں......ایسے میں تو اماں نی بھی گھر سے باہر ہیں۔''

اس نے بے حد سہم کر یہ سب سوچا ضرور، مگر قریب ہوتی ہوئی رات نے، حواس چھین لینے والی عنبر، موتیا صندل اور ابٹن کی خوشبو نے، کچے آنگن کی عطر گل کی مہک نے، گنگنے پانی والے غسل کی حیات بخش لذت نے اور تین سال سے خود اس کے اپنے تڑپتے تڑپاتے ارمانوں نے یہ بھی سوچا......''ایسی حسین شام کو اگر مجھے وہ ایک ہی بار قریب کرلیں تو......؟

پتہ نہیں اس کے خیالوں نے بڑے سرکار کو آواز دی تھی یا انہیں بھی خوشبوؤں نے بڑھاوا دیا تھا، یا تنہائی اور بے پناہ تنہائی نے ان کی ہمت کو للکارا تھا، وہ سوچتے ہی الہ دین کے جن کی طرح وہیں حاضر تھے۔ اپنے پورے اونچے بھاری بھرکم قد اور فدا ہو جانے والے انداز کے ساتھ ......اور کوئی وقت ہوتا تو وہ ادھر زنانے میں قدم بھی نہ دھرتے۔ مگر اس وقت ان کے نصیب سے پوری حویلی خالی تھی......سب لڑکیاں بالیاں، نوکر چاکر، حویلی سے گئے ہوئے تھے۔ بھلا اماں نی کہیں جائیں تو پوری فوج ساتھ کیسے نہ جائے......وہ تو ایک اتفاق تھا کہ مارے گرمی کے مہر آراء کا جی الٹ پلٹ ہور ہا تھا تو اس نے اماں نی سے معذرت کر لی تھی کہ وہ بالکل نہیں جا سکتی، اسے گھر پر رہنے کی اجازت دے دی جائے کہ صندل کے پانی سے غسل کر کے ذرا تراوٹ حاصل کر لے......دبدبے اور وسوسوں والی امنی نے پہلے تو ذرا شک سے مہر آراء کو دیکھا......لیکن بھولے بھالے چہرے پر کسی بھی قسم کی گھبراہٹ نہ پا کر کہہ دیا......''کریمن سے بول دیو......صندل والا پانی تیار کرنے کو رکھ دے...... پراتی بات یاد رکھو کی نہا کو ایک دم کھلے آنگن میں مت نکل کو آنا......''چپ کچپ، نہیں تو بخار و خار آجائیں گا۔ ہور بالاں اچھے سے پونچھنا......''سب احکام قبول کر کے مہر آراء جانے لگی تو اوپر سے اتنا اور سنا دیا......''ہور سنو، بی بی شام پڑے عطر وطر مت لگانا بن جاح پلٹ ہونے کو......''

اور جو جوان جسم کا عطر خود یہاں سے وہاں تک نیتوں کو ڈانواں ڈول کرتا پھر رہا تھا؟ اس کے بارے میں اماں نی کوئی ہدایت کیا دے پاتیں۔ اور ساری آگ تو اس کی لگائی ہوئی تھی......جیسے ہی مہر آراء اپنے آراستہ سرخ محل میں پہنچی......(ماں نی نے سب لڑکیوں کو انہیں کی پسند کے مطابق ایک ایک کمرہ ایسا عنایت کر دیا تھا جس میں دیواروں سے لے کر قالین، پردے، دیوان، چادریں، غلاف اور فانوس تک پسند کے ہی رنگ کے لگوائے جاتے تھے۔ مہر آراء سرخ رنگ کی دیوانی تھی اس کے حصے میں سرخ محل آیا تھا)......اس کے سراپے میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ تنہائی کی پھر پورشہ پا کر بڑے سرکار بھی ادھر ہی کھنچے چلے آئے اور گلاب رنگ کلی دیکھ کر آئینے میں زور سے ہنس پڑے۔ مہر آراء نے لرز کر گھبرا کر، سہم کر آئینے میں دیکھا اور پھر ایک دم پیچھے پلٹ پڑی اور یوں بڑے سرکار کا سامنا ہو گیا......جب کچھ نہ سوجھا تو مارے گھبراہٹ کے جانے کیسے اسے آداب محفل یاد آ گئے......سر کو جھکا کر......نازک سی حسین پیشانی کو چھو کر بولی......''آداب عرض ہے''۔

بڑے سرکار اس وقت بڑی موج میں تھے۔ آگے بڑھ کر اسے پوری پوری اپنے بازوؤں میں بھر کر بولے......ہم تو مرد ہیں مرد......اور جانتی ہو......مرد سلام کا جواب کس طرح دیا کرتے ہیں؟''

مہر آراء اس اچانک وار کے لئے قطعاً تیار نہ تھی......بغیر کسی گہما گہمی کے، بغیر تاشے باجوں کے، بنا کسی دھوم دھڑکے کے، بنا کسی تیاری کے یہ اچانک سہاگ رات آ گئی۔ لیکن لس لس کرتی جوانی نے اسے کچھ سوچنے اور بچاؤ کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ بڑے سرکار نے ایک مرد ہی کی طرح اس کے آداب کا جواب دیا......اور ایسا جواب؟ مارے شرم، گھبراہٹ اور مسکراہٹوں کے بوجھ سے اس کی آنکھ اوپر اٹھتی تھی، نہ کھلتی تھی......

طلسم اس وقت ٹوٹا جب کریمن دودھ کا گرم گرم پیالہ پاشا کے لئے لے کر آئی۔ بڑے سرکار کنڈی چڑھائے بیٹھے تھے۔ کھڑ کھڑ پر دروازہ کھولنے گئے، یہ بھی نہ سوچا کہ کریمن کیا سوچے گی۔ بھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک دیوزاد کی طرح چھایا دیکھ کر کریمن کے ہاتھ پورا گرم گرم دودھ ان کے پیروں پہ گر پڑا۔ ان کے مونہہ سے ''سی'' کی آواز نکلی اور کھلے بالوں کی گھٹا لہراتی مہر آراء اپنے پلنگ پر سے کود چوکھٹ میں کھڑی ہوئی کرمن کے سر پر جا سوار ہوئی اور پورے بیویوں والے انداز میں ڈانٹ کر بولی ''ہوری اندھی ہے کہا؟ وہ تو اچھا ہوا کہ ان کے پاواں میں جراباں تھے۔ ہور کبھی چھالے والے پڑ جاتے تو......؟'' صرف دس منٹ کی قربت نے کس قدر اسے دیوانہ سا بنا دیا تھا۔ لیکن کریمن اس انداز سے کہاں سوچ سکتی تھی۔ اس نے کھلی آنکھوں سے بس یہی دیکھا کہ بڑے سرکار اور پاشا ایک کمرے میں بند تھے۔ اس آنکھوں کی اندھی نے چہرے پر چمکتے چاند دیکھے نہ سانسوں میں مہکتا عطر دیکھا، گالوں پہ کھلتا گلال دیکھا، نہ آنکھوں میں محبتوں کے چمکتے ستارے پرکھے، وہ سب دیکھتی بھی کیوں اور کیسے؟......اس کا تو کام ہی یہ تھا کہ رخصتی تک بس مہر آراء پر کڑی نگاہ اور پابندی رکھے اور لاکھ نکاح ہو بھی چکا تھا، تب بھی اس کا فرض تھا کہ بڑے سرکار اس کمرے میں آنے سے روکے......خدا، رسولؐ کی نگاہ میں تو وہ ایک ہو ہی چکے تھے اور یہ کوئی گناہ انہوں نے کیا نہیں تھا......لیکن دنیا والوں نے بھی کچھ اپنے اصول بنا رکھے ہیں۔ ان کو بھی تو نبھانا ہی پڑتا ہے۔

ہوا یہ کہ مہر آراء چونکہ بے حد حسین تھی اور بصالت جنگ یعنی بڑے سرکا (جو دراصل چھوٹے سرکار تھے مگر [illegible]

میں دیکھ رک دوری صدقے ہو چکے تھے، اسلئے چاہتے تھے کہ کسی بھی حالت میں اس دلہن بنا کر ہی دم لیں...... ادھر مہر آراء بھی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ ایک بڑی جاگیر کے مالک نواب باپ کی بیٹی تھی۔ اس کی اہمیت یوں بھی زیادہ تھی کہ ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی اور پانچ بھائیوں کی بہن تھی...... قاعدے کے مطابق جب بصالت جنگ کا پیام بڑی حویلی میں بھجوایا گیا تو لڑکی والوں کو ان میں ایسی کوئی بات ہی نظر نہ آئی کہ پیام رد کیا جاتا ہر لحاظ سے ہر معیار پر پورے اترتے تھے، لیکن چونکہ یہ بھی ایک حماقت کی رسم چلی آرہی ہے کہ اپنی بڑائی جتانے کو خواہ مخواہ ''ہاں'' کہنے میں دیر کی جائے۔ اس لئے یہی حماقت اس وقت بھی لڑکی والوں نے کی...... اور ویسے یہ حیدر آبار کا پرانا دستور رہا ہے کہ بعض مرتبہ ضرورتاً اور بعض مرتبہ بالکل اکڑ جتانے کو...... بس لڑکی کا عقد پڑھا دیتے ہیں اور رخصتی سال دو سال کے بعد کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ ضرورتاً میں یہ ہوتا ہے کہ کئی بار لڑکی تعلیم حاصل کر رہی ہوری ہے، یا چھوٹی ہوتی ہے کہ شادی کے یا گھر بار سنبھالنے کے قابل ہی نہیں ہوتی لیکن چونکہ یہ دگدا لگا رہتا ہے کہ لڑکا اچھا ہے، ہاتھ سے نکل نہ جائے، اس لئے صرف عقد پڑھوا لیا جاتا ہے اور بعد میں ایک اور زور شور کے ہنگامے کے ساتھ مقررہ مدت کے بعد دولہن کو رخصت کیا جاتا ہے۔ کہاں تو بصالت نگ مہر آراء کے وصال کے لئے مرے جا رہے تھے اور کہاں انہیں بھی اس دوہری شادی کے چکر میں پھنس جانا پڑا۔ یا تو یہ طے کئے بیٹھے تھے کہ شادی ہوگی اور جنت کے مزے لوٹن گے، یا یہ ہوا کہ صرف عقد پہ بات ٹل گئی اور فرقت کی آگ کو دوزخ کی تپش سے بڑھ کر بھگتنا۔

مہر آرا پہ ان کا دل آجانا کوئی ایسی انہونی بات تھی بھی نہیں۔ حسن کی مورت تھی شباب کا عالم تھا۔ پھر انہوں نے تو اسے اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا اور سنا تھا، جو حیدر آبادی اوز یوپی کی ملی جلی زبان بولتی تھی جو ''نکو'' بولتی تھی،...... ''اماں نی'' مگر لہجہ یوپی والوں کا سا تھا جس نے گھر پر رہ کر دہلی والی استانی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ جس نے دور ہی دور سے جلوہ دکھا کر انہیں اپنا دیوانہ بنا لیا تھا اور دراصل ساری گڑبڑ یہی تھی کی مناسبت سے اس نے کپڑے بھی اسے جھل جھل پہن رکھے تھے، زیور بھی ایسا جھکا جھول اور جگر مگر کرتا سجا رکھا تھا کہ نہیں آتا ہوا دل آجاتا۔

پہلے تو دولہا والوں نے بہت ہچر مچر کی۔ بہت باتیں سنائیں کہ شادی رخصتی سب ساتھ ساتھ ہو جائے۔ مگر دولہن والوں کی ایک نہ ہزار نہ.......... وہی اڑ کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے، پڑھ رہی ہے

اور حقیقت یہ تھی کہ ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ یہ ضرور تھا کہ مہر آراء ابھی کلی سے پھول کی مانند کھلی تھی۔ لیکن کیا کم سنی میں شادیاں نہیں کی جاتیں۔ مگر وہاں تو سارا سلسلہ یہ تھا کہ لڑکی کا مان بڑھایا جائے۔ بڑے نواب صاحب کہتے تھے...... ''ادھر پیام آیا ادھر شادی کر دی تو لڑکی کی کوئی خدر نہیں رہتی۔ جب تک جوتے کا تلہ اور چوکھٹ ایرا پھیری میں گھس نہ جائیں...... وہ شادی ہی کیا ہوئی'' اور اب ان کی خواہش کے مطابق مشاطہ بی کا کامدار جوتا گھسنے کے قریب آچکا تھا۔ اور حویلی کی چوکھٹ ان کے جوتے کی رگڑ کھاتے کھاتے دھول اڑانے لگی تھی اور شادی کی تاریخیں قریب سے قریب آرہی تھیں کہ جوانی کی بے تابی کے ہاتھوں یہ گل کھل گیا۔

کریمن باہر دوڑنے کو لپکی کہ کسی نہ کسی کو یہ راز سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرے کہ بڑے سرکار نے کس کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ پہلے ہی باولی ہو رہی تھی۔ اب تو بالکل ہی گڑبڑا گئی۔

''پہلے وعدہ کرو یہ بات کسی سے نہ کہو گی'' ایک تو بڑے سرکار کا رعب داب ہی ایسا تھا۔ اس پر دہلی والی ماں کے بیٹے تھے کہ بات کرتے میں جن کے منہ سے پھول جھڑتے تھے...... کریمن کے منہ سے کچھ نکلتا تب نا جب تک وہ اپنا بٹوہ اس کے حوالے کر چکے تھے جس میں کئی سو حالی روپے جھن جھنا رہے تھے۔

پیسہ اگر سب سے بڑی طاقت نہیں تو بہت بڑی طاقت ضرور ہے۔ کریمن نے اپنا منہ سی لیا۔ لیکن مہر آراء جو نرم گرم بوسوں کے سحر سے اب آزاد ہو چکی تھی پریشان ہو کر بولی:

''ہور کچھ ہو گیا تو جی؟''

اس ''کچھ'' کا مطلب خود بڑے سرکار بھی اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن اس سہاگ رات کا سحر جو وقت سے کچھ پہلے ہی آچکی تھی، ابھی تک نہ ٹوٹا تھا وہ الھڑ پن سے بولے...... ''تو کیا ہوگا؟...... ہم ایک بیٹے کے باپ بن جائیں گے۔''

باوجود پریشانی کے مہر آراء کو ہنسی آگئی۔ لیکن یہ ہنسی جلد ہی ساتھ چھوڑ گئی۔ اسے اپنی ایک ساتھ کھیلی سہیلی کی واردات اچانک یاد آگئی، جس کا اسی کی طرح نکاح ہوا تھا، رخصتی ہونی باقی تھی کہ کسی نہ کسی تاک جھانک میں وہ دولہا میاں کے ہتھے چڑھ گئی...... اور خدا کا کرنا اس کا پیر ''بھاری'' ہو گیا...... اب کون گواہی دیتا کہ یہ گناہ نہیں تھا اور اسی بچہ تھا جس کو خدا رسولؐ کے نام سے اس کی زندگی کا حصہ دار بنایا گیا تھا۔ مگر ایسی بدنامی ہوئی کہ پھر اس کا چاہنے والا بھی رخصت کرا کر نہ لے گیا...... کہیں وہی حشر اس کا بھی نہ ہو...... اس نے گہرے شبہ کے ساتھ سر اٹھا کر بڑے سرکار کو دیکھا...... لیکن اسی لمحے اسے وہ جملہ یاد آگیا...... ''ہم تو مرد ہیں مرد...... اور جانتی ہو

مرد آداب کا جواب کس طرح دیا کرتے ہیں......؟''

ایک دم اس کا دل سارے وسوسوں سے پاک ہو گیا۔ جس کا مرد اتنے تہے کا ہو اسے کیا ڈر؟

اس کا دل نشے میں ڈوب گیا۔

دونوں باتیں ایک ہی ساتھ ہوئیں......اس دن مہر آراء صبح کو اٹھی، تو حسب معمول مونہہ دھونے حمام میں گئی۔ وہاں اسے آپی آپ قے ہو گئی۔ متلی کے شدید جھٹکوں نے اسے بے حال کر کے رکھ دیا اور اسی دن لڑکے والوں کے یہاں سندیسہ آیا کہ بھئی اب کب تک معاملہ لیت و لعل میں رکھئے گا۔ عقد کو پورے تین برس گزر چکے ہیں، خیر سے صاحبزادی بھی اپنی تعلیم پوری کر چکی ہیں اور اب اس سن میں آ چکی ہیں کہ ایک بیوی، بو اور ماں کے فرائض انجام دے سکیں......اس لئے اب بسم اللہ کیجئے۔

اماں بی بھی سوچ بچار کر کے بسم اللہ تو کرا دی، مگر ساتھ یہ بھی نیوتا بھجوا دیا کہ ''ہماری اکلوتی ایک بچی ہے، سارے ارماناں ہم نا اس پر نکالنا ہیں اس واسطے ابھی جہیز کپڑا لتا تیار کرنے کو ہم نا نئیں کچھ دو تین مہینے تو دیو۔''

جب تین سال انتظار کیا تو تین ماہ کی کیا بات تھی؟ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں عروج پر آ ئین۔ عقد کے وقت کے گہنے پاتے، کپڑا سب بے کار قرار دیا گیا......نئے سرے سے مہر آراء کو دولہن بننا تھا۔ اسی لئے نئے سرے سے سب جوڑ جماؤ شروع ہوا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ حیدر آباد کی تاریخ میں ایسی گہا گہمی، ایسا ہنگامہ، ایسا رکھ رکھاؤ، ایسا جھم جھکا، ''کسی جنگ'' کے یہاں شادی میں دیکھنے میں نہ آیا......دولہن والوں کی حویلی جو اتنی بڑی تھی کہ کوئی دیکھنے کو اٹھتا تو حویلی کے اندر ہی اندر صبح سے دو پہر ڈھل جاتی، جگر جگر کر رہی تھی......ہر کمرہ جہیز سے اٹا پڑا تھا......اس کمرے میں صرف کپڑے، اس میں زیور، اس مین برتن، اس میں نوادرات، اس میں امک......اس میں دھمک......پھر یہ تھا کہ ایک کمرے میں صرف دوپٹے ہی دوپٹے......کھڑے، آڑے، گوٹا لگے، کنارے لگے، کرن بانکڑی ٹنکے......دوسرے میں کرتے، جھپا جھپ، کامدانی، کارگے، چکن، آب رواں، جاپانی ریشم، مسالے، چمکی، سلمہ ستارے کے کام والے......اسی طرح ہر ہر کمرے میں الگ الگ سجاوٹ تھی۔ عقد تو ہوا ہوایا تھا ہی۔ صرف یہ تھا کہ دلہن کو سجا سنوار کر مع جہیز کے سسرال وداع کرنا تھا۔

[illegible]

نچھاور تھا۔ چال میں وہ دلفریبی اور مستی آ گئی تھی۔ جو خدا نے صرف ماں بننے والی عورت ہی کے لئے رکھ دی ہے۔

دولہن بنی ہوئی مہر آراء کو دیکھنے کی خاطر سارے حیدر آباد کی بیگمات اُمڈی پڑ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ سارے سنگھا ختم ہوئے اور خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی جب مہر آراء کو بیچ ہال میں جانا تھا۔ مغلانی بی نے پیچھے سے جھکا جھول پائینچے سنبھالے۔ کم خواب کا غرارہ تھا اور گوٹے سے اتنا لدا پھندا تھا کہ دولہن کو سنبھالنا بار تھا......سہیلیوں نے پلو تھامے......آہستہ آہستہ دولہن چلی......ایک قدم، دو......

اس دم دولہا والیوں میں سے کوئی بولی......''ایو یہ دولہن کیسی چلی رئی لی......جیسے مہینے دو مہینے ہو کو گئے۔''

ایک کے منہ سے نکلی، دوسرے کے منہ چڑھی......دوسرے سے تیسری......اور تیسری سے چوتھی......اور پھر تو کھلبلی سی مچ گئی۔ آخر کوئی ڈھٹائی سے پکار کر بول ہی اٹھی......

''ایوانے دولہن تو حمل سے ہے جی پاشا۔''

یہ وہ وقت تھا کہ مردانے سے دولہا میاں سہرا باندھے، سجے، سنورے، شہزادے سے بنے، زنانے میں لا کر زریں دیوان پر بٹھائے ہی گئے تھے۔ اپنی جگہ وہ بھی ٹھٹھک سے گئے۔ دولہن کی اماں بی کا کلیجہ پانی ہوا جا رہا تھا۔ حیدر آباد میں ایک ہی گھرانے اتنی اونچائی پر ہوں گے اور ایسی بھد۔

''ایو مہر آراء......یہ تو نے کیا کر دی گے......؟ یہ بدنامی کا ٹیکہ کاں سے لائی گے......اب تیرے کو کون بیاہ کر لے جانے والا......یہ عمر بھر کیسا نکٹا کری گے۔'' یہ بین ان کے دل سے پھوٹ رہے تھے۔ مونہہ پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ سکتے کا سا عالم طاری تھا۔

دولہن والیوں میں سے کوئی کفن پھاڑ کر چیخی......''کون چھنال بولی کہ پاشا پیٹ سے ہیں......بولے والچ ہوں گی خود......یہاں کے یہاں ایسا سلوک کر رئیں تو سسرال میں لے جا کو تو خوب خدر کریں گے یہ لوگاں......ایو سنو تو ذرا بولتیں صاحب زادی امید سے ہیں......''

اس کی چیخ و پکار پر کسی نے یہ کیا کہ دائی بوا کو سامنے لا کھڑا کیا۔ ایسی شادی مہمانی کے موقعوں پر یہ تو ہوتا ہی ہے کہ ایک سرے سے پورا گھر ہی سمدھیانے میں اُمڈ پڑتا ہے۔ نوکر چاکر سے لے کر بیٹھیں۔ مغلانیاں، دائیاں تک

ے تین

ماہ چڑھ چکے تھے۔ چہرے پر چاند چمک اٹھا تھا۔ انہوں نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھا اور بڑی بے پروائی سے کہہ دیا............''

''ایو مبارک نباب ساب، چھ ماہ بعد سونے کے کڑے لیوں گی اور ہاتھان بھر بھر چاندی کے چوڑیاں'' ......

یہ ایسی بات تھی جس نے اماں بی کے حواس لوٹ لئے۔ پورے شہر کے لوگوں کے سامنے کیسی تھڑی تھڑی ہو رہی تھی...... مولا بس چلتا تو اس پیٹ کو لوٹی اولاد کو کچا چباڑ نہ کھاتیں، جس نے آج ناک یوں کاٹ کر رکھ دی تھی...... شیرنی کی سی گرج کے ساتھ وہ لپکیں اور ایک جھٹکے سے مہر آراء کا گھونگھٹ نوچ کر دور پھینک کر بولیں:

''کس کا اٹھا کر لائی یہ بیج...... بول نا نکٹی!''

مہر آراء نے زریں دیوان پر بیٹھے بصالت جنگ کی طرف بڑھی اس بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے تپتے ذہن پر یادوں کی حسین پھوار برسی...... ''ہم تو مرد ہیں مرد......'' یہ مرد اگر اپنی زبان کھول دے اور سب کے سامنے کہہ دے۔ ''یہ پھل میرا ہے'' تو وہ کس قدر سرخرو ہو جائے، کتنی اونچی ہو جائے۔

لیکن ان معصوم نگاہوں کی تاب نہ لاکر، بصالت جنگ نے سر جھکایا۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے ان کی ہمت جواب دے گئی...... وہ کیسے بدنامی کا اتنا بڑا بوجھ اٹھا لیتے؟......

عین اسی وقت بھیڑ کو چیرتی ہوئی کریمن آئی اور پھولی سانسوں کے درمیان بولی

''میرے کو سب معلوم ہے، میری پاشا بھوت بھولے ہیں۔ یہ سارے کرتوں انوں کے ہیں جو سہرا باندھ کر پھول سجائے کو بیٹھیں۔''

لیکن مہر آراء نے ایک دم کریمن کو اپنی طرف گھسیٹ لیا اور بے حد حقارت سے بصالت جنگ کی طرف اشارہ کر کے بولی...... ''میرے پیٹ میں اور اس کا پھل؟...... اس نامرد کا......؟ یہ تو ہیجڑہ ہے ہیجڑہ......''

بھری محفل میں پٹس پڑ گئی اور بصالت جنگ کا جھکا ہوا سر زندگی بھر کے لئے جھک کر رہ گیا......

* * *

لڑکی بازار

حیدرآباد کن کی ایک جگمگاتی صبح تھی۔ آفتاب ابھی کچھ جھلکا تھا، کچھ چھپا تھا۔ اسی دم باغ شاہی سے ایک ڈھنڈورچی سفید کھڑک پاجامہ، سفید ململ کا کرتا پہنے، ترچھی ٹوپی لگائے، سلیم شاہی جوتیاں پہنے بڑی فصیح و بلیغ زبان میں۔ ڈھنڈورا پیٹتا ہوا نکلا......''

''لڑکیوں والی ماؤں سے استدعا ہے کہ کل بروز جمعہ بعد نماز عصر، حسب سال سابق، اپنی اپنی بیٹیوں کو بہ احد امکان خصوصی لباس اور پر تکلف آرائش و زیبائش کے ساتھ باغ شاہی میں منعقد ہونے والے مینا بازار میں لے کر موجود ہو جائیں۔ باغ شاہی میں داخلے کی کوئی رقم نہیں ہے۔ بگھیاں، شکرامیں، ہاتھ رکشا، جو، جو بھی بیبیوں کو لائیں گے، کرایہ باغ شاہی سے وصول پائیں گے۔ اس طرح ماؤں کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ کل کی شاہی سر انہیں بالکل مفت پڑے گی۔'' ٹن ٹن۔ ٹناٹن۔ ٹن

جدھر جدھر سے ڈھنڈورچی ڈھنڈورا پیٹتا گزرا، ماؤں کے کلیجے دہلتے گئے۔

''کل کی شاہی سیر انہیں بالکل مفت پڑے گی۔ اس ''بالکل مفت'' نے ماؤں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے ابلوا دیئے۔ چلئے مان لیا باغ شاہی میں داخلے کی کوئی رقم نہ ہوگی، جس بگھی یا شکرام یا ہتھ رکشا میں آپ سوار ہو جائیں گی۔ اس کا کرایہ تک حبیب یار جنگ ادا کریں گے۔ سیر سپاٹا کرنے میں جو بھی چیز آپ کو پسند آ جائے گی، آپ اسے مفت ہی لے بھی سکیں گی۔ لیکن اس مفت کے بدلے انہیں جو کچھ دینا ہوگا وہ کوئی بھی ماں ہنسی خوشی کبھی دے بھی سکی ہے؟ لیکن دیئے بنا چارہ بھی کیا تھا؟۔ یہاں سے وہاں سے ہر گھر سے گھٹی گھٹی چیخوں اور آہوں سے اس جگمگاتی صبح کو گجلا کر رکھ دیا۔''

سر شام فانوس کی روشنی سے جب نور محل جھم جھما اٹھا تو حبیب یار جنگ اپنی بڑی سی توند

سنبھالے اپنی مخصوص چال سے چلتے نرم نرم دیوان پر آ کر بیٹھ گئے جس پر کامدار مسند بچھی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیہ ان کی پیٹھ کے بوجھ سے بیچ سے ذرا دب کر ابھر آیا تھا۔ سونے کا سلمہ، چاندی کے تارے پھر رہ کر جھلملانے لگی۔ خادم نے بڑے ادب سے ان کے آگے سونے کی کشتی میں نارنجی رنگ کی انگریزی شراب کی بوتل اور کٹ گلاس کے جھلکتے جام لا کر رکھے (کہ حضور کا کہنا تھا، شراب تو بس شیشے ہی میں مزہ دیتی ہے یہ بھی کوئی بادام کا حریرہ ہے کہ جسے سونے کے پیالے میں پیا جائے)

قریبی مسجد سے آذان کی آواز بلند ہوتے ہی ایک طرارسی خادمہ تلے ہوئے سرخ سرخ کبابوں کا طشت اٹھائے لچکتی، بل کھاتی آئی اور اسی حرام زدگی سے مٹکتی واپس چلی گئی۔ افطار کی نیت پڑھ کر نواب صاحب نے شراب سے روزہ کھولا، اور تالی بجا کر ایک کادم کو طلب کیا خادم تقریباً دہرا ہو کر آیا۔ اسنے نواب صاحب کو سر اٹھا کر دیکھا ہی نہیں کہ ان کے چہرے کا غیض و غضب دیکھ پاتا اس لئے جب کڑک دار آواز میں نواب صاحب نے پوچھا۔ ''ہو جناب وہ مرزا صاحب کہاں مر گئیں؟''۔ تو وہ یونہی کانپتا ہوا بولا۔ ''دیکھتا ہوں سرکار۔ اینچ گیا کی اینچ آیا''

یہ نواب صاحب کے غصے کی انتہا ہوتی تھی کہ وہ کسی نوکر کو جناب کہہ کر مخاطب کرلیں۔

مراز صاحب بھی تقریباً اسی انداز سے محل میں وارد ہوئے۔ لیکن نواب صاحب مخاطب کرنے پر انہوں نے البتہ ان کے چہرے کو دیکھنے کی سعادت ضرور حاصل کی۔

''خادم حاضر ہے۔''

''حاضر ہے تو کہا میں چاٹوں خادم کو؟ حضنت میں آپ کو صبح ہی بولا تھا کہ دن بھر کے روزے کے بعد شام تک میرا مزاج بہت گرم ہو جاتا ہے، پر آپ کو تو کچھ یاد ج نہیں رہتا۔''

مرزا صاحب نے جوڑے ہوئے ہاتھ سراسیمہ ہو کر ایک بار کھول کر پھر باندھ لئے۔ وہ اب تک بھی سمجھ نہ پائے تھے کہ ان سے کیا خطا سرزد ہو گئی ہے۔ نواب صاحب خود ہی چیخ پڑے۔ ''میں آپ سے بولا تھا کہ پچھلے سال میں جتنی بھی شادیاں کیا تھا ان سبھی کو آج رات میں طلاخ دینا ہے۔ سو آپ وہ ناماں کی فہرست تیار کرے کیا نئیں؟''

مرزا صاحب کے دم میں دم آ گیا۔ ''جی بندہ پرورہ تو میں دوپہر میں اچ پوری کرلیا۔''

''تو وہ آپ میرے کو لا کر تیجئے۔ میں تراویح کی نماز کے بعد سب کو بلا کر طلاخ دے دوں گا۔''

''بہت بہتر حضور [illegible]

''پر نہ پرندہ۔'' نواب صاحب گرجے۔ پھر انہوں نے شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور کچھ نرم پڑ کر بولے۔ ''پر کیا؟''

''وہ حضور چند بیگمات امید سے بھی ہیں۔''

''تو اسی لئے تو طلاخ دینا ہے کہ ہمیں شبہ ہے یہ بچے ہمارے نہیں۔ بدچلن عورتوں سے کوئی کیسے نباہ کرسکتا ہے؟ قرآن شریف میں آیا ہے کہ جب مصالحت اور معاملت کی کوئی شکل باقی نہ رہ جائے تو طلاخ جائز ہے۔''

مرزا صاحب نے دبدبے کے ساتھ نواب صاحب پر نگاہ ڈالی۔ مرزا صاحب تھے تو نوکر، مگر نواب صاحبکی ناک کے بال بھی تھے۔ چونکہ معمر بھی تھے اس لئے غصہ تیہا کرنے کے باوجود نواب صاحب ان کی عزت کرلیا کرتے تھے اور ان کی اکثر بائیں مان بھی جایا کرتے تھے۔ اور نہ مانتے تو کرتے بھی کیا؟ ان کی پرائیوٹ زندگی تقریباً ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔

تراویح کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد نواب صاحب نے باجماعت اپنی کمسن بیویوں کو طلب کیا۔ ننھی منی لڑکیان جنہوں نے کوئی نیچ اونچ نہ دیکھی تھی۔ جن میں سے کئی نے پاکی کا پہلا غسل بھی اسی محل میں آ کر لیا تھا۔ جن کے چہروں پر بے کسی کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں، لائن سے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ نواب صاحب نے ایسی اجنبی نظریں ان چہروں پر ڈالیں جیسے کبھی ان سے کوئی شناسائی نہ رہی ہو۔ مرزا صاحب فہرست ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ نواب صاحب کے اشارے پر انہوں نے نام پڑھنے شروع کئے:

عائشہ بیگم۔ عمر پندرہ سال

(''میری نوخیز جوانی کا رس پہلے پہل آپ نے چوسا، میری اولین بہار کے پھول آپ نے چنے اور آج آپ کو طلاق دیتے ہوئے میرا نام تک یاد نہیں آتا۔'')

لیکن بھولے بھالے چہرے کی ایسی کوئی ان کہی تحریر نواب کی آنکھ سے نہ پڑھی گئی۔ انہوں نے بے حس آواز سے فرمایا۔ ''عائشہ بیگم ہم آپ کو تین بار طلاخ دے کر اپنی عخد (عقد) سے باہر کرتے ہیں''۔ اور انہوں نے ایک کاغذ ان کے ہاتھوں میں پکڑا دیا اور گویا ہوئے۔ ''مگر آپ کو تا زندگی ہماری جاگیر سے دس ہزار روپے ماہانہ آپ کے نان نخے یعنی آپ کی گزراوخات اور بال بچہ کوئی جیا بچا تو اس کی پرورش کو ملتے رہیں گے حالانکہ ہم کو شک ہے کہ آپ کے بطن میں ہمارا بچہ ہے۔ اپنے اپنے طرف اور اوخات (اوقات) کی بات ہے۔ ہم سے ایک سال میں کوئی بھول

چوک ہوئی ہوتی تو ہم خود معافی مانگ لیتے، مگر ہم کو معلوم ہے کہ اس محل میں آپ کو کوئی دکھ نہیں پہنچا۔ خدا حافظ۔"

سیلمہ بیگم۔ عمر 14 سال
رئیسہ زمانی۔ عمر 15 سال
قمر سلطانہ۔ عمر 16 سال
پیاری بی۔ عمر 13 سال

مبارک بیگم۔ زہرہ بی بی۔ فاطمہ بیگم۔ ثریا۔ نشاط آراء۔ مرزا صاحب نام پکارتے گئے اور نواب صاحب سب کے ہاتھوں میں ان ہی بندھے تلے جملے کے ساتھ طلاق نامے پکڑاتے گئے۔ کسی کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ کوئی چہرہ پھول سے کم نہ تھا، کوئی نگاہ ایسی نہ تھی جس میں فریاد نہ ہو، کوئی لب ایسا نہ تھا کہ دادرسی کے لئے دانہ ہونا چاہتا ہو۔ لیکن کیسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ آنکھ اٹھا کر بات کرنے کا بھی حوصلہ ہوتا کہ یہی اس محل کا قانون تھا۔

تھوڑا بہت چھوڑ کر تقریباً پاؤ حیدرآباد حبیب یار جنگ کی جاگیر میں شامل تھا۔ ان کی جاگیر میں کوئی پیدل چلنے کو کھڑا ہوتا تو ادھر کا سورج ادھر ہو جاتا مگر وہ سلطنت ختم نہ ہوتی۔ ان کے بڑوں نے شاہوں کا دل جیتا تھا، اس کے صلے میں جاگیریں اتنی بخشی گئیں، اتنی بخشی گئیں کہ پھر ان کے نام تک یاد نہ رہے۔ قدم قدم پر ان کے بڑوں کی تعمیر کردہ کوٹھیاں، حویلیاں اور ڈیوڑھیاں تھیں۔ اور ان سے متصل نوکر خانے پھر یہ تھا کہ جہاں ان کی حکومت بڑھتی گئی وہ چھوٹے چھوٹے جہان آباد کرتے گئے۔

حبیب یار جنگ کے دادا حیدرآباد کے تاجدار کی ناک کا بال تھے۔ انہوں نے، کہتے ہیں اپنا محل تاجدار دکن کی مرضی سے ہی (چوری سے نہیں) اس طرح بھرا تھا کہ عام طور سے ڈیوڑھیوں میں، آہنی پھاٹک سے لے کر مردانی بیٹھک تک ڈرائیوے کے آزو بازو جو سرخ کنکری والی بجری بچھی ہوتی ہے، ہر جگہ ان کے محل میں دو رویہ موتی مونگے، ہیرے جواہر بچھے ہوئے تھے۔ جن کو چرانے کی کسی میں کیا ہمت ہوتی کہ بری نظر ڈالنے والے کا شبہ ہوتے ہی کوڑوں سے مار مار کر بھرتا نکال دیا جاتا۔

جتنی بھی ڈیوڑھیاں، کوٹھیاں اور حویلیاں تھیں وہ سب حبیب یار جنگ نے کرائے پر اٹھا دی تھیں، کیونکہ جتنے بھی کرایہ دار تھے سب انہی کی جاگیر کے ملازم، انہی کی رعیت جنہیں سر اٹھانے کی

مہلت صرف خدا کے سامنے تھی کہ آسمان کو دیکھیں اور اپنی بدنصیبوں کا شکوہ کریں، نواب صاحب کے روبرو تو ان کے سر صرف جھکنا ہی جانتے تھے۔

مہتاب نے زری گوٹے سے لپا پتا جوڑا اٹھا کر دور پھینک دیا اور چلا کر بولی، "میں کہیں نہیں جاؤں گی امی"

"نہیں جائیں گی تو بن موت مریں گی۔ کیا تیرے کو معلوم نہیں اس احاطے میں بسنے والیوں کو اس سالانہ جلسے میں شامل ہونا اچ پڑتا ہے؟"

"میرے کو سب معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس بازار میں جانے کا مطلب ہے، اپنی زندگی کی خوشیاں اپنے آپ پر حرام کرلیو۔"

مہتاب کوٹلہ عالی جاہ کی دہم جماعت کی ہونہار طالبہ تھی اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔

سکینہ بیگم نے رحم بھری نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا۔

"اتی سمجھ دار ہو کر بھی تو کیوں ایسے ناسمجھی کے باتاں کرئی تابی، میری سمجھ میں نہیں آتا"

تابی مٹھیاں تان کر چلائی، "امی آپ کو معلوم نہیں کی میری شادی ہو چکی؟"

سکینہ بیگم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، "اری نیک بختی ذرا ہلو بول، کوئی سن لیا تو نوی مصیبت کھڑی ہو جائیں گی۔"

تابی نے زبردستی ان کا ہاتھ منہ پر سے ہٹا کر اسی ڈھٹائی سے کہا "اور نواب صاحب کبھی میرے کو پسند کر لئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں انہوں کے حرم میں زبردستی داخل کر لی جاؤں گی اور ایک بیاہتا دلہن ہو کر دوسرے کی دلہن کیسے بنوں گی۔ ویسے تو آپ بڑے مذہبی بنتے نا امی، مگر اب کیوں ہلو چپ رہ گئیں۔ بھلا یہ کوئی مسئلہ ہے کہ دو دو مردوں کی اپلچ بیوی؟"

"مگر بیٹا میرے کو یہ بتا اپن نئیں جائیں گے تو کیا بچ سکیں گے؟ کٹنیاں تو ہر گھر کی ٹوہ لے لے کر پھرتیاں ہیں۔ کبھی نواب صاحب کو پتہ چل گیا کہ مراد میاں کی بیوہ ایسا اندھیر کرئیں کہ جوان بیٹی ہوتے ساتے مینا بازار کو نئیں لائیں تو اپن تو بن موتا مر جائیں گے"

"ویسے بھی یہ زندگی بڑی اچھی ہے کیا کہ دوسروں کا مونہہ دیکھ دیکھ کر بات کرو، میں تو آج سوچ لے کر بیٹھی ہوں کہ جاؤں گچ نئیں۔"

سکینہ بیگم سخت بےزار ہو بیٹھیں۔ ان کی عقل سے ہر شے بالاتر ہو رہی تھی۔ کوئی مصیبت سی

مصیبت تھی؟ اصل قیامت تو یہ تھی کہ مہتاب جو کوٹلہ عالی جاہ کی ایک ذہین اور ہونہار طالبہ تھی اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نڈر اور بے باک، اس نے سکینہ بیگم کو پیار و محبت سے رام کر کے گزشتہ سال ہی (کہ بس ابھی اس کے چہرے کا چاند چمکا ہی تھا) چپ چپاتے اپنے خالہ زاد بھائی طاہر سے شادی رچالی تھی یہ شادی عرس کے موقع پر ہوئی تھی جب اطراف کی ہلڑ بازی میں لوگوں کو پاس پڑوس میں تانک جھانک کا ذرا کم ہی دھیان آتا ہے۔ اور ویسے بھی اگر کسی گھر میں ایک ٹانگے میں لد کر چار پانچ آدمی ایک آدھ قاضی کو بٹھا لے آئیں تو یہ ایسی سنسنی خیز بات نہی ہے کہ سب کی توجہ بٹ جائے۔ موٹر ہوتی تو الگ بات تھی۔ مگر شکرام اور ٹانگہ تو بری معمولی سی بات ہے۔ مہتاب تو چاہتی رہی کہ کسی طرح بلدہ چھوڑ کر بھی نکل ہی جائے۔ لیکن ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ پورے سال نواب صاحب کی مقرر کی ہوئی کٹنیاں، لڑکیوں والے گھروں کی ٹوہ لیتی پھرتی ہیں اور ایسے میں کسی کا شفٹ کر جانا ممکن ہی نہیں تھا سفر حضر کے لئے بھی ایک مرحلہ سر کرنا پڑتا تھا اور خاص طور سے ان بے کس خواتین کے لئے جو نواب صاحب کی عمل دار میں رہتی تھیں۔ جن کے خاوند کبھی نواب صاب کے ملازم تھے اور جو برے وقتوں کے ہاتھوں بیوگی کی زندگی گزار رہی ہوتیں۔ سکینہ بیگم ان ہی میں سے ایک تھیں، طاہر نے ایک بار یہ تجویز پیش بھی کی تھی کہ چپ چپاتے نکل جائیں۔ اللہ کی اتنی بڑی دنیا میں کون کسے پہچاننے چلا ہے۔ لیکن سکینہ بیگم لرز گئی تھیں، وہ جانتی تھیں کہ نواب صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ کہیں نہ کہیں سکینہ بیگم لرز گئی تھیں، وہ جانتی تھیں کہ نواب صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے کھوج نکلوائیں گے اور چوری چکار کے غلط سلط الزام میں اس طرح دھنسوا دیں گے کہ ساری عمر چکی چلاتے گزر جائے گی وہ اپنا بڑھاپا خوار نہیں کرنا چاہتی تھیں وہ صبح سے مر مر کر مہتاب سے یہی کہہ رہی تھیں کہ بس ذرا ایک گوٹے زری کا جوڑا پہن ڈالیھلے سے ساج سنگار مت کر ایسی کونسی حور پری ہے کہ نواب صاحب ریجھ ہی جائیں گی۔ سانولی سلونی صورت تو ہے ہتھیلی بھر تیل لے کر سر میں چپڑ ڈال۔ ایسی اتری دال ایسی صورت دیکھ کر کیا آپے سے باہر ہوں گے؟ بس ذرا راہداری سے گزرنے تک کی تو بات ہے۔ (مینا بازار کے دن نواب اپنی گدی والی زرکار آرام کرسی عین داخلے والی راہداری میں رکھواتے تھے تاکہ باغ شاہی میں داخل ہوتے ہی ہر صورت ان کے سامنے آجائے اردیوں فیصلے میں آسانی رہے کہ یہ شکل اس لائق ہے یا نہی کہ اسے زینت حرم بنایا جائے) اور جوڑا اس نے دور اٹھا کر پھینک دیا اور اس بات کو سراہنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھی کہ مغلانیوں نے کس صفائی ارو نفاست سے ایسے کتنے سارے

جوڑے تیار کئے ہوں گے اور حساب کی ماہر طالبہ ہوتے ہوئے یہ تک جوڑے کو تیار نہ تھی کہ ایسے ایک جوڑے پر اندازاً کتنی لاگت آئے گی۔

مگر جو بات ہونی تھی وہ ہو کر رہی۔ مہتاب لاکھ سانولی سلونی تھی، تیل سے چپڑی ہوئی تھی، لیکن نواب صاحب کی آنکھ بھی ہیرے پرکھنے میں کچھ کم پارکھ نہ تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ اس سانولی بدلی کے پیچھے کونسا چاند چمک رہا ہے۔ انہوں نے تو سکینہ بیگم کو روک کر پیغام ٹھونک ہی دیا۔

دوسرے دن محل میں طلبی تھی۔ اسی رات طاہر میاں عید کے لئے ایک ہفتے کی چھٹی پر آئے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی دیکھا کہ گھر میں ماتم پڑا ہوا تابی نے چیخ چیخ کر اپنے کو بے حال کر لیا اور رامنی الگ سوخت بنی بیٹھی ہیں۔ طاہر کہ جوان خون تھا اور پہلی پہلی محبت کا شدید زخمی۔ چلا کر بولا ”میں اس خبیث بڈھے کو قتل کر دوں گا“

سکینہ بیگم نے ہول کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ایو بیٹا پاس پڑوس کا تو کچھ خیال کرو“

”جی نہیں خالہ جان، یہ عیاشی اور ظلم کی انتہا ہے۔ میں سمجھ لوں گا...... آج کی آخری گاڑی سے ہی تابی کو دہلی لے کر نہ چلا جاؤں تو اپنے باپ کی اولاد نہیں۔“

”ہور یہ بات تم بھول گئیں کہ آنچ نواب صاحب تابی کو پسند کر لے کو بیٹھے ہیں؟“

”یا تو نواب صاحب نہیں یا مُن نہیں۔“ وہ جذبات میں آ کر بولا۔

بڑے رسان س سکینہ بیگم بولیں، ”میرے موںہہ میں خاک، کیا تمہارے نئیں ہونے سے یہ سلسلہ ختم ہو جائیں گا کیا؟ تم اکیلے اپنی جان سے چلے جائیں گے میاں اور کیا ہوئیں گا؟“

”مگر خالہ جان......“ طاہر روہانسا ہوا اٹھا...... ”للہ ذرا سوچئے، کس قدر ذلیل بات ہے کہ سال بھر اپنی عمل داری میں عورتیں بھجوا بھجوا کر ٹوہ لگوائی جائے کہ کون کون سے گھروں میں لڑکیاں بالغ ہو رہی ہیں اور پھر ایک بازار منعقد کروا کے لڑکیاں پسند کی جائیں اور جبراً انہیں اپنے عقد میں لے لیا جائے اور پھر سال بھر ان رس چوس کر پھوک بنا کر مذہب کے نام پر طلاق دے کر چلتا کر دیا جائے اور پھر نئے نئے پھول، باغوں سے چنے جائیں، حد ہو گئی حد......“ ایک دم وہ پاگلوں کی طرح چلا اٹھا...... ”میں تابی کو کہیں نہیں جانے دوں گا وہ میری دولہن ہے......“

سکینہ بیگم بڑے سکون سے بولیں، ایسے چیخاں نکو مارو میاں...... میرے اتا حوصلہ نئیں کہ نواب صاحب سے ٹکر مول لیوں۔“

وہ جل گیا...... ”میں آپ سے ٹکر لینے کو کب کہتا ہوں؟ تابی میری بیوی ہے بھگت لوں گا۔“

تابی اس بحث کے دوران میں خاموشی سے بیٹھی رہی۔ اس کا وہ سارا طنطنہ اروتنہا مینا بازار سے واپسی پر ہی جیسے ختم سا ہوکر رہ گیا تھا۔ طاہر کے آخری جملے پر وہ چونکی اور دھیرے سے بولی، اللہ طاہر آپ ایسے باتاں نکو کرو۔ آپ میرے واسطے کائے کو بھگیو...... میں آنچ اپنی جان ختم کرلیتیوں...... نہ بانس رہے گا نہ بنسری بجیں گی......“

”ارے واہ! طاہر تپے ہوئے لہجے میں بولا......“ گویا انسانی جان کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ ایسے کیسے تم اپنے آپ کو ختم کروگی؟“ وہ جیسے ساس کی موجودگی سے بے خبر ہوگیا...... یہ تمہارا پھول ایسا نوخیز بدن جس پر میرے بوسوں سے بھی نیل پڑ جاتے ہیں، جس نے ابھی ماتا کا خوشگوار بوجھ بھی نہیں اٹھایا، جس کو ابھی میری بانہوں کے شکنجے میں ٹھیک سے کسنا بھی نہیں آیا، وہی پھول ایسا نازک بدن، اس خبیث کی آغوش میں؟ تھوتھو...... میں ایک بار مل کر پہلے تو سمجھاؤں گا اور پھر......“

وہ کہتا گیا...... تابی سنتی گئی......“

عید میں تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ سحری کے بعد مرزا صاب نے ذرا سونا چاہا مگر آنکھ نہ لگ سکی۔ کاموں کا اک انبار ان کے سر پر سوار تھا۔ نور محل کی صفائی...... دہری صفائی...... ایک تو کچرا جھاڑ جھنکار مکڑیوں کے جالے صاف کرانا، گرد اڑوانا وغیرہ، اور دوسری صفائی یوں کہ رہی سہی پرانی بیگمات کو نکلوانا، پھر نئی بیگمات کے لئے پوشاکیں سلوانا...... ”لاڑ بازار“ کے بار بار چکر مارنا کہ نگوں کے چوڑیوں کے جوڑوں، مسی افشاں سے لے کر مہندی، مسالوں تک کی برابری کرانا۔ پھر عود کی دھونی میں پوشاکوں کو بسانا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ...... نواب صاب ان معاملات میں مغلانیوں تک پر اتنا بھروسہ نہ کرتے جتنا مرزا صاحب پر۔ وہ بھی اصل میں برسوں سے یہ فریضے انجام دیتے دیتے منجھ گئے تھے۔

صبح ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے کو تھی۔ انہوں نے اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی، اور ذرا لیٹے ہی تھے کہ دراز ے پر کھٹکا ہوا...... وہ ذرا حیران بھی ہوئے...... اس وقت کون ان سے ملنے آیا ہوگا؟ پھاٹک پر چاوش نے روکا بھی نہیں آنے والا سیدھا میرے کمرے تک چلا آیا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ وقت میرے آرام کا ہوتا ہے...... ذرا دبدبے کے ساتھ انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر ایک خوبصورت تنومند جوان لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ وہ ذرا معذرت کے ساتھ بولا......

”مجھے معاف کیجئے آپ کے آرام میں مخل ہوا، لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ نواب صاحب تک آپ کی بہت رسائی ہے۔ کیا آپ مجھے ان سے ملنے کا ایک موقع دلوا سکیں گے؟“

مرزا صاحب اتنی لمبی بات سے ذرا خائف ہوگئے۔ وہ الجھ کر مگر ضبط سے بولے...... ”میاں تم ہو کون؟ آئے کیوں؟ کام کی نوعیت بولے نئیں، میں کیسے نواب صاحب سے آپ کو ملا دیوں؟“

جی میں ایک غریب طالب علم ہوں...... وظیفے وغیرہ کے سلسلے میں باریابی چاہتا ہوں۔

مرزا صاحب نے ایک دو لمحے توقف کیا، کچھ سوچا، پھر انہیں خیال آیا کہ رمضان کے پورے مہینے نواب صاحب کا ہاتھ اونچا رہتا ہے۔ روزانہ ایک طشت چاندی کے روپوں سے بھرا غرباء میں جب تک بانٹ نہیں لیتے روزہ افطار نہیں کرتے۔ ویسے بھی ان کا فیض جاری ہی رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی ضرورت مند ہو اور اسی لئے بے وقت چلا آیا ہو کہ یہ در، خدا کے در کے بعد ایسا در ہے جہاں سے کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹتا...... وہ ذرا دیر بعد بولے ”اچھا تم بیٹھو...... نواب صاحب تلاوت خرآن (قرآن) کے بعد ہی حاجتمندوں سے ملتے ہیں، مگر میرے بولنے میں کیا مضائخہ ہے؟“

طاہر انکساری کے ساتھ بولا...... ”مضائقہ تو کوئی نہیں، لیکن میری آرزو تھی دیرینہ تمنا کہہ لیجئے کہ نواب صاحب کے نیاز حاصل کروں، بس اسی لئے......“ وہ ہاتھ ملنے لگا۔

”اچھا اچھا، کوئی مضائخہ نہیں۔“ اور وہ بھاری چق اٹھا کر زنان خانے میں چلے گئے......

نواب صاحب نے سر سے پاؤں تک طاہر کو دیکھا اور کچھ مسکرائے۔

طاہر اپنے کالج کا بہترین اسپیکر تھا وہ بغیر کسی جھجک کے شروع ہوگیا:

”مجھے حضور سے ملنے کی بہت تمنا تھی۔“ وہ کچھ مسکرایا...... ”اور مجھے اسکا یقین تو کیا گمان تک نہ تھا کہ میں کبھی آپ سے مل بھی پاؤں گا۔ آپ کی سخاوت کے قصے بے حد سنے ہیں......“

نواب صاحب ذرا ناگواری سے بولے، ”میاں لڑکے جو کچھ تم کو مانگنا ہے...... مانگ ڈالو، ہمارے آرام کا وخت ہے۔“

”حضور سرکار......“ طاہر لجاجت سے کورے لہجے میں بولے:

”بس ایک ہی مانگ ہے کہ آپ مہتاب کو میرے حق میں چھوڑ دیں، وہ میری منکوحہ ہے۔“

نواب صاحب سناٹے میں آگئے...... دنیا کے کسی قانون میں کوئی دفعہ ایسی نہ تھی جو وہ یہ سوال بھی کرسکتے کہ کس کی اجازت سے تم نے مہتاب سے شادی کی۔ کافی دیر بعد انہوں نے ایک ہی سوال کیا، ”تمہیں معلوم ہے لڑکی بالغ نہ ہو تو شادی، ہمارا مطلب ہے کہ نکاح فاسد ہو جاتا ہے؟“

”لیکن تابی نابالغ تو نہیں تھی۔ جب میں نے اس سے شادی کی۔“

انگاروں جیسی آنکھوں سے انہوں نے طاہر کو گھورا...... ’’بہت لمبے ہاتھاں ہیں میاں تمہارے؟‘‘

تھوڑی دیر بعد وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولے...... ’’اچھا ہم بعد میں سوچ لے کر بولیں گے۔ ابھی تو تم ہمارا ایک کام کر دیو۔ یہ گھڑی ذرا برابر نہیں چل رئی۔ چوک کے پاس جو گھڑی ساز کی ایک بڑی سی دوکان ہے وہاں بنانے کو دے دیو۔ پر دیکھو، سنبھال کر لے جانا، اس کی چین اصلی ہیروں کی ہے......‘‘ اور انہوں نے گھڑی طاہر کے ہاتھ میں تھما دی۔

لمبی سی راہ داری سے ہوتے ہوئے طاہر ابھی محل کے پھاٹک تک بھی نہ پہنچا ہوگا کہ کئی مضبوط ہاتھوں نے اسے بری طرح جکڑ لیا۔ اس نے ہڑبڑا کر اوپر دیکھا، چار چھ سیڑھیاں اوپر نواب صاحب اور مرزا صاحب کھڑے تھے۔

نواب صاحب نے مسکرا کر مرزا صاحب سے کہا۔ ’’امین صاحب (پولیس) سے بولو، بے چارہ روزے سے ہوئیں گا، ...... مار پیٹ کی ضرورت نہیں، بس چار دیواری کافی ہے۔‘‘

مرزا صاحب گرج کر بولے...... ’’مگر حضور ہیروں پر ہاتھ صاف کرنا کوئی معمولی جرم ہے؟ اور وہ بھی حضور کی خاندانی گھڑی۔‘‘

مگر جب تک ’’حضور‘‘ پلٹ کر جا چکے تھے۔

مہتاب نے نکاح کے رجسٹر پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا...... نواب صاحب مذہبی معاملوں میں جور، جبر اور زیادتی کے قائل نہ تھے۔ وہ رسان سے مرزا صاحب سے بولے، ’’لڑکی کی رضا کے بغیر نکاح کیسے ہوسکتا ہے؟ پر لڑکی ہم کو بہت پسند آ گئی ہے اس واسطے آپ ایسا کرو کہ اس کو چند روز کے واسطے بھرپور عیش فراہم کرو کہ وہ روپے پیسے کی ریل پیل دیکھ کر راضی ہو جائے۔‘‘

’’پر حضور...... آپ سنے نئیں، وہ تو چلا چلا کر یہ بھی کہہ رئی تھی...... کہ میں شادی شدہ ہوں، میری شادی ہو چکی ہے اور حضور پہلا شوہر ہوتے ہوئے دوسرا نکاح خطعاً (قطعاً) ناجائز ہے۔‘‘

’’ہم سمجھتے ہیں کہ یہ محض ایک چال ہے۔ بہرحال آپ وخت (وقت) کا انتظار کرو۔‘‘

دوسرے دن نواب صاحب کو یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ تابی کو زیر کرنے کے لئے جس عیش کے فراہم کرنے کے بارے میں مرزا صاحب کو ہدایات دی گئی تھیں۔ بے سود رہا۔ مرغن کھانوں کو تو اس نے دھڑا دھڑ اٹھا کر پھینک دیا اور بھاری زرتار ریشمی پوشاک کو پھاڑ پھاڑ کر اس نے دھجیاں

بکھیر دیں، اور اب ننگی بیٹھی ہوئی ہے۔

’’ننگی......‘‘ نواب صاحب نے ہونٹوں پر زبان پھیری، مگر روزے کا لحاظ کر کے سنبھل گئے۔

’’کوئی بات نہیں۔ اس سے پہلے دو ایک خودسر چھوکریاں اور بھی ایسے تماشے کر لے کو ہم کو حیران کئے تھے، پر وخت سب کو سنبھال لیتا ہے۔‘‘

عید کا چاند چمکا۔ مسجدوں میں منادی ہوگئی کہ کل عید ہے۔ آج سے تراویح موقوف کی جائے۔ نور محل میں چاندنی چمک چمک اٹھی۔ ایک ایک گوشہ بقعہ نور بننے لگا۔ عشاء کی نماز کے بعد ابھی نواب صاحب لیٹے ہی تھے کہ مرزا صاحب ہاتھ جوڑتے ہوئے آئے۔

’’حضور، وہ گھڑی چور......‘‘

نواب صاحب نے ہمت بندھائی۔

’’وہ تو مر گیا......!‘‘

’’مر گیا؟...... نواب صاحب ذرا حیرت سے بولے...... ’’اتنا دبو نکلا کہ چار کوڑوں کی مار سے مر گیا؟......

’’جی نئیں سرکار...... وہ اوپری کھڑکی کے سلاخلاں پتہ نہیں کیا کر کے توڑا اور نکل کر کودنے جا رہا تھا کہ غلطی سے ایسا ہوندے (اوندھے) مونہہ گرا کہ پھوراً دم نکل گیا اس کا...... کھڑکی بہت اونچی تھی نا سرکار......‘‘

نواب صاحب اطمینان سے لیٹ گئے۔ ’’تو اس میں ہمارا تو کوئی خصور (قصور) ہی نہیں۔ اپنی موت مرا، ہماری گردن پر تو خون ناحخ نہیں نا۔‘‘

جی نہیں سرکار...... بھلا آپ کا کیا خصور...... میں تو خالی حضور کو اطلاع دینے حاضر ہوا تھا۔ ایک کانٹا آپی آپ نکل گیا۔ اگر واقعی وہ مہتاب بیگم کا شوہر تھا تو بھی اب تو خصہ (قصہ) ہی ختم ہو گیا۔

’’بس اللہ ہم پر مہربان رہے۔‘‘

دوسرے دن عید تھی، نواب صاحب نماز عید کے لئے عیدگاہ روانہ ہونے ہی والے تھے۔ ایک پاؤں بگھی کے پائیدان پر تھا اور ایک زمین پر کہ اندر سے مرزا صاحب سراسیمہ سے وارد ہوئے۔

’’حضور غضب ہو گیا...... مہتاب بیگم بھی انتخال فرما گئیں۔‘‘

نواب صاحب ایک لمحے کو سراسیمہ سے ہو گئے...... ’’وہ کیسے؟‘‘

حضور انہوں کے ہاتھوں میں جو کانچ کی چوڑیاں تھے نا اس پر کسی کا دھیان نئیں گیا وہ انوں پیس کر کھا ڈالے۔‘‘

نواب صاحب نے بھگی میں بیٹھ کر اطمینان اور سکون کے ساتھ دونوں ہاتھ اللہ کے حضور اٹھا دیئے۔

’’میں خمیر (حقیر) بندہ کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں خدا، کہ تو نے مجھے گناہ میں نہیں ڈالا...... ورنہ حشر کے دن میری گردن پر خونی ہونے کا جوار کھا جاتا۔‘‘

پھر وہ مرزا صاحب سے بولے...... ’’کم بخت مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مذہب سے یہ لاعلمی، معلوم نئیں کہ خودکشی مذموم فعل ہے۔ جس کی اللہ کے پاس کوئی معافی اچ نئیں۔‘‘

سامنے ایک خدمت گار چاندی کے طشت میں سونے کی اشرفیاں لئے کھڑا تھا کہ ہر عید کو حضور کا دستور تھا کہ جب تک غریبوں کو خیرات نہ بٹ جاتی وہ کہتے عبادت قبول نہیں ہوتی۔ ان کے طشت کو ہاتھ لگاتے ہی کوچ بان نے سونٹا ہوا میں لہرایا اور سکوں کی برسات میں دعاؤں میں شرابور نواب صاحب کی عیدگاہ کی طرف روانہ ہوگئی.........‘‘

* * *

توبہ توبہ

رانیں جب انتہائی گوری ہوں، مکھن کی طرح چکنی ہوں، ملائی کی طرح نرم ہوں، بجلیوں کی طرح پھڑکتی ہوئی ہوں اور شلوار کا رنگ گہرا نیلا ہو اور پہننے والی اٹھارہ سالہ جوان لڑکی ہو، اور یہ منظر دیکھنے والا چھبیس ستائیس سالہ بھرنو جوان تو تو؟......

سمی نے نئی تراش اور جدید ترین فیشن کا لہریئے لہریئے والے ٹپوں کا تنگ فراک تو اپنے جسم پر چڑھا لیا تھا اور جب تنگ پانچوں والی شلوار سے دھینگا مستی ہو رہی تھی کہ اچانک ریاض کمرے میں آن ٹپکا...... ایک لبی سی، ’’اوئی‘‘ کہہ کر سمی نے، اپنے آپ کو چھپانے ڈھکنے کی کوشش میں پاس پڑا ہوا نائلون کا دوپٹہ اٹھایا اور رانوں کے گرد لپیٹ لیا...... یہ منظر اور بھی توبہ شکن تھا...... کم بخت دوپٹہ بھی گہرا نیلا ہی تھا۔ یہ سمی نامراد کو کچھ خبط ہی تھا کہ میچنگ کرتے ہوئے کپڑے پہنے، گہرے ہرے نیلے، اودے، دھانی لال گلابی کپڑوں کے ڈھیر اس کی الماریوں اور صندوقوں میں بھرے پڑے تھے۔ اور اب نیلے نیلے پیرہن میں دھڑکتا، تڑپتا جسم لئے وہ ’’اوئی اوئی‘‘ کرتی کھڑی تھی، مگر یہ سدھ نہ ہو رہی تھی کہ بازو لٹکتے پردے کے پیچھے ہی چلی جائے۔ ریاض پہلے تو پلکیں جھپکا جھپکا کر یہ قاتل منظر دیکھا کیا، پھر جیسے ہوش میں آکر چلنے ہی کو تھا کہ سمی تیزی سے بولی:

’’اللہ رجو بھائی...... قسم اللہ کی بڑے بے حیا ہو۔ ٹلتے بھی نہیں یہاں سے۔ توبہ توبہ۔‘‘ وہ جھوٹ موٹ اترائی۔

اک دم ریاض پھٹ پڑا ’’میں بچہ نہیں ہوں جی جو مجھے رجو ٹجو کہتی پھرو! ہاں میں......‘‘ بس اس کے الفاظ زبان پر ہی تھرک کر رہ گئے، ’’اور خبردار۔‘‘ وہ بڑی ہمت سمیٹ کر الفاظ چبا چبا کر بولا: ’’جو کبھی میرے سامنے توبہ توبہ کہا ہاں میں کہے دیتا ہوں جی سمی بیگم......‘‘ اور ایک دم وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

’’توبہ توبہ‘‘ وہ بڑبڑاتا جارہا تھا...... توبہ توبہ، اس توبہ نے تو میری جان لے لی۔ توبہ توبہ۔ ہونہہ؟ بڑی آئیں توبہ توبہ......‘‘

جیسے بادل اڑتے ہیں ایسے بہت سارے ماہ وسال پر لگا کر اڑے، اور اس منزل پر جا پڑے جب ریاض، رجو چھ سال کا تھا۔ کبھی نیکر پہنتا، کبھی اس سے بھی بے نیاز ہو جاتا، کبھی تو بالکل ہی ننگا رہتا...... کبھی موج میں آ کر قمیض ہی گلے میں لٹکا لیتا۔ اور ان دنوں وہ پورے گھر بھرے میں کس قدر بے ضرر مانا جاتا تھا۔ اس قدر بے ضرر کہ منجو باجی، جو کہ سارے گھر بھرے کے بچوں سے بھی گئی گزری اور پدی تھیں...... نہانے کو بڑے دلان سے لگے بڑے سا سرے حمام میں جاتیں تو مارے ڈر کے اسے ساتھ لیتی جائیں وہ اپنی نیلی پیلی گولیاں، ہرے لال کنچے ساتھ لے جاتا وہ نہاتی رہتیں، یہ اپنا کھیل کھیلے جاتا۔ پر اس دن انو سے لڑائی لڑائی میں وہ سارے کنچے اور گولیاں ہار گیا، اور منجو باجی گرمی سے بوکھلا کر باتھنگ گاؤن اٹھائے حمام میں گئیں تو اسے خالی ہاتھ ہی پہرے داری کو جانا پڑا۔ (کم بخت منجو باجی، جانے کاہے کا ڈر لگتا تھا انہیں۔)

منجو باجی مل دل کر نہاتی رہیں۔ اور وہ دیور کی طرف مونہہ کئے بیٹھا رہا۔ پھر دیوار کو دیکھتے دیکھتے اس کا جی اوب گیا تو اس نے ذرا کی ذرا گردن پھیری باپ رہے! وہ بھی منجو باجی کی طرح ڈرنے لگا مگر پھر ہمت سمیٹی۔ منجو باجی شاور کے نیچے کھڑی تھیں۔ دہکتی چمکتی گولائیوں پر سے پانی بھی جیسے سہم سہم کر جھجک جھجک کر گر رہا تھا سنہری روپہلی چھوٹے بڑے موتی پھر بھی ان کے ابھاروں پر اٹک ہی جاتے، اور پھر ان کے بہت، بہت بہوت ہی لمبے بال بکھرے بکھرے، اور ان کی نرم اور ملائم جلد جو صابن کے رگڑے کھانے سے سرخ پڑ گئی تھی، اور پھر، اسے یہ منظر خدا کی قسم بہت ہی اچھا لگا بہت ہی اچھا، اسے غصہ آنے لگا کہ اتنا سارا زمانہ وہ کنچے اور گولیاں کھیلتے یوں ہی بتایا کیا الو کا پٹھا میں اک دم تولیہ لینے کو منجو باجی نے ہاتھ بڑھایا اور چہرہ بھی ادھر کو پھیرا رجو اپنی کنچوں جیسی آنکھیں کھولے، بنا پلک مارے، تصویر حیرت بنا قدرت کی داد دے رہا تھا تو ال اپنے جسم کے اردگرد لپیٹتی ہوئی وہ ایک ادائے تبسم کے ساتھ بولیں، ’’توبہ توبہ!‘‘

جیسے کسی نے اس کے گریبان میں سے برف کی ڈلی اندر چھوڑ دی ہو۔ وہ چونکا، اس بری طرح چونکا کہ اس کا انگ انگ لرز گیا وہ جی ہار کر یونہی بیٹھ گیا منجو باجی غسل کا گاؤن پہن چکیں تو اسے اٹھاتی ہوئی بولیں، ’’رجو ایسے کسی کو نہاتے ہوئے دیکھنا، یا ننگی عورت کو دیکھنا بہت بہوت بری بات ہے۔ اب سے دیکھو گے؟‘‘ اس نے سہم کر منجو باجی کو دیکھا اور بڑی سعادت مندی سے دونوں ہاتھ

گالوں پر مارتے ہوئے کہنے لگا، ’’توبہ توبہ۔ اب چھے نئیں توبہ توبہ اب چھے نئیں توبہ توبہ‘‘ اور اس کی نگاہ جھکتی گئی جھکتی ہی گئی۔

پھر کتنے ماہ وسال گزر گئے، کتنی برساتیں کتنی گرمیاں، کتنے جاڑے۔ گرمیوں کی ہر گزرنے والی رات رجو کو ایک سال بڑا پاتی، مگر گھر والے یہ بھی دیکھتے کہ کبھی تو رجو نہانے کی خاطر دالان والے حمام کی طرف نہ پلٹا...... اب ایسا بھی کیا پردہ تھا...... لڑکا بیس اکیس سال کا ہو جائے تو اپنا ہی ہوتا ہے۔ جوان ہو جائے تو گھر سے نکال کر پھینک تو نہیں دیتے نا...... کبھی شادی بیاہ کے ہنگاموں میں مردانہ بالکل اٹالٹ بھر جاتا، اور ایسے موقعوں پر رجو سے کہتا میاں تم تو گھر والے ہی ہو، اپنے زنانہ حمام میں آ کر نہا لیا کرو نا...... اب یہ ہونے سے رہا کہ غیر مردوئے گھروں میں جھانکتے پھریں۔

’’تو وہ سوچتا‘‘ توبہ توبہ۔‘‘

ریاض بی اے میں آیا...... لڑکیاں ایک سے ایک نکمی اور پڑھائی چور...... اور ریاض نے اکنامکس میں وہ قابلیت دکھائی تھی۔ پروفیسر صاحب خود ایک دن ابا میاں کے پاس آئے تھے کہ چھوکرے کو لندن بھجوا ہی دیں...... جب کبھی کسی نے کہا کہ ’’میاں ذرا لڑکیوں کو کچھ سکھا دیا کرو کچھ بتانے سکھانے سے علم تو گھٹنے سے رہا۔‘‘

وہ سوچتا، ’’توبہ توبہ!‘‘

شہر میں کبھی نمائش لگتی اور لڑکیاں اس کے سامنے آتیں تو اس تصور سے ہی اس کے پسینہ آنے لگتا کہ ثمو، ٹمو الانی فلانی کے جمگھٹے میں کھڑا ہے۔

وہ سوچتا، ’’توبہ توبہ!‘‘

گھر میں کوئی مہمان اترے، یا یہ خود کہیں ماں باپ کے جاتا، تعارف کی نوبت آتی بھی تو اس کی جھکی جھکی نگاہ اوپر اٹھنے کا نام نہ لیتی۔

لڑکی کو سلام کروں؟ وہ سوچتا ’’توبہ توبہ‘‘

بی اے چھوڑ کر ایم اے پاس کر لیا نوکری والا بھی ہو گیا...... بھر مٹھی روپے ماں کی گود میں بھی لا کر ڈالنے لگا...... لیکن شادی کی بات جب کبھی ماں نے خالہ نے چھیڑی اس نے دل ہی دل میں سوچا، ’’توبہ توبہ!‘‘

ریاض محمد عرف رجو اس قدرت خوب رو تھا، اتنا دل کش، یا پھر بقول سمی اتنا ہینڈسم کہ ایک

گھڑی دیکھنے کی چیز۔ ''اللہ رجو بھائی اس قدر اسمارٹ ہیں، ایسے سپورٹنگ ہیں کہ بھئی پوچھو متی...... جانے وہ کیا سوچتے ہیں؟''لڑکیوں میں کبھی ریاض کا ذکر نکلتا تو بس اس کے حسن پر...... سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ نمبر ایک کا مغرور ہے...... اپنے حسن کے غرور میں چور ہے۔ تبھی تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا......

ورنہ یہاں تو ایک ایکو ایک ''اسپورٹ'' لڑکی موجود ہے۔ پھر بھی بہنوں کا خیال تھا کہ اگر کبھی رجو کی نظرِ انتخاب پڑی ہی تو سمی پر ہی پڑے گی...... وہ نامراد دن رات ہیروئن بننے کے خواب دیکھا کرتی...... کبھی تنہائی میں رجو مل گیا تو کیا کرے گی؟ ہائے بات کرنی بھی سوجھے گی۔ تب بھی رجو بھائی کہے گی یا ریاض کہہ کر دم سادھ لے گی؟ مگر قسم لے لو جو ریاض کا سایہ بھی ادھر ادھر کسی نے دیکھا ہو...... بس کمرے ہی تک اس کی دنیا محدود تھی۔ وہ تو سمی کے کمرے میں یوں چلا گیا کہ اسے ہارڈی کا وہ ناول پورا کرنا تھا جو جانے کس جھونک میں سمی اٹھا لے گئی تھی...... اب بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ کتاب لینے کو جائے گا، اور وہاں...... توبہ توبہ...... وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا......

ادھر سمی کو وقتی طور پر تو بڑی شرم آئی...... ''اے ہے اللہ آخر رجو بھائی کیا سوچیں گے؟ ایسے ہی بنا دروازہ بھیڑے کپڑے بدلا کرتے ہیں! مگر انہیں حق بھی کیا تھا کہ کسی کے کمرے میں چلے آتے؟......'' اور ایسی ہی الٹ پلٹ ہزار باتیں وہ سوچتی رہی...... پھر یکایک جگنو کی مانند ایک خیال اس کے ذہن میں چمک اٹھا...... کیا...... کیا...... وہ اب یہ نہ چاہیں گے کہ ان کی ہونے والی دلہن بھی ایسی ہی گوری اور چمک دار ہو؟......

مگر رجو نے تو کوئی نوٹس ہی نہ لیا...... سمی کی ٹانگوں کو دی جاتی تھی، نوکر خانے میں ایک دن ماماؤں کے پوتے ایک بکری پکڑ لائے تھے...... اور سب مل کر اس کا دودھ دوہنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے اور بکری تھی کہ، بس ٹانگوں سے پوتوں کو جھاڑے جا رہی تھی...... رجو کو بڑی ہنسی آ رہی تھی...... اور وہ بڑے چاؤ اور انہماک سے دیکھ رہا تھا کہ بکری پچھلی ٹانگوں سے کس مزے سے دولتیاں جھاڑ رہی ہے...... ہائے! بیچاری سمی بکری سے بھی گئی گزری ہو گئی......''

ایسے موقعے پر جو ہوتا ہے وہی ہوا۔ یعنی بالکل وہی ہوا یعنی بالکل وہی ہوا کہ بے چارہ رجو جو نہیں تھا وہ سمجھ لیا گیا...... اور جو تھا وہ کسی نے نہ سمجھا...... اور اب تو لوگ باگ رجو میاں کی والدہ کی قسمت پر ترس کھانے لگے تھے کہ کس قدر خوب صورت سجیلا اور خوب رو پڑھا لکھا لڑکا اور......

سمی بھی اپنی جگہ صبر کر کے بیٹھ گئی...... اس بات سے کم از کم رجو کو اتنا اطمینان تو ہوا کہ اب کوئی اس کے آگے شادی کی بات چھیڑتا ہی نہ تھا۔ وہ مزے سے آفس جاتا...... مہینے کے خاتمہ پر ڈھیر سارے کپڑے سلواتا، برل کریم لاتا، بڑھیا پوڈر اور ٹائیاں لاتا اور بس مگن تھا......

مگر ایک دن کیا ہوا رجو نے آفس جانے کے لئے اپنی موٹر سائیکل نکالی۔ ابھی وہ جانے ہی لگا تھا کہ اسے یاد آیا کہ پین میں انک ڈالنی تو وہ بھول ہی گیا ہے۔ وہ بجائے پورچ کے پچھلے زنانہ دروازے سے آنے لگا کہ راستہ نسبتاً چھوٹا تھا اور اسے جلدی جانا تھا ٹائم کا وہ بہت ہی خیال رکھتا تھا کہ آفس دیر سے نہ پہنچوں۔ ایسے ہی کیریر خراب ہوتا ہے۔ وہ رہداری سے آنے لگا تو صنوبر جھاڑو دیتی جھپک جھپک ادھر ادھر ہاتھ مار رہی تھی...... رجو جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا کہ کم بخت پین عین اس جگہ گرا جہاں صنوبر کھڑی تھی...... وہ پین اٹھانے کو جھکا اور جب وہ دھیرے دھیرے اوپر اٹھا تو اس کے جسم میں ننھے ننھے سنپولے سے رینگنے لگے...... اس کی ناک میں عجیب سی خوش بو بھر گئی۔ یہ خوشبو سراسر صنوبر کے جسم میں سے آ رہی تھی مٹی دھول اور پسینے کی ملی جلی خوشبو، اور ان سب سے زیادہ شدید خوشبو تھی اس کے اپنے جسم کی۔ جھاڑو لگانے سے اس کا جسم جسم بھبک اٹھا تھا...... پسینے کے قطرے یہاں وہاں نمایاں ہو گئے تھے...... سیدھے ہاتھ کی آستین شانے کے پاس سے پھٹ گئی تھی...... اور گوندھی ہوئی سوجی کی رنگت کا مہکتا دمکتا گوشت جیسے رجو کو زبان چڑائے جا رہا تھا...... رجو اتنے برس کا ہو گیا تھا اس نے عورت کو اتنے قریب سے نہ دیکھا تھا...... اور پھر یہ عورت؟...... اسے دیکھ کر توبہ توبہ کہنے کو جی نہ چاہتا تھا...... یہ تو سات پردوں میں چھپی ہوئی عورت تھی، سر پر پلو کمر تک بلاؤز ٹخنوں تک ساڑی...... بس ایک شانے کے پاس گوشت تھا جو رہ رہ کر سورج کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا...... سورج کو مارو گولی جی...... وہ تو مست ہوا جا رہا تھا اس خوشبو سے جو بظاہر خوشبو نہیں تھی...... مگر دنیا کے ہر عطر پر بھاری تھی۔

صنوبر جھاڑو لگاتی اس سرے سے اس سرے پر چلی گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تک نہیں رجو کا سارا وجود چولہے پر دھرا توا بن گیا...... اس نے اپنی پوری طاقت سمیٹ کر پاؤں کمرے کی طرف بڑھائے اور عثمان کو آواز دے کر ڈوبتے لہجے میں بولا،

''عثمان میری موٹر سائیکل اندر رکھ دے، میں آفس نہیں جاؤں گا۔ میرا سر اچانک درد کرنے لگا......''

رجو کو شرم تو بہت آئی، مگر اس نے اسے طاق پر رکھنے میں بھلائی سمجھی اور اماں سے بالکل اسی لہجے میں شادی کی بات کہہ دی، جیسے نئے سوٹ کا کپڑا خریدنے کی بات کہی ہو۔

’’اماں آفس میں دوست احباب بہت مذاق بناتے ہیں، آپ میری شادی کر دیجئے......‘‘

’’اماں بے نصیب کو تو اس دن کی آس ہی نہیں تھی...... انہوں نے چھوٹتے ہی سمی کا نام پیش کر دیا رجو کو سمی، ٹمی رجی، بچھی ...... کسی سے غرض نہ تھی، اسے بس عورت سے غرض تھی...... ایک خوشبودار عورت سے، چھپی ڈھکی عورت سے!

رجو جب دلہن کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ عطر، لوبان، پھولوں اور ہر طرح کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا...... سجے سجائے پلنگ پر سمی، ایک عورت سر جھکائے بھٹی تھی جو سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی تھی...... جس کا ایک بال تک بھی نظر نہ آ رہا تھا...... ’’اچھا ہی ہوا جو یہ ڈھکی ہوئی ہے......‘‘ رجو نے عجیب بے معنی سی بات سوچی۔ اگر اگر...... مگر اس وقت وہ خود کو اگر مگر کے چکر میں ڈلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ کتے جیسے گوشت پر لپکتے ہیں ایسے میں وہ پلنگ کی طرف لپکا، اور ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا۔ ایسی جان لیوا گرفت تھی کہ سمی چوں بھی نہ کر سکی۔ مگر دوسری صبح ہر چند کہ وہ نڈھال نڈھل سی تھی۔ اس کے چہرے کی جلد بتا رہی تھی کہ وہ سچ مچ ہیروئن بن گئی ہے۔

دوسرے دن جب سمی کی ذرا شرم ٹوٹی تو اس نے کنکھیوں سے رجو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ مگر پوچھنے سے پہلے اس کے دل کو ذرا دھکا سا لگا۔ شادی کے دوسرے دن کیا دولہے ایسے ہی چپ چپ اور روکھے رہتے ہیں؟۔ جی کڑا کر کے وہ پوچھ ہی بیٹھی:

’’آپ کو مجھ سے شادی کا خیال کیسے آیا؟۔ پھر تھوڑی دیر خود ہی رک کر بولی، ’’میں سمجھ گئی۔ آپ نے اس دن مجھے بری حالت میں دیکھ لیا تھا نا۔‘‘ اور وہ بالکل معصومیت سے ہنس دی۔ رجو کو اس سے ایسے بیہودے سوال کی ہرگز توقع نہ تھی۔ اور اگر ایسا ہی وہ ٹانگوں پر عاشق ہو جانے والا ہوا ہوتا تو رات بھر میں اس کی ٹانگیں خوناں خون ہو گئی ہوتیں۔ مگر اس نے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی لائٹ آف کر دی تھی اور سمی کی ٹانگیں تو کیا چہرہ تک بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور جو ہونا تھا وہ ہو ہی گیا تھا کہ یہ ہونا ناگزیر تھا۔ مگر۔ مگر اسے ہر شے میں کسی شے کی کمی کیوں محسوس ہو رہی تھی؟ وہ بے نام سی شے کیا ہو سکتی تھی۔ کیا۔ کیا؟

اتنی جلدی یہ سب ہو جائے گا، وہ تو خواب میں بھی نہ سوچ سکا تھا۔ اسے بڑی شرم آئی جب تھوڑے ہی دنوں بعد سمی نے بتایا کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ اسے یہ سب کچھ بڑا عجیب عجیب سا لگا اور کھوئے کھوئے سے پن کا ہوا احساس کچھ اور بھی شدید ہوتا گیا۔ سمی شروع دن سے محسوس کر رہی تھی کہ رجو کچھ کھویا کھویا سا لگتا ہے۔ مگر کیوں؟ وہ کبھی سمجھ نہ پائی۔ وہ اس کمی کو اپنے حسن اپنے وضع

وضع کے لباسوں سے پر کر دینا چاہتی تھی، اور کرتی بھی تھی۔ ویسے ہی اس کے پاس نت نئے تراش خراش کے لباسوں کے ڈھیر تھے، مگر اس نے اور بھی بڑھیا لباس سلوائے۔ کھلے گلے کے فراک، نیچے گلے کے شرٹ ایسے گریباں کہ چاند سورج چمکتے نظر آئیں، تنگ بلاؤز ایسے کہ ہر ہر قوس اور دائرہ نمایاں ہو جائے۔ سمی ماڈل بن گئی۔ سہیلیاں مذاق سے کہتیں۔ ’’فیشن پریڈ میں چلی جا، فرسٹ پرائز نہ ملے تو ہم سے کہنا۔‘‘

اور اب سمی ماں بن رہی تھی۔ خوب صورت کپڑے پہننے والی۔ نفیس میک اپ کرنے والی، چمکتا، لبھاتا سنگھار کرنے والی سمی مان بن رہی تھی۔ یہ تو زیادتی ہے کہ میں اسے بھرپور محبت نہ دوں وہ اسے چاؤ سے گھمانے کو لے جانے لگا۔ پکچر لے جانے لگا، سیر کو لے جانے لگا سمی کو ذرا دکھ سا بھی ہوا۔ ہے نامرد کی ذات۔ اولاد کی آمد کے آثار نے ہی اتنا بدل دیا مگر چند دنوں میں سمی کو یہ بس کچھ بھی پھیکا پھیکا اور بناوٹی لگنے لگا لیڈی ڈاکٹر نے اسے سیڑھیاں چڑھنے سے منع کر دیا، اور بھی ’’دوسری باتوں‘‘ کے لئے احتیاط بتائی تھی وہ تو ڈاکٹنی نے کہا تھا، سو رجو عمل کر رہا تھا مگر پھر بھی سمی کو اسی لمحے کی حسرت ہی رہ گئی جب کہ وہ سمی کو تو سوچتے بھی شرم آتی تھی مگر وہ کیسے اپنے دل سے چھپاتی؟ اس کی کتنی ہی سہیلیوں نے شرم اور فخر سے تمتماتے ہوئے چہروں کو سرخ سرخ دوپٹوں میں چھپاتے ہوئے بتایا تھا، ’’کوئی حد بھی ہوتی وحشت کی قسم اللہ کی! آستین تار تار ہوئی تھی میری‘‘

’’اللہ ہی سمجھے ایسے بے شرم سے، سارا لباس بچ گیا‘‘

سمی کا لباس عروسی ایسا بنایا تھا جیسے ابھی درزی کے ہاں سے سل کر آیا ہو!

اور ایک دن رجو باپ بھی بن گیا میٹرنٹی ہوم کے بیس روپے روز والے کمرے سے نکل کر جب اس کی ماں نے سنایا:

’’رجو تجھے لڑکا ہوا ہے‘‘ تو اسے بڑا عجیب سا لگا کہ باپ بھی بن گیا۔ مگر لوگوں نے اس کا بچکانہ نام رجو نہ بدلا، پر نہ بدلا کتنا عجیب لگے گا کہ اس کے بچے کی موجودگی میں اماں اسے رجو کہہ کا پکاریں! یہ بہت غلط چیز ہے اس نے جھلا کر سوچا بچپن کی یادوں کو بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو جانا چاہئے میں اپنے بیٹے کا کوئی Nick Name نہیں رکھوں گا۔ اس نے بہت ہمت کے ساتھ جیسے ایک فیصلہ کر لیا۔

سمی بچے کو لے کر ہاسپٹل سے پلٹی تو زرد زردسی تھکی تھکی ہاری۔ پتہ نہیں کاہے کی تھکن اسے گھیر بیٹھی تھی مگر اس کے چہرے پر نور سا چھا گیا تھا اس کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بات چیت کرنے

تک کے انداز میں ایک وقار اور باک پن پیدا ہو گیا تھا وہ جب رجو کی طرف پیٹھ کر کے بچے کو دودھ پلانے بیٹھی تو رجو کو اس کے مڑ مڑ کر بات کرنے کا انداز بہت ہی بھلا لگتا کیا عورت بچہ پیدا کرنے کے بعد زیادہ خوبصورت لگتی ہے یا صرف اسی کو لگ رہی ہے؟

بچہ بڑی جلدی جلدی بڑھ رہا تھا پہلے جو کرتے اسے ڈھانپ دینے کو کافی ہوتے تھے، اب اس کی ٹانگوں کو ڈھانپنے میں بھی نا کام رہتے تھے۔ بچے کی بڑھوتری کے ساتھ ساتھ سمی کے کام کاج میں بھی اضافہ ہو رہا تھا کبھی تو مشین پر بیٹھ کر کھر رکھر رکپڑے سی رہی ہوتیکبھی بچے کے کپڑے دھوتی نظر آتیکبھی وہ بچے کو دودھ دینے کی فکر میں باورچی خانے میں نظر آتیکبھی آنگن میں کپڑے سمیٹتی نظر آتیر جو اسے اتنی لگن سے کام کرتے دیکھ کر ہنس کر پوچھا:

”سمی تم نے اپنے ذمے اتنے سارے کام کیوں لے رکھے ہیں؟“

سمی مسکرا کر جوب دیتی، ”اپنے بچے کا کام خود کرنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے“

”مگر اس طرح تم نے خود اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے نا کبھی تم سوچتی ہو کہ پہلے تم کس طرح ماڈل بنی پھرتی تھیں اور خوشبوؤں میں نہائی رہتی تھی!“

سمی کا حلق سوکھنے لگتا۔ جی چاہتا کہہ دے، تب بھی آپ کون جان نچھاور کر دی تھی مجھ پر میں تو ایسے ہی نصیب لائی تھی کہ ساری خوشیاں نصیب ہوتے بھی دل میں بے نام سی کسک پالا کروں خود رجو نے بھی تو محسوس کیا تھا کہ وہ سمی کو ٹوٹ کر پیار نہیں کرتا اس کا کوئی انداز ان چھڑکنے والا نہیں کہلایا جا سکتا۔ وہ خود مجبور تھا۔ وہ ایسے جال میں پھنسا جو بظاہر جال نہ تھا مگر پھر بھی وہ نکل نہ پاتا۔

اس دن رجو آفس سے لوٹے تو سمی خلاف معمول بری طرح چڑی ہوئی تھی آنگن میں ننھے نے خوب ساری مٹی کا ڈھیر کیا ہوا تھا اور ہر طرف کھلونے ہی کھلونے اور وہ خود اس مٹی اور کچرے، دھول میں اٹا بالکل سادھو مہاتما لگ رہا تھا۔ سمی اپنے نصیب کو کوس رہی تھی..........“

”کنوار پن کی زندگی بھی کیا زندگی ہوتی ہے خداوند کوئی فکر نہ جھمیلا یہاں تو کم بخت اٹھاتے گھونگھٹ ہی سے اولاد نصیب میں بندھ گئی، سارے مزے ہوا ہو گئیگو، موت کرو، جھاڑو جھٹک کرو، نہلاؤ دھلاؤ، کچھ بھی کرو، مگر یہ حرام زادہ پہلے سے ذرا بھی خیال آیا ہوتا تو ایسی شادی کو، ایسی زندگی کو دور ہی سے سلام کر دیتی“

وہ چڑ چڑ کر جھاڑو سے دھول اڑاتی جاتی تھی۔ اور ننھے پر چڑتی جاتی تھی۔ ایک دم ریاض گھر میں داخل ہوا، وہ چڑے جا رہی تھی۔

”کم بخت نصیبوں میں جو سوچا بھی نہ تھا وہ آ گیا کبھی کاہے کو جھاڑو تھامی ہو گی۔ یہ حرام زادہ مجھے کھا کر چین لے گا“

رجو ہنس کر اسے چڑانے کو بولا، بس ایک ہی میں گھبرا گئیں؟ خود ہی نے اسے بگاڑا ہے۔ یاد ہے کیسے کیسے چاؤ چونچلے تھے اس کے؟ ایک سال میں گالیوں تک نوبت پہنچ گئی“ اور وہ آگے بڑھا اور بولا، ”لاؤ جھاڑو ادھر دو۔ ماشاءاللہ سے گھر میں بہت نوکر ہیں تم ہی نے ہر کام اپنے ذمے لے لیا ہے تو اس کا کیا علاج؟“

سمی نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کر لیا، اور خود بھی پرے ہٹ گئی ”ہٹیے بھی اب آپ جھاڑو کو بھی ہاتھ لگائیں گے؟“

وہ جھاڑو والا ہاتھ پیچھے کر کے یوں ہی کھڑی رہ گئی۔ رجو گرتے گرتے بچا اس کے جسم میں ہزاروں بڑے چھوٹے سنپولے کلبلانے۔ ہمشہ بجی سنوری خوشبوؤں میں ڈوبی، بڑھیا لباس میں ملبوس رہنے والی سمی ایک پرانی دھرانی ساڑی میں لپٹی کھڑی تھی بلاؤز میں آستین شانے کے پاس مسک گئی تھی گرد سے بچنے کو اس نے پلو سر کے گرد لپیٹ لیا تھا جھاڑنے اور الجھنے کی وجہ سے اس کے جذبات میں ابال سا آ گیا تھا اور گردن اور چہرے پر شبنمیں قطرے پھوٹ آئے تھے۔ اور ایک خوشبو، جو خوشبو تھی بھی اور نہیں بھی اس کے جوان اور بھرپور جسم سے نکل نکل کر رجو کے نتھنوں میں ایسے پہنچ رہی تھی کہ ہر لمحہ وہ گر پڑنے کو ہو رہا تھا۔

وہ جیسے خواب میں بڑھا اس کے قریب ہو کر پھٹے بلاؤز میں جھانکتے گوشت کو یوں دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ آستین میں سورج کیسے آ سکتا ہے؟

سمی تڑپ کر پیچے ہٹی۔ اک دم اسے اپنی ہیئت کا خیال آیا بڑے محجوب اور شرم سارے لہجے میں بولی۔ ”میں نے صفائی کے خیال سے یہ پھٹے کپڑے پہن لئے تھی سوچا تھا جلدی جلدی جھاڑ جھوڑ کر کپڑے بدل لوں گی کہ آپ چلے آئے۔ آج تو آپ وقت سے کچھ پہلے ہی چلے آئے۔ ہائے! مجھے کتنی شرم لگ رہی ہے۔ بھلا آپ کیا سوچتے ہوں گے؟“ اور وہ جھاڑو پھینک کر بھاگنے لگی۔

رجو نے لپک کر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ مدہوش کر دینے والی خوشبو کا ایک ریلا اس کی ناک میں گھس گیا، اور وہ بالکل وحشیوں کی طرح سمی کو جھنجھوڑنے لگا کبھی وہ اسے کے گال پر کاٹ کھاتا کبھی ہونٹوں کو اس بری طرح چوسنے لگتا کہ سمی کو لگتا اس کا دم نکل جائے گا ”توبہ توبہ!“

سمی ہانپ کر بولی ’’کچھ خیال تو کیجئے آنگن ہے اور پھر ننھا‘‘

رجو نے دیوانوں کی طرح جھپٹ کر اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چپکا لیا۔ وہ ایک ایک کر کے اس کے کپڑے نوچ نوچ کر پھینکتا جا رہا تھا، دھول مٹی سے اٹی سمی نے بڑی بے بسی سے کہا:

’’توبہ توبہ، رجو‘‘

مگر ریاض نے اسے بات کرنے کی مہلت بھی نہ دی، اور اسے نوچتا کاٹتا ہوا بولا:۔

’’مجھے آگے سے رجو نہ کہنا، میں ریاض ہوں، تمہارا شوہر، میں بچہ نہیں ہوں، مرد ہوں، سمجھیں نا؟ میں رجو نہیں ہوں۔ اور میں جو چاہوں وہ کر سکتا ہوں سمی میری جان میری عورت سات پردوں میں چھپی عورت میں اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ تمہیں اپنے ہاتھوں ننگا کر سکوں۔‘‘

سمی مارے شرم کے توبہ تو بھی نہیں کہہ سکی اس کا شوہر ریاض اسے اتنی مہلت تو دیتا۔ اس کے ہونٹوں پر تو ہونٹوں کا ہی قفل پڑ گیا تھا۔

* * *

اللہ کے نام پر

گوری پاشا نے مریم کو دودھ جیسا لباس پہنا کر عطریات اور خوشبوؤں میں ڈبو دیا۔ ابٹن اور چسکہ مل مل کر نہلانے سے آگے ہی اس کا رنگ سونے کی طرح دمک اٹھا تھا...... پیٹھ پر سنہرا آبشار اُمڈا پڑ رہا تھا۔ سبز آنکھوں میں سرمے کی باریک سی لکھاوٹ نے الٹا ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ سبز ریشمی چوڑیاں گوری پان کلائیوں میں کھبی جا رہی تھیں۔ رہی سہی کسر سانچے سفید موتیوں کے زیور نے پوری کر دی۔ کمرہ عود، لوبان اور کچے اگر کی فرزانوں کو دیوانوں میں بدل دینے والی خوشبو سے سلگ اٹھا تھا...... سمندر جاگوں کی سی سفید چادر پر قبلہ رو بٹھا کر گوری پاشا نے مریم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا، اور لرزتی کانپتی آواز میں آسمان کی طرف دیکھ کر بولیں:

”میرے اللہ تیرے نام پو آج اس کنواری کو سدا کنواری کا روپ دے کر چھوڑ رئی یوں...... مالک میرے اس، نخیر چڑھاوے کو جبول فرما، اور میرے حسن بانو کے سہرے کے پھولاں کھلا دے...... اس کو زندگی نصیب کر......“

مارے وقت کے ان کی آواز نے دم توڑ دیا۔ پاس کھڑی شمشاد بوا کی حالت تو اور غیر تھی۔ انہوں نے کھڑے کھڑے دوپٹے کا میلا بوسیدہ آنچل منہ میں دبا لیا، مگر پھر بھی سسکی نکل ہی گئی۔ گوری پاشا اپنی رقت بھول کر جل کر مڑیں اور تڑاخ سے بولیں۔

”آئی اب تے کائے کو بول لے رئیں۔ کھن کھن تمہارے ہاتھاں کو پانچ سو روپے گن کو نہیں رکھ دی میں کیا؟“

مامتا کی ماری شمشاد بوا منہ سے کچھ نہ کہہ پائی۔ کہتی بھی کیا؟ یہ حقیقت تھی کہ دو دن پہلے ہی گوری پاشا نے ایک نہ دو پورے پانچ سو روپے شمشاد بوا کی جھولی میں گن کر ڈال دیئے تھے...... میاں دو روپے ماہوار پر ڈیوڑھی کی دربانی کرتے تھے۔ وہ خود چار روپے مہینے سے ماما گیری کے فرائض انجام دیتی تھیں...... خدا کا شکر تھا کہ پیٹ بھر کر روٹی اور سال میں دو جوڑے

جب زکواۃ بٹتی تھی، مل جاتے تھے۔ صبر والی بی بی تھیں۔ اس سے زیادہ کی انہیں حاجت تھی بھی نہیں...... بٹیا مریم ابھی آٹھ نو برس کی ہی تھی۔ اس کی فکر بھی کیا تھی۔ جس طبقے سے شمشاد بوا تعلق رکھتی تھیں وہاں لڑکیوں کی شادی کے لئے نہ کسی جوڑ جماؤ کی ضرورت ہوتی ہے نہ اندیشوں کی...... جوانی جب چپکے سے دستک دیتی ہے تو پاس پڑوس میں اچھا لڑکا دیکھ کر دو جوڑے دے کر بیٹی وداع کر دی جاتی ہے...... ایک جوڑا لال نکاح کا، ایک جوڑا ہرا...... دوسرے دن چوتھی کا، قصہ ختم۔ اسی لئے مریم کی انہیں کوئی فکر نہ تھی اور وہ اسے محلے کے مولوی صاحب سے قرآن شریف اور اردو پڑھنے پابندی سے بھیج رہی تھیں کہ لڑکی اللہ رسول ﷺ کے نام سے تو واقف ہو جائے۔ لیکن قسمت...... اوندھی قسمت نے کس کا ساتھ دیا ہے؟ میاں دربانی کرتے کرتے ایک دن درد کی شدت سے نڈھال ہو کر ڈیوڑھی کے قومی ہیکل دروازے پر گر کر تڑپنے لگے۔ بڑی دوڑک دوڑا مچی...... حکیم صاحب بلوائے گئے۔ پتہ چلا پیٹ میں جس جگہ شدید درد اٹھ رہا ہے وہاں بڑی سی رسولی پیدا ہو گئی ہے۔ علی میاں عمر کے اس دور میں تھے کہ مر بھی جاتے تو کس کا نصیب لے کر جانے والے تھے؟ مگر جیتے جی کو یوں ہی چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ دو روپے مہینے کی آمدنی بھی گئی...... دو وقت کا کھانا بھی گیا، اور اوپر سے علاج معالجہ الگ...... نہ اچھے ہی ہوتے تھے، نہ ہی مر چکتے تھے پھر شمشاد بوا کو آئے دن ان کے درد کے دوروں کی وجہ سے بھاگ بھاگ کر کام کاج چھوڑ چھوڑ کر جو جانا پڑتا تھا اور کام میں ہرج جو ہوتا تھا...... اس کا پیسہ گوری پاشا الگ کاٹ لیتیں...... بڑے نواب صاحب نے کبھی کسی سوالی کو واپس نہیں پھیرا۔ ہمیشہ ساتھ دستر خوان پر بٹھال کر کھانا کھلاتے اور بات بستر تک پہنچ کر ختم ہو جاتی۔ ممکن تھا کہ شمشاد بوا کبھی بڑے نواب صاحب تک اپنا سوال لے کر پہنچ بھی جاتیں، لیکن وہ اپنی عزت کو ڈرتی تھیں...... چند ٹکے ہی تو سب کچھ نہیں ہوتے۔ روپیہ تو پٹھان سے بھی تھوڑے بہت سود کے ساتھ مل ہی جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سود بڑھتے بڑھتے اصل سے بھی گزر جائے۔ اور یوں کہ پھر حریص نگاہیں کچی کلیوں تک پہنچ کرنے کی سوچنے لگیں......“

پٹھان سے لی ہوئی چھوٹی چھوٹی رقمیں چار سو کی خطیر رقم بن کر ناگ کی طرح دن رات شمشاد بوا کو ڈسا کرتیں۔ میاں جیئے مرے برابر تھے۔ بس دنیا سے ان کا اتنا ہی ناطہ باقی رہ گیا تھا کہ مدہوشی کے عالم میں بھی منہ کھول دیا کریں۔ اور کوئی چمچوں سے ان کے منہ میں ان پانی ٹپکا دیا کرے، زندگی کا سارا وبال تو شمشاد بوا کو سمیٹنا تھا...... انہیں ہفتہ بھر پہلے ہی پٹھان نے کہلوا بھیجا تھا کہ تمہارے ہاں تو ایسی کوئی قیمتی چیز بھی نہیں جس کی قربانی یا نیلامی ہو سکے...... لے دے کے ایک

چھوکری ہے تو تم چاہو تو اسے ہمارے نکاح میں دے دو۔ بڑی ہونے تک ہم کھلا پلا لیں گے، بعد میں وداع دے دینا...... شمشاد بوا کا تو دل ہی دہل گیا۔

ایسی ننھی سی، سچ مچ کلی کی سی بچی، نازک چڑیا کا سا تن...... اس پٹھان کو لاج نہ آئی ذرا۔ ان کی راتوں کی نیند اڑ کر رہ گئی۔

لیکن ابھی دو دن پہلے کی بات تھی، مریم مدرسے سے سبق لے کر لوٹی تھی...... اب وہ اردو اچھی طرح پڑھ لکھ لیتی تھی۔ نماز بھی پوری یاد ہو چکی تھی اور نو سال کی ننھی سی عمر میں قرآن شریف کے کئی دور بھی ہو چکے تھے...... وہ ابھی اپنی ماں کو اول کلمہ طیب سنا رہی تھی کہ خلاف معمول گوری پاشا صحن میں آنکلیں اور بڑی محبت سے بولیں:

”ایو تیرا خران شریف بھی ہوگیا، نماز و ماز سب یاد کر لی، پھر ابھی تک کا اول کلمہ اچ پڑھتی رہتی؟“

مریم کچھ شرما کر بولی...... ”نہیں پاشا، مولوی صاحب بولتے نماز اور خران شریف کا ایسا ہے کہ روز کا روز آموختہ کرتے رہے تو یاد رہتا نئیں تو انسان بھول جاتا۔ اسی واسطے میں روز امی کو پڑھ کر سناتیوں۔“

”اچھا اچھا“...... کہہ کر گوری پاشا ذرا ہنسیں اور کہنے لگیں...... ”سن گے مریم ذرا چوک کے حلوائی کنے سے سیر بھر جلیبی تولے کو آجا۔ تیرا خران شریف ختم ہوا پر میں کچھ بھی نئیں کری۔“

مریم کچھ شرمائی، مگر انہوں نے پیسے اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے...... شمشاد بوا اس بلاوجہ کی مہربانی سے بری طرح خائف ہوئی جا رہی تھیں، کیونکہ وہ اپنی ساری زندگی اس ڈیوڑھی میں گزار چکی تھیں اور خوب جانتی تھیں کہ لڑھا ہوا، پانی وہیں ٹھیرتا ہے...... گوری پاشا کی محبت مطلب سے خالی نہیں ہو سکتی۔

جیسے ہی مریم ٹلی، گوری پاشا شمشاد بوا کے پاس کھسک آئیں...... اور گڑگڑاتے ہوئے لہجے میں بولیں...... ”شمشاد تو اس گھر کا نمک کھائی دی ہے میں کبھی کچھ مانگی تو انکار تو نئیں کریں گی تو؟“

شمشاد بوا گھبرا کر بولیں۔ پاشا میرے پاس، ہج کیا بول کے؟ پر آپ جو مانگو حاضر کروں گی......“

گوری پاشا رونے پر آگئیں...... ”تیرے کو معلوم نا شمشاد، میرے حسن بانو پورے ستائیس

سال کی ہوگئی۔ کاں کاں منتا مراداں نئیں مانی، کیا کیا تڑ جوڑ نئیں کری...... پچاس ہزار کی جائیداد جہیز کے نام پو لکھ کے چھوڑیوں...... سرونگر والی نوی ڈیوڑھی جہیز میں ڈال کو رکھی یوں کتنے زیوراں بھاری بھاری کپڑے لتے، سب کچھ کر کو بیٹھ گئی۔ مگر اللہ صورت دیا سو ایسی کی کوئی آج تک ایک بار دیکھ کو جا کو پلٹا اچ نئیں۔ اب میرے کو پیرومرشد مشورہ دئیں کے تمے اللہ کے نام پہ ایک کنواری لڑکی عمر بھر کے واسطے چھوڑ دیو...... عمر بھی اس کی شادی ہونا نہ انے کسی مرد کا منہ دیکھنا۔ ایسی منت کرے تو جلدی سے بیٹی کو بر مل جاتا۔ اب میں اپنا دامن تیرے سامنے پسارتیوں، تیری چھوکری اللہ رسول سے واقف، نماز روزہ اس کو آتا، اے نے ایک کمرے میں پڑی رہے گی اور تمام زندگی خدا کی عبادت کریں گی“...... پھر وہ ذرا رک کر بولیں...... ”میں تیرے کو پورے پانچ سو روپے دیوں گی...... ایسا مت سوچ کہ تیری بیٹی کو لے لیوں گی...... پھر اللہ کے نام پو کیا ایسی ننگی بھوکی نذر تھوری چڑھاؤں گی، موتی مونگا، کپڑا لتا بھاری سے بھاری پہنا کو چھوڑوں گی......“

شمشاد بوا کا سر گھوم رہا تھا۔ ایسی عجیب و غریب مانگ۔ یہ حقیقت تھی کہ انکار فضول تھا۔ وہ انکار کرتیں تو آج کھڑے کھڑے نوکری سے نکلوا دی جاتیں۔ پھر بیمار میاں اور جوانی سے قریب آتی ہوئی لڑکی کو لے کر کہاں جاتیں...... ؟ اور پھر جو پٹھان دانت نکالے بیٹھا ہوا تھا۔ گھبرا کر انہوں نے ایک دم حامی بھر دی۔

مگر دیکھو شمشاد بوا۔ مریم کو عمر بھر کنواری رکھنا پڑے گا۔ کتا بھی اچھا پیام آوے۔ تمہاری نیت نئیں بدلنا پھر۔“

شمشاد بوا کو ذرا ہنسی بھی آئی، ہم جیسیوں کی بیٹیوں کو کدھر کے اچھے پیاماں آنے کو پڑے...... انہوں نے رضامندی میں منڈیا ہلا دی اور اسی دم گوری پاشا نے پانچ سو روپے گن دیئے۔ دل رکھنے کو بولیں...... ”تو دل چھوٹا نکو کر۔ ویسے تو گھاٹے میں نئیں رئیں گی۔ ذرا مریم پو اللہ کی نظر ہونے دے، اتے لوگاں نذر نیاز لے کو آئیں گے کی تیرا گھر سونے چاندی سے بھر جائیں گا۔ صغیرہ بیگم نے اپنی بیٹی کے واسطے جو کنیز اللہ کے نام پو چھوڑے تھے تیرے کو معلوم ہوئیں گا مجذوب ہوگئی تھی، بے ہوشی میں سچی سچی باتاں بولتی تھی، تو کیسے اس کے سامنے لوگاں نذر لے لے کو آتے تھے......“

شمشاد بوا سن بیٹھی رئیں...........“

مگر اب ان سے آنسو روکے نہ رک رہے تھے، کون ماں ایسی ہوگی، جو نہ چاہے گی کہ اس کی

اولاد کا گھر بسے۔ سکھ چین سے خوشی ہنسی وہ اپنی...... سسرال سدھارے، مرد کے ساتھ زندگی گزارے اور بال بچوں میں مگن رہے؟ یہاں تو پانچ سو میں ساری زندگی ہی تلپٹ ہوگئی۔ مریم کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی...... گوری پاشا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے محبت سے سمجھایا......

”دیکھ مریم، تو زیادہ اس کمرے سے باہر نکو آیا جایا کر...... تو اب بی بی بن گئی، تیرے کو خود اپنی عزت کا خیال ہونا۔ چپ ادھر ادھر بھاگنا کھیلنا نہیں، بس نماز، خران پڑھ لیتے بیٹھے رہنا......“

مریم نے، جس کے کھانے کھیلنے، بھاگنے دوڑنے کے بھرپور دن تھے، بے حد بے بس اور مظلوم نگاہوں سے گوری پاشا کو دیکھا اور سہم کر سر جھکا لیا۔

عمر عزیز کے ۲۷ سال پورے کر لینے کے بعد اب حسن بانو میں لڑکی پن کی کوئی ادا باقی نہ رہی گئی تھی...... گوری پاشا واقعی گوری تھیں...... ماں باپ نے غلط نام نہیں رکھا تھا۔ مگر گوری پاشا نے جنے کیا سوچ کر بیٹی کا نام حسن بانو رکھ دیا تھا۔ نام کی اچھی خاصی تہمت تھیں بے چاری...... پھر کھانے پینے کی ریل پیل، نہ ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ، نہ پڑھنے لکھنے کی پابندی۔ گوشت کو جدھر جدھر راستہ ملا بڑھتا چلا گیا۔ بیٹھتیں تھیں تو لگتا تھا گوشت کا ایک چھوٹا سا پہاڑ بیٹھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں ماں باپ کا کیا کرایا، اچھا ہو یا برا، اولاد کے آگے آتا ہے، یہ اللہ ہی کو معلوم کہ گوری پاشا اور بڑے نواب نے کیا کیا تھا، مگر اللہ کے عتاب میں آئی تو حسن بانو ہی...... ہزاروں روپے پیسے کا لالچ بھی کسی کو پرچا نہ سکا۔ کتنی ہی دیکھنے والے آتے...... آکے پھر جو جاتے تو صورت ہی نہ بتاتے...... ماں نے کیا کیا جتن نہ کر ڈالے۔ سہاگ کا جوڑا ان کے جسم تک کبھی نہ پہنچ پایا۔ مشاطہ سے ایک بار تو یہ تک گپ چپ ہوگئی کہ بھلے سے ایک بار کسی اور لڑکی کو بٹھا دیں گے، ہاں تو ہو جائے...... عین وقت پر ڈولی میں حسن بانو کو سوار کرا دیں گے۔ مگر کسی پیٹ پھوٹی کی وجہ سے یہ بھگل تھی کھل گئی۔ اب آخری حربہ گوری پاشا نے استعمال کر ڈالا...... اس سے پہلے ان کے خاندان میں اللہ کے نام پہ تین کنواری لڑکیاں چھوڑ دی گئی تھیں، اور اللہ کی شان، مری ماری معمر لڑکیاں بھی دلہنیں بن بن کر سسرالوں سدھار گئیں...... تو حسن بانو کے لئے دی گئی نذر اللہ کیسے نہ قبول کرتا؟ ابھی چند ہی دن گزر رہے تھے کہ حیدر آباد ہی کا ایک پیام آگیا۔ گوری پاشا کی جوانی ہی جیسے لوٹ آئی۔ بارہ برس کی چھوکری کی طرح یہاں وہاں اچھلتی پھر رہی تھیں۔ مریم کو ایک اور نیا جوڑا سلوا کر پہنا دیا۔ منہ چوم چوم کر اسے جتایا۔ ”دیکھ بی بی دل لگا کر عبادت کیا کر“...... اور اس کی ماں سے الگ بتایا......”دیکھ شمشاد...... حسن بانو کی شادی ہونے کے بعد اسے اللہ کی باندی بنا کو چ

رکھنا۔ نہیں تو میری بیٹی کو برے دن دیکھنا پڑیں گے“......

پہلے لڑکے کی ماں بہن نے آکر لڑکی دیکھی۔ حالانکہ پسند نہیں کی، مگر پھر بھی واپس نہ گئیں، بلکہ خط کر اپنے رشتے داروں سے بھی رائے پوچھوالی۔ جتنے دنوں میں خطوط کے جواب آئیں آئیں بیٹھی مرغن کھانے کھا کھا کر موٹی ہوتی رہیں۔ پھر ایک دن شکرم منگا کر واپس چلی گئیں۔ ہاں کہا، نہ ناں......“

گوری پاشا کا سارا عتاب مریم پر نکلا......”تو دل لگا کر عبارت نیں کرتی، جبھی تو لوگاں آ کو پلٹ گئیں۔ یاد رکھ جو کمرے سے باہر نکلی“

پہراہی مہینے یوں نکل گئے اور مریم جوانی کی منزلیں سر کرتی گئی۔

ایک دن سخت گرمی سے بوکھلا کر مریم صحن میں نکل آئی۔ شام ہو رہی تھی۔ نہا کر اس نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے...... موتیے کا ایک گجرا کلائی پر لپیٹ لیا تھا۔ ایک دم صحن میں گوری پاشا نکل آئیں اور اسے دیکھتے ہی سن رہ گئیں۔ جوانی کیسی پھٹی پڑ رہی تھی۔ جو جوڑا انہوں نے پچھلے دنوں اسے سلوا کر پہنایا تھا۔ جگہ جگہ سے بکس گیا تھا...... اللہ کی باندی کو گہنوں پاتوں سے کیا کام تھا؟...... گہنوں سے سونے اس کے ہاتھ پاؤں کیسے لس لس کر رہے تھے۔ جسم میں گلابیاں بھر گئی تھیں۔ نندا سی آنکھوں سے نہا کر اٹھنے کی وجہ سے سرمہ ڈھل گیا تھا۔ ایسی گوری صراحی کی طرح گردن، اٹھا کر انہیں دیکھا کہ وہ لرز گئیں۔ آج صبح ہی شمشاد بوا نے ڈرتے ان سے بتایا تھا کہ پرسوں گرمی کے مارے مریم صحن میں نکل آئی تھی۔ ان کے کسی رشتے کے بھتیجے نے اسے دیکھ لیا...... اور حالات سے بے خبر پیام ٹھونک دیا...... تب سے گوری پاشا ڈری سہمی تھیں کہ کہیں مریم کے کانوں تک نہ پہنچ جائے کہ کوئی اس کا خریدار بھی ہے، آئینہ تو اس کے کمرے میں تھا ہی نہیں۔ پانی بھی اسے کٹورے میں نہ پینے دیتیں کہ اس میں عکس دیکھ کر آگاہ نہ ہو جائے کہ کیسا نرگسی حسن پایا ہے۔

کم و بیش اور دو سال گزر جانے کے معنی تھے کہ پچیس سال پورے ہونے میں حسن بانو کی صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے اور مطلب یہ کہ ان ہی دو سالوں نے مریم کو قیامت بنا دیا ہے اور اب تک اللہ نے نذر قبول نہیں کی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مریم دل لگا کر عبادت نہیں کرتی۔

لیکن گوری پاشا کا خدشہ بے بنیاد تھا۔ اس لئے کہ مریم کی توجہ کا مرکز واقعی صرف خدا ہی تھا اور اس کا ثبوت یوں ملا کہ اس واقعے کے بعد پھر سے اچانک علی گڑھ سے ایک دھڑ دھڑاتا ہوا پیام ایسا آگیا کہ خود نوشہ میاں بھی ماں بہن کے ساتھ چلے آئے......“

ہوا یہ کہ نواب صاحب کے جان پہچان والوں میں سے کسی کا علی گڑھ جانا ہوا۔ وہاں حسن بانو کا ذکر نکل آیا کہ بے حساب پیسہ ہے اور لڑکی......بس یہ کہ انسان کا بچہ ہے، کیا مضائقہ ہے اگر دیکھ ہی لیا جائے۔ حسن نہ سہی، دولت ہی بے حساب سہی۔ گوری پاشا نے مہمانوں کو ہاتھوں میں لیا۔ ایسی خاطر واضع کی کہ عربوں کو مات دے دی......روز دعوتیں......روز دعوتیں، پھر اسی پر بس نہیں، مہمان کو یہاں گھمانا، وہاں گھمانا، وہاں پھرانا.........“

ایک دن چودھویں کا چاند آسمان پر کھلا ہوا تھا، گوری پاشا نے اپنے مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے گنڈی پیٹھ کا پروگرام بنایا۔ بڑے نواب صاحب کی فورڈ میں سب لوگ روانہ ہو گئے، سوائے ایک ظفر میاں کے، ان کا جی ٹھیک نہیں تھا، ویسے بھی وہ ذرا تنہائی پسند تھے۔

رات بھیگ چکی تھی، مارے اکتاہٹ کے وہ صحن میں نکل آئے۔ امی جان اور باجی کی منطق ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ انہیں ایم اے امتحان دینا تھا اور وہ ان کو یہاں گھسیٹ لائی تھیں، پھر یہ کہ چار چھ دن ہو چکے تھے، قاعدے کے مطابق امی جان نے لڑکی بھی دیکھ ہی لی تھی، پھر پیام دے کر ہست نیست کر دیتیں، پتہ نہیں کیا سوچ بچار رہے؟ کدھر پھنس گیا میں بھی۔ مجھے بھی لڑکی کی ایک جھلک کسی بہانے دکھا دیں گی تو وہ بھی نہ ہوا۔ بردکھوا تو خیر ہو گیا اور میں انہیں پسند آ بھی گیا......وہ خود ہی ہنس پڑے......یہ بردکھوا بھی عجیب چیز ہے اور اگر میں انہیں پسند نہ آیا تو......؟ انہوں نے صحن میں پڑا ہوا ایک چھوٹا سا کنکر اٹھا کر یوں ہی ہوا میں اچھال دیا۔

صحن میں مہندی کی اوٹ میں مریم نے جاء نماز بچھا کر ابھی ابھی نماز سے فراغت حاصل کی تھی۔ گرمیوں کی السائی ہوئی رات تھی، وہ کمرے کی گرمی سے گھبرا کر اکثر موتیا اور مہندی کی باڑھ کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتی تھی۔ دعاؤں کے لئے اس نے اللہ کے حضور ہاتھوں کا پیالہ سا بنا رکھا تھا کہ پٹ سے وہ کنکر اس کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اس نے آگے کو سر جھکا کر دیکھا کہ کنکر کیسے آیا؟ اسی دم ظفر میاں کی نظر بھی ادھر ہی اٹھ گئی۔ مریم نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا۔ کتنے سال تک ہو گئے تھے اس نے کسی مرد کی صورت نہ دیکھی تھی......اور اب دیکھی تو ظفر میاں کی۔ سانولا سلونا مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ ہلکی ہلکی مونچھیں، سادہ قمیض پاجامہ، اونچا قد، وہ شاید بستر سے اٹھ کر چلے آئے تھے کہ بال بے ترتیبی سے ماتھے تک اتر آئے تھے۔ علی گڑھ کے رہے، پلے، بڑھے، پڑھے لکھے، ظفر میاں ایسی موم کی ناک تو تھے نہیں کہ حسین چہرے کو دیکھتے اور یوں ہی چپ رہ جاتے۔ آگے بڑھے اور مسرور ہو کر بولے......”آپ اتنی حسین ہیں کہ اصلی نہیں نقلی لگتی ہیں، تو پھر امی اور باجی نے دیر کیوں لگائی ہے؟ کیا میں یا دنیا کا کوئی مرد آپ کو ناپسند کر سکتا ہے؟ بلکہ نعوذ باللہ آپ کو سجدہ بھی کر سکتا ہے۔“

مریم اب بھرپور جوان تھی، سولہ سال کی عمر میں اس نے وہ رنگ روپ نکالا تھا کہ جو دیکھے بہہ جائے۔ نہ محنت، نہ مشقت، آرام کی کھانے اور روز روز کی صفائی اور غسل نے اس کی جوانی کو بھرپور راستہ دیا کہ بڑھتی چلی آ، اور جب جوانی جوانی کو دیکھتی ہے تو بغیر سمجھائے سب کچھ سمجھ جاتی ہے۔ مریم اب بچی نہ تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ اسے راہبہ کا درجہ کسی نے اور کن حالات نے دیا ہے۔ وہ ذرا رکتے، جھجکتے بولی......”آپ غلط نکو سمجھو، میں وہ نہیں جو آپ سمجھ لے رئیں......میں اللہ کے نام پو چھوڑی ہوئی کنیز ہوں، میں مریم ہوں......اس ڈیوڑھی کی ماما کی لڑکی......“

ظفر میاں حیدر آباد کی اس خبیث رسم سے واقفیت رکھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ حالات کی ماری روحیں ہر کڑا ستم کس طرح اٹھانے پر مجبور ہیں۔ وہ بڑے دکھ سے بولے :

”مطلب یہ ہے کہ آپ پر خوشیوں کے سارے دروازے بند ہیں......؟“

مریم نے سر جھکا دیا

وہ پھر بولے......”اور آپ نے کبھی اس ظلم کے خلاف کوئی آواز بھی نہیں اٹھائی ؟“

مریم نے آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ سبز آنکھیں جو کاجل سرمے سے بے نیاز تھیں۔ پھر بھی تلوار تھیں۔

مریم انہیں بس دیکھتی رہی۔ ”کیا یہ آپ کے نام کی سزا ملی ہے کہ عمر بھر کنوارپن کا دکھ بھوگتی رئیں ؟

مریم کچھ بھی نہ بولی......“

”آپ کتنے سالوں سے اس عبادت گاہ میں بند ہیں جس کی قید اور زنجیریں آپ کے حسن، جوانی اور الھڑ پن کے گرد حصار نہیں بن سکیں ؟“

مریم نے ایک لمبی سانس لے کر اپنی خوب صورت کا فوری انگلیاں اٹھا دیں......سات سال، میرے خدا......ظفر میاں نے سر تھام لیا۔ ”اتنے سارے سالوں میں کبھی آپ نے چاند دیکھا......؟ مریم نے انکار میں سر ہلا دیا۔

”کبھی آپ نے پھول دیکھے؟ کبھی آپ نے برسات کی پہلی بوچھاڑ دیکھی، جو پیاسی سے پیاسی دھرتی کو بھی سیراب کر دیتی ہے؟ کبھی ان آوارہ بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھی، جو دل میں سوئی

ہوئی امنگوں کو جگاتے ہیں ؟ جاڑوں کی گرم صبحیں، گرمیوں کی خنک شامیں، برسات کی کپکپادینے والی راتیں...... یہ سب آپ کے دل پر سے ہو کر گزری ہوں گی، لیکن کبھی آپ نے اپنے حق کے لئے کوشش کی ؟''

''جی...... ؟'' مریم نے بڑی اچھنبے اور بھول پن سے پوچھا، میں کیا کوشش کرتی؟ میں نمازیں پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگتی تھی کہ اللہ چھوٹی پاشا کے سہرے کے پھولاں کھلادے۔''

ظفر میاں اچانک آگے بڑھے...... ''اور کبھی یہ سوچا کہ دوسروں کے پھول کھلاتے کھلاتے تمہارے اپنے چہرے کا یہ پھول ایک دن اپنی تازگی کھو بیٹھے گا'' ......؟ اور انہوں نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں مریم کا پاکیزہ چہرہ تھام لیا۔

مریم سر سے پاؤں تک لرز کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''خدا کے واسطے آپ میرے کونکو چھوؤ۔ خدا ناراض ہوجائیں گا۔ آپ کو نئیں معلوم......''

ظفر میاں تیز لہجے میں بولے...... ''کس خدا نے تمہیں یہ سزا دی ہے؟ اس ڈیوڑھی کے خداؤں نے...... اوپر والے نے آج تک کسی کو ایسی بھیانک سزا نہیں دی۔ جانتی ہو مریم، مرد عورت ایک دوسرے کے لئے ہی بنائے گئے ہیں اور خدا نے یہ جوڑے بنائے ہیں۔ خدا جوڑے ملاتا ہے، توڑتا نہیں۔ تم...... تم شاید میرے لئے بنی تھیں......''

مریم نے گھبرا کر انہیں دیکھا...... ''آپ کو نئیں معلوم پاشا......''

''مجھے سب معلوم ہے مریم۔ میں سب جانتا ہوں، ان چند دنوں کے مختصر قیام میں، میں اتنا کچھ جان گیا ہوں کہ شاید تم اتنے سارے سالوں کی زندگی میں نہیں جان سکی ہوگی۔ شمشاد بوا کو جانتی ہو، انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، یہ بھی کہ امی اور باجی ہیص بیص میں ہیں۔ بے انداز دولت نے ان کی آنکھیں چکاچوند کردی ہیں اور یہ طے نہیں کر پا رہے ہیں کہ مجھ سے بڑی، جو شکل صورت میں بھی اچھی نہیں، ایک لڑکی کے عوض یہ سودا قبول کر لینا دانش مندی ہوگی یا بیوقوفی۔'' وہ رک کر ہنسے...... ''اور شمشاد بوا نے مجھے یہ بھی بتایا کہ تم ان کی اکلوتی لڑکی ہو......'' مریم نے گھبرا کر سر اوپر اٹھایا۔

''اور یہ بھی کہ اس وقت تم ان کے کہنے پر ادھر مہندی کی اوٹ میں عبادت کر رہی تھیں اور یہ کہ اگر آج رات میں تمہیں یہاں سے لیکر چلا جاؤں تو وہ باقی زندگی بڑے سکون کے ساتھ گزار سکیں گی......؟

مریم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''میں تو ویسے بھی یہاں سے جانے ہی والا تھا لیکن شاید خدا نے لکھ دیا تھا کہ میں تنہا نہ جاؤں......'' وہ مریم کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش میں اس کے قریب سرک آئے...... ''مریم آج تک اس ڈیوڑھی کی اور مہیب اور ہولناک دیواروں نے تمہارا صبر لوٹا ہے...... تمہیں منہ چڑھاتی آئی ہیں...... آج حوصلہ کر کے تم یہ بلندیاں سر کرلو......''

مگر...... م...... میں نے پاشا کا نمک......''

''نمک اور شکر کو مارو گولی، کوئی کسی کا دیا نہیں کھاتا۔ سب خدا کا دیا کھاتے ہیں۔ تمہاری جہالت نے تمہیں اس قید میں ڈال رکھا ہے۔ تم میرے ساتھ علی گڑھ چلو...... پہلے ہم شادی کریں گے، پھر میں تمہیں پڑھاؤں گا آں ؟...... انہوں نے بڑے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ آنکھیں، وہ کنواری اور معصوم آنکھیں، وہ پاکیزہ آنکھیں جو آج تک کسی مرد کی طرف نہیں اٹھیں تھیں......

''اور ہمارے گئے پیچھے لوگاں جو باتاں بنائیں گے ؟...... اس نے بے حد ڈر کر پوچھا۔

ظفر میاں ہنس دیئے...... ''باتیں بنانے والے کب باتیں نہیں بناتے جان !

سرخ سرخ بجری ان دونوں کے پیروں تلے بجنے لگی۔ اس کا گلابی گلابی...... نرم گرم ہاتھ تھامے وہ بڑھتے ہی گئے............''

* * *

ذرا ہور اوپر

نواب صاحب نوکر خانے سے سے جھومتے جھامتے نکلے تو اصلی چنبیلی کے تیل کی خوشبو سے ان کا سارا بدن مہکا جا رہا تھا۔

اپنے شان دار کمرے کی بے پناہ شان دار مسہری پر آ کر وہ دھپ سے گرے تو سارا کمرہ معطر ہو گیا...... پاشا دلہن نے ناک اٹھا کر فضا میں سونگھتے ہی خطرہ محسوس کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ نواب صاحب کے پاس پہنچ چکی تھیں...... سراپا انگارہ بنی ہوئی۔

''سچی سچی بول دیو، آپ کاں سے آ رئیں...... جھوٹ بولنے کی کوشش نکو کرو......''

نواب صاحب ایک شان دار ہنسی ہنسے۔

''ہمنا جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جو تم سمجھے وہ ہچ سچ ہے۔''

''گل بدن کے پاس سے آ رئیں نا آپ؟''

''معلوم ہے تو پھر پوچھنا کاہے کو؟''

جیسے آگ کسی نے بارود دکھا دی ہو۔ پاشا دولہن نے دھنا دھن پہلے تو تکیہ کوٹ ڈالا۔ پھر ایک ایک چیز اٹھا اٹھا کر کمرے میں پھینکنی شروع کر دی، ساتھ ہی ساتھ ان کی زبان بھی چلتی جا رہی تھی۔

''اجاڑ انے ابا جان اور امنی جان کیسے مردوئے کے حوالے میرے کو دیئے غیرت شرم تو چھو کر بھی نہیں گئی دنیا کے مردوئے ادھر ادھر تانک جھانک کرتے نہیں کیا، پن انے تو میرے سامنے سامنے اودھم مچالے رہئیں۔ ہور اجاگری تو دیکھو، کتے مزے سے بولتیں، معلوم ہے تو پھر پوچھنا کائے کو، میں بولتیوں اجاڑ یہ آگ ہے کیسی کی بجھتی اچ نئیں۔ کتے عورتاں انے ایک مردوئے کو ہونا جی''...... اب وہ ساتھ ساتھ پھپھک پھپھک کر رونے بھی لگی تھیں...... ''اجاڑ میرے کو یہ زندگی نکو۔ اپنا راج محل تمچ سنبھالو...... میرے کو آنچ طلاخ دے دیو، میں ایسی کال کونڈی میں نئیں رہنے والی''......

مگر جو پیاسا زور کی پیاس میں پانی چھوڑ شراب پی کر آیا ہو، وہ بھلا اتنی دیر تک جاگتا ہے؟ اور عورت کی گرمی ملے تو یوں بھی اچھا بھلا مرد پٹ کر سو جاتا ہے...... نواب صاحب بھی اس وقت اس تمام ہنگامے سے بے خبر گہری نیند سو چکے تھے۔

کیسی زندگی پاشا دولہن گزار رہی تھیں۔ بیاہ کر آئیں تو بیس سے اوپر ہی تھیں۔ اچھے برے کی اتنی تمیز بھی نہ تھی کہ میاں کے پیر دکھیں تو رات بے رات خود ہی دبا دیں۔ جوانی کی نیندیوں بھی کیسی ہوتی ہے کہ کوئی گھر لوٹ کر لے جائے اور آنکھ تک نہ پھڑے کے۔ جب بھی راتوں میں نواب صاحب نے درد کی شکایت کی، انہوں نے ایک کروٹ لے کر اپنے ساتھ آئی باندیوں میں سے ایک آدھ کو میاں کی پائنتی بٹھا دیا اور اسے ہدایت کر دی ''لے ذرا سرکار کے پاؤں دبا دے، میرے کو نیند آ رئی۔''

صبح کو یہ خود خوش باش اٹھتیں اور نواب صاحب بھی...... کبھی کبھار نواب صاحب لگاوٹ سے شکایت بھی کرتے:

''بیگم آپ کبھی تو ہمارے پاؤں دبا دیو، آپ کے ہاتھاں میں جو لذت ملے گی وہ انے خرام زادیاں کاں سے لائیں گے۔''

مگر یہ بلبلا جاتیں...... ''ہور یہ ایک نوی بات سنو، بھلا پاواں دبانے کے لائخ ہوں کیا۔ اس واسطے تو امنی جان باندیاں کی ایک فوج میرے ساتھ کر دیئے کہ بیٹی کو تخلیف نئیں ہونا بول کے۔''

اور نواب صاحب دل میں بولتے...... خدا کرے تم ہور گہری نیند سو...... تمہارے سوتے اچ ہمارے واسطے تو جنت کے دروازے کھل جاتیں۔

مگر دھیرے دھیرے پاشا دولہن پر یہ بھید یوں کھلا کہ نواب صاحب کی نویلی دولہن سے یک سر بے گانہ ہوتے چلے گئے...... اب بیاہی بھری تھیں اتنا تو معلوم ہی تھا کہ جس طرح پیٹ کی ایک بھوک ہوتی ہے اور بھوک لگنے پر کھانا کھایا جاتا ہے اسی طرح جسم کی ایک بھوک ہوتی ہے اور اس بھوک کو بھی بہر طور مٹایا ہی جاتا ہے۔ پھر نواب صاحب ایسے کیسے مرد تھے کہ برابر میں خوشبوؤں میں بسی دولہن تھوی اور وہ ہاتھ تک نہ لگاتے...... اور اب تو یہ بھی ہونے لگا تھا کہ رات بے رات کبھی ان کی آنکھ کھلتی...... تو دیکھتیں کہ نواب صاحب مسہری سے غائب ہیں

اب غائب ہیں تو کہاں ڈھونڈیں، حویلی بھی تو کوئی ایسی ویسی حویلی تھی۔ حیدر آباد دکن کے

مشہور نواب ریاست یار جنگ کی حویلی تھی کہ پوری حویلی کا ایک ہی چکر لگانے بیٹھو تو موئی ٹانگیں ٹوٹ کر چورا ہو جائیں۔ پھر رفتہ رفتہ آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں۔ کچھ ساتھ کی بیاہی سہیلیوں کے تجربوں سے پتہ چلا کہ مرد پندرہ پندرہ بیس بیس ہاتھ تک نہ لگائے، راتوں کو مسہری سے غائب ہو جائے تو دراصل معاملہ کیا ہوتا ہے...... لیکن یہ ایسی بات تھی کہ کسی سے کچھ بولتے بنتی نہ بتاتے مشورہ بھی کرتیں تو کس سے؟ اور کرتیں بھی کیا کہہ کر، کیا یہ کہہ کر میرا میاں عورتوں کے پھیر میں پڑ گیا ہے، اسے بچاؤں کیسے؟ اور صاف سیدھی بات تو یہ تھی کہ مرد وہی بھٹکتے ہیں جن کی بیویوں میں انہیں اپنے گھٹنے سے باندکر رکھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا...... وہ بھی آخر مرد ہی ہوتے ہیں جو اپنی ہاری اپنی ماری تھی۔ لیکن کر بھی کیا سکتی تھیں، خود میاں سے بولنے کی تو کبھی ہمت ہی نہ پڑی، مرد جب تک چوری چھپے منہ کالا کرتا ہے، ڈرا سہما ہی رہتا ہے، اور جہاں بات کھل گئی وہیں اس کا منہ بھی کھل گیا۔ پھر تو ڈنکے کی چوٹ کچھ کرتے نہیں ڈرتا۔ لیکن ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے...... ایک دن آدھی رات کو یہ تاک میں بیٹھی ہوئی تھیں، آخر شادی کے اتبت ساک گزار چکی تھیں۔ دو دتین بچوں کی ماں بھی بن چکی تھیں۔ اتنا حق تو رکھتی ہی تھیں...... اور عقل بھی کہ آدھی رات کو ب مرد کہیں سے آئے اور یوں آئے کہ چہرے پر یہاں وہاں کالک ہو تو وہ سوا پرائی عورت کے کاجل کے اور کاہے کی کالک ہو سکتی ہے کیونکہ بہرحال دنیا میں اب تک یہ تو نہیں ہوا ہے کہ کیس کے گناہوں سے منہ کالا ہو جائے۔

جیسے ہی نواب صاحب کمرے میں داخل ہوئے کہ چیل کی طرح جھپٹیں اور ان کے چہرے کے سامنے انگلیاں نچا کر بولیں۔ ''یہ کالک کاں سے تھوپ کو لائے؟''...... اور نواب صاحب بھی آخر نواب ہی تھے، کسی حرام کا تخم تو تھے نہیں، اپنے ہی باپ کی عقد خوانی کے بعد حلال کی اولاد تھے۔ ڈرتا ان کا جوتا۔ بڑے رسان سے بولے۔ ''یہ مہرو کم بخت بہوت کاجل بھرتی اپنے آنکھاں میں، لگ کیا ہوئیں گا، اس کا''......

ایسے تیہے سے تو پاشا دولہن اٹھی تھیں مگر یہ سن کر وہیں ڈھیر ہو گئیں...... اگر مرد ذرا بھی آنا کانی کرے تو عورت کا گالیان دینے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن یہاں صاف سیدھی طرح انہوں نے گویا اعلان کر دیا کہ ''ہاں ہاں، میں نے بھاڑ جھونکا...... اب بولو!''

پاشا دولہن کچھ بول ہی نہ سکیں، بولنے کو تھا بھی کیا؟ جو چپکی ہوئیں تو بس چپ ہی لگ گئی...... اب محل کے سارے ہنگامے، ساری چہل پہل، ساری دھوم دھام ان کے لئے بے معنی تھی۔ ورنہ وہی پاشا دولہن تھیں کہ ہر کام میں گھسی پڑتی تھیں...... پہلے تو دل میں آیا کہ جتنی بھی یہ جوان جوان حرام خورنیاں ہیں انہیں سب کو ایک سرے سے برطرف کر دیں، لیکن روایت سے اتنی بڑی بغاوت بھی کیسے کر سکتی تھیں، پھر اپنے مقابل کی حیثیت والیوں میں یہ بھی مشہور ہو جاتا کہ اللہ مارے کیسے نواباں ہیں کہ کام کاج کو چھوکریاں تک نہیں رکھے۔ بس ہر طرف سے بار ہی ہار تھی۔ دل پر دکھ کی مار پڑی تو جیسے ڈھیر ہی ہو گئیں۔ نئی نئی بیماریاں بھی سر اٹھانے لگیں...... کمر میں درد، پیروں میں دو دا ایک اینٹھن تھی کہ جان لئے ڈالتی۔ حکیم صاحب بلوائے گئے اس زمانے کے حیدرآباد میں مجال تھی کہ حکیم صاحب محل والیوں کی جھپک تک دیکھ سکیں۔ بس پردے کے پیچھے سے ہاتھ دکھا دیا جاتا۔ پھر ساتھ میں ایک بی بی ہوتیں جو حکیمن اماں کہلاتی تھیں...... وہ سارے معاملے کرتیں اور یوں دوا تجویز ہوتی بس حکیم صاحب نبض دیکھنے کے گناہ گار ہوتے۔

پاشا دولہن کی کیفیت سن کر حکیم صاحب کچھ دیر کے لئے خاموش رہ گئے انہوں نے بظاہر غیر متعلق سی باتیں پوچھیں جس کا دراصل اس بیماری سے بڑا گہرا تعلق تھا۔

''نواب صاحب کہاں سوتے ہیں؟''

حکیمن اماں نے پاشا دولہن سے پوچھ کر بات آگے بڑھائی۔ ''جی انوں مردانے میں اچ سوتے ہیں۔''

اب حکیم صاحب بالکل خاموش رہ گئے۔ سوئے ادب! کچھ کہتے تو مشکل نہ کہتے تو مشکل۔ بہرحال ایک تیل مالش کے لئے دے گئے۔

پاشا دولہن کو ان کم بخت باندیوں سے نفرت ہو گی تھی۔ بس نہ چلتا کہ سامنے آتیں اور کچا چبا جاتیں۔ باندیوں میں سے کسی کو انہوں نے اپنے کام کے لئے نہ چنا۔ حویلی کا ہی پالا ہوا ایک چھوٹا سا چھوکرا تھا۔ انہوں نے طے کر کہا کہ مالش اسی سے کرائیں گی، چودہ پندرہ برس کے چھوکرے سے کیا شرم؟

اس بیچ میں دو تین بار نواب صاحب اور دولہن پاشا کی خوب زوردار لڑائی ہوئی۔ شکر ہے کہ جو نوبت طلاق تک نہ پہنچی۔ اب تو نواب صاحب کھلم کھلا کہتے تھے...... ''ہاں میں آہ اس کے ساتھ رات گزارا۔ اس کے ساتھ مستی کیا تم نا کچھ بولنا ہے؟''

پاشا دولہن بھی جی کھول کو کوستیں کاٹتیں۔ ایک دن دبے الفاظ میں جب انہوں نے اپنی ''بھوک'' کا ذکر کیا تو نواب صاحب ذرا حیرت سے انہیں دیکھ کر بولے۔ دیکھو اللہ کو معلوم تھا کہ

مرد کو کچھ زیرہ ہونا پڑتا اس واسطے اچ اللہ مردوں کو چار، چار شادیوں کی اجازت دیا۔ ایسا ہوتا تو عوتاں کو کیوں نئیں دے دیتا تھا۔'' یہ ایک ایسا نکتہ نواب صاحب نے پکڑا کہ پاشا دولہن تو بالکل ہی لاجواب ہو کر رہ گئیں اور یوں رہی سہی جو بھی پردہ داری تھی بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ اس صبح ہی کی بات تھی کہ انہوں نے سر میں تیل ڈالنے کو چنبیلی کے تیل کی شیشی اٹھائی اور وہ کم بخت ہاتھ سے ایسی چھوٹی کہ ندی سی بہہ اٹھی۔ گھبرا کر انہوں نے پاس کھڑی گل بدن کو پکارا۔

''بیکا نہہ کو جار تو اچ اپنے سر میں چپڑ لے''

اور رات کو وہ ساری خوشبو نواب صاحب کے بدن میں منتقل ہو گئی۔ جس کے بارے میں اعلان کرتے ہوئے انہیں ذرا سی جھجک یا شرم محسوس نہیں ہوئی۔

پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ عورت بیسی اور گھیسی۔ عورت تو تیس کی ہو کر کچھ اور ہی چیز ہو جاتی ہے۔ ان دنوں کوئی پاشا دولہن کا روپ دیکھتا۔

چڑھتے چاند کی جوانی، پور پور چٹخا پڑتا۔ برسات کی راتوں میں ان کے جسم میں وہ تناؤ پیدا ہو جاتا جو کسی استاد کے کسے ہوئے ستار میں کیا ہوگا۔ اتنا سا چھوکرا کیا اور اس کی بساط کیا۔ سر اور کمر سے نپٹ کر وہ پیروں کے پاس آ کر بیٹھتا تو اس کے ہاتھ دکھ دکھ جاتے۔ پنڈلیوں کو جتنی زور سے دباتا، وہ یہی کہے جاتیں:

''کتے! ہلو ہلو دباتا رے تو...... ذرا تو طاقت لگا۔''

چودہ پندرہ سال کا چھوکرا ڈر ڈر کے سہم سہم کر دبائے جاتا کہ کہیں زور سے دبا دینے پر پاشا ڈانٹ نہ دیں، اتنی بڑی حویلی کی مالک جو تھیں۔

حویلی میں ان دنوں خواتین میں کلی دار کرتوں پر چوڑی دار پاجامے پہننے کا رواج تھا، لڑکیاں بالیاں غرارے بھی پہن لیتیں...... اور بڑے ہنگاموں کے بعد اب ساڑھی کا بھی نزول ہوا تھا، مگر بہت ہی کم پیمانے پر......

چوڑی دار پاجامے میں پنڈلیاں صرف دبائی جا سکتی تھیں، تیل مالش کیا خاک ہوتی۔ پاشا دولہن نے ماما کو بلوا کر اپنے پاس کھڑا کیا۔ یہ حویلی کسی نوکر کے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ پھر پاشا بولیں:

دیکھو یہ انے چھوکرا رحمت ہے نا؟ اس کو کھانے پینے اچھا اچھا دیو...... ناشتے میں اصلی گھی کے پراٹھے بھی دیو۔ انے میرے پیراں کی مالش کرتا، مگر ذرا بھی اس میں طاخت نئیں۔ اب میں جتا کو

دی۔''

پھر خود انہوں نے غرارہ پہننا شروع کر دیا۔ تاکہ پنڈلیوں کی اچھی طرح مالش ہو سکے اور انہیں درد سے نجات ملے۔

اب جب دوپہر کو مالش شروع ہوتی تو ایک ہی مکالمے کی گردان رحمت کے کانوں سے ٹکراتی۔

''ذرا ہور اوپر''

وہ سہم سہم کر مالش کرتا۔ ڈر ڈر کر پاشا کا منہ تکتا۔ تیل میں انگلیاں چپڑ کر وہ غرارہ ڈرتے ڈرتے اوپر کھسکاتا تاکہ کہیں مشجر، یا کمخواب کے غرارے کو تیل کے دھبے بدنما نہ بنا دیں۔ چم چماتی پنڈلیاں تیل کی مالش سے آئینہ بنتی جا رہی تھیں۔ رحمت غور سے دیکھتے دیکھتے گھبرا گھبرا کر اٹھتا کہ کہیں ان میں اس کا چہرہ نہ دکھائی دے جائے۔

ایک رات دولہن پاشا کے پیروں میں کچھ زیادہ ہی درد اور اینٹھن تھی۔ رحمت مالش کرنے بیٹھا تو سہمتے سہمتے اس نے پنڈلیوں تک غرارہ کھسکایا۔

''''ذرا ہور اوپر''...... دولہن پاشا کسمسا کر بولیں۔ آج اجاڑا اتا درد ہو ریا کہ میرے کو بخار جیسا لگ ریا۔ گھٹنوں تک مالش کر ذرا۔ تو تو خالی بس پنڈلیاں اچ دبا ریا۔''

رحمت نے بخار کی سی کیفیت اپنے اندر محسوس کی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے غرارہ اور ''اوپر'' کھسکایا اور ایک دم ناریل کی طرح چکنے چکنے اور سفید مدور گھٹنے دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔ تر تراتے گھی کے پراٹھوں، دن رات کے میوؤں اور مرغن کھانوں نے اسے وقت سے ذرا پہلے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا، جہاں نیند کی بجائے جاگتے ہیں ایسے ویسے خواب دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس نے ہڑبڑا کر غرارہ ٹخنوں تک کھینچ دیا تو اونگھتی ہوئی پاشا دولہن بھنا گئیں۔

''ہورے۔ میں کیا بول رئی تو کیا کر ریا؟'' انہوں نے ذرا سا سر اٹھا کر غصے سے کہا...... وہاں ان کے سرہانے سنسناتا ہوا جوان ہوتا ہوا وہ چھوکرا بیٹھا تھا جسے انہوں نے اس لئے چنا تھا کہ انہیں چھوکریوں سے ازحد نفرت ہو گئی تھی کہ...................کم بختیں ان کے میاں کو ہتھیا ہتھیا لیتی تھیں۔

انہوں نے غور سے اسے دیکھا اس نے بھی ڈرتے ڈرتے سہی، مگر ذرا غور سے انہیں دیکھا اور اک دم سر جھکا لیا۔

ٹھیک اسی وقت نواب صاحب کمرے میں داخل ہو گئے جانے کون سا نشہ چڑھا کر آئے تھے

کہ جھولے ہی جارہے تھے۔ آنکھیں چڑھی پڑرہی تھیں۔ مگر اتنے نشے میں بھی بیگم کے قدموں میں اسے بیٹھادیکھکر چونک اٹھے۔

’’یہ انے حرام زادہ مسٹنڈا یہاں کیا کرنے کو آیا بول کے؟‘‘

رحمت تو نواب صاحب کو دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ گیا مگر پاشا دولہن بڑی رعونت سے بولیں۔ ’’آپ کو میرے بیچ میں بولنے کا کیا خ ہے؟‘‘

’’خ؟‘‘ وہ گھور کر بولے۔ ’’تمہار دھگڑا ہوں، کوئی پالکڑا نئیں، سمجھے رہی خ کی، سو یہ خ اللہ اور اس کا رسول دیا۔ کون تھا وہ مردود؟‘‘

’’آپ اتے سالاں ہوگئے۔ آپ ایکو ایک چھوکری سے پاواں دبائے رہئیں۔ ہور اللہ معلوم ہور کیا کیا تماشے کرلے رہئیں۔ وہ سوب کچھ نئیں، ہور میں کبھی دکھ میں، بیماری میں مالش کرانے ایک آدھ چھوکرے کو بٹھالی تو اتے حساباں کائے کو‘‘

’’اس واسطے کی مرد بولے تو دالان میں بچھا خالین ہوتا کہ کتے بھی پاواں اس پہ پڑے تو کچھ فرخ نہیں پڑتا۔ ہور عورت بولے تو عزت کی سفید چدر ہوتی کہ ذرا بھی دھبا پڑا تو سب کی نظر پڑ جاتی......‘‘

دولہن پاشا بلبلا کر بولیں۔ ’’ائی اماں، بڑی تمہاری عزت جی، ہور تمہاری بڑی شان، اپنے دامن میں اتے داغں رکھ کو دوسرے کو کیا نام رکھتے جی تمے، ہور کچھ نئیں تو اتے سے پوٹے کے اپر اتا واویلا کرلیتے بیٹھیں۔‘‘

اک دم نواب صاحب چلائے ’’تمنا وہ پوٹا اتا اتا سا دکھتا؟ ارے اج اس کی شادی کرو نو مہینے میں باپ بن کر دکھادیں گا۔ میں جتادیا آج سے اس کا پاؤں نئیں دکھنا تمہارے کمرے میں؟‘‘

پاشا دلہن تن کر بولیں ’’ہور دکھا تو؟‘‘

’’دکھا تو طلاخ‘‘ ......وہ آخری فیصلہ سناتے ہوئے بولے۔

’’ابھی کھڑے کھڑے دے دیو‘‘ پاشا دولہن اسے تیھے سے بولیں۔

اک دم نواب صاحب سٹ پٹا کر رہ گئے۔ بارہ تیرہ سال میں کتنی بار تو تو، میں میں ہوئی۔ کتنے رگڑے جھگڑے ہوئے...... باعزت، باوقار دو خاندانوں کے معزز میاں بیوی، جو پہلے ایک دوسرے کو آپ، آپ کہتے نہ تھکتے تھے اب تم تمار تک آگئے تھے...... مگر یہ نوبت تو کبھی نہ آئی تھی، خود پاشا دولہن نے ہی کئی بار یہ پیش کش کی کہ ایسی زندگی سے تو اجاڑ میرے کو طلاخ دے دیو...... لیکن یہ کبھی نہ ہوا تھا کہ خود نواب صاحب نے یہ فال بدمنہ سے نکالی...... اور اب منہ سے نکالی بھی تو یہ کہاں سوچا تھا کہ وہ کہیں گی کہ ’’ہاں ابھی کھڑے کھڑے دے دیو!!‘‘

مگر پاشا دولہن کی بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے وہ تمتماتے چہرے کے ساتھ بولیں۔ ’’ہور طلاخ لئے بعد سارے حیدرآباد کو سناتی پھروں گی کہ تمے عورت کے لائخ مرد نئیں تھے۔ یہ بچے تمہارے نئیں۔ اب چھوڑو میرے کو ہور دیو میرے کو طلاخ!‘‘‘

یہ عورت چاہتی کیا ہے آخر؟......نواب صاحب نے سر پکڑ لیا انہوں نے ذرا شک بھری نظروں سے بی بی کو دیکھا۔ کہیں دماغی حالت مشتبہ تو نہیں وہ سنا رہی تھیں۔

’’اس حویلی میں دکھ اٹھائی نا میں تمہارے ہوئے اب سکھ بھی اٹھاؤں گی تمہارے اچ ہوتے سن لیو۔‘‘‘

دوسری رات پاشا دولہن نے سرسراتی ریشمی ساڑھی اور لہنگا پہنا۔ خود بھی تو ریشم کی بنی ہوئی تھیں۔ اپنے آپ میں پھسلی پڑرہی تھیں۔ پھر جب رحمت مالش کرنے بیٹھا تو بس بیٹھا ہی رہ گیا۔

’’دیکھتا کیا ہے رے؟ ہاتھوں میں دم نئیں کیا؟‘‘

اس نے سرسراتا لہنگا ڈرتے ڈرتے ذرا اوپر کیا۔

’’اس کو مالش بولتے کیا رے نکھے!‘‘ ان کی ڈانٹ میں لگاوٹ بھی تھی۔

رحمت نے سرخ ہوتے کانوں سے پھر اور سنا...... ’’ذرا ہور اوپر‘‘۔

’’ذرا ہور اوپر‘‘......

گہرے اودے رنگ کا لہنگا اور گہرے رنگ کی ساڑھی ذرا اوپر ہوئی اور جیسے بادلوں بجلیاں کوندیں۔

’’ذرا ہور اوپر‘‘......

’’ذرا ہور اوپر‘‘......

’’ذرا ہور اوپر‘‘......

’’ذرا ہور اوپر‘‘......

تلملا کر صندل کے تیل سے بھری کٹوری اٹھا کر رحمت نے دور پھینک دی، اور اس ’’بلندی‘‘ پر پہنچ گیا جہاں تک ایک مرد پہنچ سکتا ہے اور جس کے بعد ’’ذرا ہور اوپر‘‘...... کہنے سننے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

دوسرے دن پاشا دولہن پھول کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ صندل ان کی من پسند خوشبو تھی۔ صندل کی مہک سے ان کا جسم لدا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے رحمت سے پانی مانگا تو وہ بڑے ادب سے چاندی کی طشتری میں چاندی کا گلاس رکھ کر لایا...... جھک کر پانی پیش کیا تو انہیں ایسا لگا کہ وہ صندل کی خوشبو میں ڈوبے جا رہے ہیں۔ گلاس اٹھاتے اٹھاتے انہوں نے مڑ کر بیگم کو دیکھا۔ جو ریشمی گدگدے بستر میں اپنے بالوں کا سیاہ آبشار پھیلائے کھلی جا رہی تھیں...... ایک فاتح مسکراہٹ ان کے چہرے پر تھی۔

وہ انہیں سنانے کو رحمت کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے بولے۔ ”کل تیرے کو گاؤں جانے کا ہے، وہاں پو ایک منشی کی ضرورت ہے بول کے“

رحمت نے سر جھکا کر کہا ”جو حکم سرکار“......

نواب صاحب نے پاشا دولہن کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ایک فاتح کی مسکراہٹ۔

دو گھنٹے بعد پاشا دولہن اپنی شان دار حویلی کے بے پناہ شان دار باورچی خانے میں کھڑی ماما کو ہدایت دے رہی تھیں۔

”دیکھو ماما بی، انے یہ اپنی زبیدہ کا چھوکرا ہے نا شرفو اس کو ذرا اچھا کھانا دیا کرنا آج سے یہ میرے پاواں دبایا کریں گا مالش کرنے کو ذرا ہاتھا پاواں میں دم ہونے کو ہونا......؟

”برو بر بولتے بی پاشا آپ۔“ ماما بی نے اصلی گھی ٹپکتا انڈوں کا حلوا شرفو کے سامنے رکھتے ہوئے پاشا دولہن کے حکم کی تعمیل کی اسی گھڑی سے شروع کر دی۔

سمندر عورت

مینا ابھی ابھی بستر پہ سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بدن کی گرمی سے بستر گویا جھلس رہا تھا۔ سر کے دباؤ سے تکیہ کے بیچ میں ایک گول سا نشان پڑ گیا تھا۔ چوٹی جو پیٹھ کے نیچے دب گئی تھی اس نے چادر پر اپنا بل کھایا ہوا نقش چھوڑ دیا تھا۔ اور پورا بستر بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

بشیر میاں جوتے اتار کر بستر پر بیٹھنے لگے تو ایک دم انہیں مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ بستر پر بیٹھے تو اسے بڑا نرم نرم گرم گرم سا پایا جیسے فاختہ کے پر۔

”سوں“ کر کے انہوں نے زور سے سانس لی۔ اور ناک سے سوتی ہوئی خوشبو ان کے دل تک اتر گئی۔ اکدم وہ بوکھلا سے گئے۔ یہ کیفیت تو ان پر کبھی نہ گذری تھی۔ ایسا لگا گویا فاختہ کے گدگدے اور تپتے ہوئے پروں میں دھنس گئے ہوں۔ وہ بستر سے اٹھ گئے۔ منّی اور ارشد کمرے کے باہر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بڑی سہمی ہوئی آواز سے پکارا۔

”اے منّی۔ اے ارشد۔ ذرا ادھر تو آؤ۔“

منّی بھاگتی ہوئی آئی اور آنکھوں پر سے بال ہٹاتی ہوئی بولی۔

”ہمیں بلا ابا میاں___؟“

بیٹی تم میرے بستر پر سوئی تھیں۔؟“ انہوں نے حد درجہ رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں جی۔ ہم تو جب سے باہر کھیل رہے ہیں۔“

”اچھا تو شاید ارشد سویا ہوگا۔“ اور انہوں نے ارشد کو پکارا۔ ”واہ جی۔ ہم تو ایکساں منّی کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ہم نے تھوڑے ہی دھرے ہیں گندے پیر آپ کے بستر پر ہاں آپا ابھی ابھی سو کے اٹھی ہیں۔؟“

بشیر میاں سن ہو گئے۔! بستر پر مچلتی ہوئی خوشبو نے انہیں آپ ہی بتا دیا تھا۔“ میں مینا کے پاس

سے آئی ہوں۔"

انہیں یاد آیا ممانی بھی اسد مینا کے لئے چکی میں خوشبو دار مصالحے پسوایا کرتی تھیں۔ اور مینا ہمیشہ سے صابن کی بجائے مصالحوں سے نہاتی ہے۔ تبھی تو اس کے بال اتنے لمبے لمبے ہیں اور چلتے میں اس کے پاس سے نئی نویلی دلہنوں کی سی خوشبو آتی ہے۔

گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر بڑی باریک سی ملائم سی، میٹھی آواز آئی۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

آج بشیر میاں کو یہ آواز بالکل نئی لگی۔ لہجہ بالکل نیا لگا اور وہیں بیٹھے بیٹھے الجھتے رہے۔ "اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔" ممانی بھی مینا کو کئی بار ٹوک چکی تھیں کہ "اے بیٹا اپنے سے بڑوں کو رشتہ لگایا کرتے ہیں۔" مگر جہاں جہاں بھی رشتہ لگانے کا موقع آیا مینا کی زبان ہکلا گئی۔

بشیر میاں ممانی بی کے سگوں میں سے ہوتے تھے۔ ایسا بہت دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔ شادی ہو تو دوہرا رشتہ ہو گیا۔ بھانجے لگتے تھے۔ اور ممانی بی، ممانی بی کہتے منہ سکھاتے تھے۔ ممانی بی کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کوئی کار ہو کوئی کاج ہر کام میں بشیر میاں کی رائے لی جا رہی ہے۔ بشیر میاں بلائے جا رہے ہیں۔

جہاں کوئی اچھی سی چیز پکی۔ رکابیوں میں لگا۔ سرپوش ڈھک جھٹ سے نصیبن بوا کے حوالے کشتی کہ جا جلدی سے بشیر میاں کے ہاں پہونچا آ۔

شبیر میاں بھی ممانی۔ سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ماں سے بھی اتنی نہ رہی ہو گی۔ اور جب سے تو ان کی جاگیر کا قصہ ختم ہوا تھا۔ یہ اپنا گاؤں چھوٹ کر یہیں آ بسے تھے۔ ممانی جی کے ہی بڑوس میں چھوٹا سا مکان تھا۔ وہیں رہتے شادی شدہ تھے۔ شریف خاندانی بیوی تھی۔ دو بچے مزے سے کٹ رہی تھی۔ اپنے کام کاج سے فرصت پائیں تو رفیعہ بیگم بھی گھڑی دو گھڑی کو ممانی بی کے پاس آ بیٹھتیں۔ مینا سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دل سے دل ملتے کیا دیر لگتی ہے؟ یہ تیس کے اندر تھیں اور مینا تو سولھویں سترھویں میں ہی تھی۔ پھر بھی دونوں ایسے گھلی ملی تھیں گویا ساتھ کی کھیلی سہیلیاں گھنٹوں سر جوڑے بیٹھی بائیں کرتی رہتیں۔

مینا کو شہر سے افسر کا پیام آیا۔ تو انہی کی کوششوں سے ہی "نہ" ہوئی تھی۔ اب لاکھ ممانی بی کہتی ہیں:

ممانی بی اچھا کماؤ لڑکا ہے۔ گن کا ڈھنگ کا۔ اب اور کیا دیکھیں گے" مگر رفیعہ بیگم کی ایک نہیں تو لاکھ نہیں۔ ممانی بی نے کہا بھی۔ "اے تم ایسی جنم جنم کی دشمن کا ہے سے ہو گئی ہو لڑکی کی۔ کہ منہ توڑ انکار کئے جاتی ہو۔ ہنس کے بولیں۔ "اے ممانی بی ہماری مرضی نہیں تو آپ کیوں مجبور کریں ہمیں۔"

اصل میں مینا کی مرضی نہ تھی۔ کیوں نہیں تھی؟ بس نہیں تھی۔ اڑتے اڑتے اتنا ضرور سنا تھا کہ صاحزادے ذرا رنگین مزاج ہیں ممانی بی اتنی روشن خیال بھی نہ تھیں کہ بیٹی کے منہ سے صاف "نہیں" سن سکتیں۔ اس لئے رفیعہ بیگم نے اپنی طرف سے توڑ جوڑ کر کے بات بنا دی۔ ممانی بی بھی کھٹک گئیں سوچا۔ اپنی طرف سے تو یہ زور ازوری سے کہہ نہیں سکتی۔ ہو گی دونوں کی ملی بھگت خاموش رہ گئیں۔

ویسے سچ بات تو یہ تھی کہ ممانی بی اتنی لکیر کی فقیر بھی نہ تھیں انہوں نے تو آپ ہی بہت سی دیواریں گرا دی تھیں۔ "عصمت" تو خیر بہت زمانے سے آتا تھا۔ اب تو رسالوں کی ڈور بندھ گئی تھی۔ جہاں کسی نئے پرچے کا نام سنا۔ اور مینا نے چندہ بھیجا۔ اتنا یقین تو انہیں بیٹی پر ضرور تھا کہ اوندھی سیدھی کتابیں تو خیر مینا نے نہیں پڑھیں۔ مگر یہ انہونی ضرور کر دکھائی کہ لکیے ایک مضمون لکھ ڈالا۔ اب نصیب ہی اوندھے ہوں تو کوئی کیا کرتے۔ وہ چھپ بھی گیا۔ سارے خانوادے میں وہ لے دے ہوئی کہ ممانی بی سے تو منہ چھپانا بھی نہ بن پڑ سکا۔ پانی ایک ہی بار زور توڑ کے راہ بنا لے تو پھر تو سبھی جگہ سے بہتا چلا جاتا ہے۔ پلہ بات تھی۔ سبھوں میں دھوم سی ہو گئی۔ مگر اب عدمیں تو یہ عالم ہو گیا کہ مینا نے باقاعدہ انگریزی بھی پڑج ڈالی۔ بہشتی زیوار اور دینی مسائل تو پڑھے ہی پڑھے تھے۔ الٹے سیدھے ناول کہانیاں بھی پڑھنی شروع کر دیں۔ سب سے پہلے جو کتاب گھر میں آئی۔ "دولت پر قربانیاں" تھی۔ پھر تو گویا کھلی چھٹی ہی مل گئی۔

مگر اب الٹے سیدھے ناول پڑھنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ سرے سے ناک ہی کاٹ ڈالی ماں باپ کی۔ مگر ہاں اپنا مستقبل ضرور بنا لیا۔ ساتھ ہی ساتھ پرانی باتوں کا توڑ بھی اسی نے توڑا۔ چارکلی کے کھڑے پائینچوں کے پاجاموں، اور بند گلے کی کرتیوں کی بجائے وہ ساٹی پہنتی تھی۔ کانوں میں ممانی بی کے جہیز کی بالیاں تو اس نے سرے سے پہنیں ہی نہیں۔ جگمگ جگمگ کرتے ٹاپس پہنتی تھی جھکا جھول، چندن ہار اور چوسری کی بجائے گلے میں ہلکا پھلکا کوئی نکلس ڈال لیتی۔ اور یہ بھی روز روز نہیں۔ کسی کے ہاں آنا جانا ہوا تو ماں کے اصرار پر پہن لیا۔ نہیں تو وہی اپنے

بھونڈے ہاتھ۔ بھونڈا اگلا۔ آنے جانے والیاں ٹوکتیں بھی۔

''اے کنواری اور سہاگن سے ہی گھر کی رونق ہے۔ یہ ٹھونٹھے ہاتھوں کی کیا چال اٹھائی ہے بی۔'' یہ مسکرا کر رہ جاتی۔ خاندان والے تو علی الاعلان کہتے کہ ''اے بی بڑی بیگم نے تو لونڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔''

گھپ اندھیرے میں زوردار اجالا گھبس پڑے تو آنکھیں پہلے تو مچ مچ کرنے لگتی ہہیں۔ پھر اسی چھکا چھک اجالے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ ممانی بی کو تو احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ کہ واقعی ان کی بیٹی اور خاندان والیوں سے اتم ہے۔

ممانی بی کے میکے میں، اور اب یہاں سسرال میں بھی اتنا سخت پردہ تھا کہ مردوں کی تصویر تک دیکھنا گویا پردہ توڑ دینے کے برابر تھا۔ مینا کو بھی حسب قاعدہ سب سے پردہ کرایا جاتا۔ مگر اس نے جو ادھر ہاتھ پاؤں اچھالے تو سبھی جڑیں کاٹ پھینکیں۔

رفیعہ بیگم کا زچہ خانہ ہونے والا تھا۔ دردوں سے بے حال پڑی تھیں۔ ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر کا تو کدھر گزر رہوتا محلے کی دائی کو بلایا گیا۔ وہ بھی آخر کو اناڑی نکلی۔ کچھ سمجھ پڑا۔ کچھ نہ پڑا۔ اس نے آڑھے ٹیڑھے ہاتھوں سے کچی زچہ کو ایسے جھونٹے دیئے کہ الٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑی تجربہ کار بوڑھیاں بھی ہاتھ مل کر رہ گئیں۔ ممانی بھی کو کچھ نہ سوجھا۔ مینا انے گھر ہی پر تھی۔ کنواری بالی چھوکریوں کا ایسے معقوں پر کام بھی کیا۔ مگر شبیر میاں کو تو معلوم تھا کہ بیٹا کافی لکھ پڑ گئی ہیں۔ جھنّو خالہ کا بیٹا حوض میں گر پڑا تھا۔ تو انہوں نے اوندھا لٹا کے سارا پانی نکلوایا تھا۔ مہنو مالی کو سانپ نے کاٹا تو یہ اثر زائل ہونے تک نیم کی پتیاں بار بار چبواتی رہیں۔ ممکن ہے رفیعہ بیگم کو بھی کوئی دوا لگ جائے۔ اسے مان لیا کہ ڈاکٹر نہیں تھیں پھر بھی تھوڑی بہت دوا دارو دینی تو آتی ہی تھی؟

دوڑے دوڑے آئے۔ وہیں پردے کے پاس کھڑے کھڑے نصیبن بوا سے کہلوایا۔

''چھوٹی بی بی سے کہیو۔ بیوی کی طبعیت اچھی نہیں۔'' سا ای.......... بات پوری ہونے سے پہلے نصیبن بوا چیخ اٹھی۔ اے میاں تمہاری عقل سلامت ہے۔ بالی چھوکری سے..............

بات پوری ہونے سے پہلے ہی مینا خود دروازے تک پہنچ گئی اور وہیں سے بولی۔ ''میری اپنی ذاتی رائے تو یہ ہے کہ آپ فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیجیے۔ اور ایک ڈاکٹرنی کا پتہ بھی بتا دیا۔

شبیر میاں الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ جانے کیا بات یاد آئی تو پھر لوٹ کر آنے۔ آواز دی اور کہا۔

''میں یہ تو بھول ہی گیا تھا۔ کہ وہ فیس کیا لے گی؟ ابھی یہ بات منہ میں ہی تھی۔ کہ پھر بولے۔ ''اور فیس کا کیا ہے۔ جان سے بڑھکر تو پیسہ ہوتا نہیں۔ اللہ جانے وہ آتی ہے یا نہیں۔ پھر میں کیا کرونگا۔''

اور ان کی آواز بھرا گئی۔ لاکھ آدمی ضبط کرے۔ مگر بیوی کا ساتھ کچھ ایسا کچا بندھن تو ہوتا نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بی بی ان کا کہنا ذرا کم ہی مانتیں۔ اور بات پیچھے منہ کو منہ دیئے چلی جاتیں۔ کہنے والے کہتے ہی ہیں۔ کہ یہی منہ چار سے اٹھاتا ہے۔ اور یہی منہ چار میں بٹھاتا ہے مگر اب یہ بات بھی نہ تھی۔ کہ اتنی اتنی سی باتوں کو لے کر وہ کھڑے کھڑے کہہ دیتے۔ کہ جاؤ بی بی میں نے تین بار تمہیں طلاق دی۔ میاں بی بی زندگی بچوں کا کھیل تو ہوتی نہیں کہ جب دل بھر گیا۔ ایک نے سب کو مخاطب کر کے کہدیا۔ ''کھیل ختم پیسہ ہضم۔'' ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ بغیر دھوئیں کے لکڑی جلے

مینا کو بھی خیال آ گیا کہ اللہ جانے وہ انکار ہی کر دے پھر کیا ہوگا؟ لپک کر باہر ہی تو نکل آئی اور بولی۔

چلیئے دونوں مل کر اسے بلا لائیں۔ اور اسی جھپاکے میں وہ شبیر میاں کے ساتھ ہو گئی۔

شبیر میاں کی بی بی کی زچگی بھی ہو گئی۔ چلّہ بھی نہا لیا۔ بات پرانی بڑ گئی، گر خاندان والوں نے کیا کیا بہتان نہیں باندھے؟ لیکن مینا نے ذرا شکن نہ چڑھائی۔ ممانی بی نے البتہ دو چار دن بیٹا سے بول چال ضرور بند رکھی مگر پیٹ کی اولاد سے کوئی منہ پھیرے بھی تو کب تک؟ اب تو شبیر میاں کا آنا جانا بھی شروع تھا اور مینا بھی سامنے آتی تھی۔ سلام کرنے کو ہاتھ تو اٹھاتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ بس چاندی کا پنجہ، چاند ایسے ماتھے سے چھو جاتا۔ ممانی بی ہنس کر پیار سے ڈانٹتی بھی۔ پڑھ لکھ کر بالکل ہی چلن بدل دیا یہ بھی کوئی سلام ہوا؟'' مینا ہنس پڑتی۔

رفیعہ بیگم کی زچگی بڑی مشکلوں سے ہوا کرتی۔ پہلا بچہ تو جیسا ہوا۔ ہوا۔ دوسرا اپنے وقت کا قیصر تھا۔ ڈاکٹرنی صاف کہہ گئی تھی۔ کہ اب کے بچہ ہوا تو جان کو خطرہ ہے۔ مگر ڈھائی دو برس پیچھے پھر رفیعہ بیگم امید سے رہیں اور اب کے جو زچگی کا وقت آیا تو بچہ بھی ضائع ہوا اور ماں بھی۔ شبیر میاں بھری پری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

چہلم پر ممانی بی نے بہت آنسو بہائے۔ دل تو شبیر میاں کے لئے بہت ہڑک رہا تھا۔ مگر کرتی بھی کیا۔ بیچاری۔ جوان بیٹی کا ساتھ تھا۔ اور ہر ایک کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہے۔ دنیا دکھاوے کو

منہ سے کہا بھی کہ "میاں اب تو دیکھ بھال والا کوئی نہیں۔ ہمارے ہاں اٹھ آؤ نا۔" مگر شبیز میاں بھی ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ سر ہلا کر انکار کر دیا۔

مینا کو ان پر بڑا ترس آتا۔ بیچارے اول ہی تو اللہ کی گائے تھے۔ اب تو بالکل ہی موم ہو کر رہ گئے تھے۔ دونوں بچیا لگ ڈھائیں ڈھائیں پھرتے۔ مینا ہاتھ پکڑ کر منہ ہاتھ دھلا دیتی۔ ناشتے کے وقت آتے تو ساتھ بٹھا لیتی۔

ایک دن شبیر میاں بھی آئے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ ممانی بی نے ہیر پھیر سے ذکر چھیڑا۔ "اے میاں لوگ تو کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ لگتی بڑے زور سے ہے مگر ذرا دیر میں درد غائب۔ تم کب تکیوں ہی رہو گے۔ ماشاء اللہ خود بھی جان جوان ہو۔ ننھے ننھے بچے ہیں کوئی تو ہو دیکھ بھال کرنیوالا؟"

شبیر میاں بولے۔ "ممانی بی رنج و غم کی بات تو جانے دیجئے میں سوچتا ہوں آنے والی بچوں سے سگی ماں کا سا برتاؤ نہیں کر سکے گی اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکونگا۔" انکی آواز بھیگ سی گئی پھر ٹھہر کر بولے" کیا گھر کا گھر داہو گیا۔ ممانی بی۔ اب تو دھول اڑتی ہے ہر طرف، باہر سے آؤں تو کوئی منہ دھلانے والا بھی نہیں۔ پانی وانی کی ضرورت پڑے تو اٹھ کر خود لوں تو لوں۔ ورنہ کوئی اس کا بھی روادار نہیں کہ پیاس ہی بجھا دے۔ بچے الگ تباہ حال۔"

مینا کا دل اندر سے پگھل اٹھا۔ بولی۔

"آیئے ہمارے ہاں آ جایئے نا۔ یہاں اماں بھی ہیں۔ بچوں کا جی بھی بہل جائے گا۔"

"میں آ تو جاؤں۔ مگر شبیر میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔

ممانی بھی بات کا رخ دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔ مینا پھر بولی "خاندان والوں سے ہی ڈر رہے ہیں نا آپ؟ اپنے کام سے کام رکھیئے کتوں کا کام بھونکنا ہے۔ بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر یوں ہی ہاں ہاں ہوئی تہی پھر ممانی بی نے بھی زور دیا تو شبیر میاں اسی دن اٹھ آئے۔ مینا کا وقت اب بڑا اچھا کٹ جاتا۔ تمام دن بچوں میں الجھی رہتی۔ بچے بھی ہل مل گئے تھے۔ اپنی ماں کو بھول کر بھی یا نہ کرتے۔ کبھی کبھار ایسے ہی مینا کے جسم پر کوئی خوبصورت سا کپڑا یا زیور دیکھ لیتے تو کہتے۔

"امی جی بھی ایسا ہی کرتا پہنتی تھیں۔"

"ہماری امی کے پاس بھی ایسا ہی ہار تھا۔"

شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور۔ مگر یوں جیسے رہتے ہی نہ ہوں۔ نہ چٹ نہ پٹ، کبھی اونچی آواز سے بولتے۔ نہ قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ممانی بی جس ڈر سے انہیں اپنے گھر بلانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ ایسے بھولے بھائی تھے کہ بھول سے بھی مینا کو آنکھ بھر کر نہ دیکھتے۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں ممانی بی بولی تھیں۔ بچپن میں میری بیٹی مینا کی طرح چہکتی تھی بس میں نے یہی نام ڈال دیا۔" اس پر شبیر میاں نے آنکھیں اٹھا کر ضرور اسے دیکھا اور بڑی سادگی سے بولے

"واقعی اچھا نام دیا آپ نے۔ مینا بڑی پیاری ہنسی ہنستی ہیں۔"

مینا کے چم چم چمکتے دانت گلابی گلابی ہونٹوں میں چھپ گئے اتنی سادگی سے جو اتنا بڑا سچ کہدے تو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ شبیر میاں کے لہجے میں کوئی گہرائی نہ تھی۔

بڑے نانا کہتے تھے کتوں کا رونا بڑا انحس ہوتا ہے۔ کتے کے رونے کی آواز آئے تو صدقہ دلوا دینا چاہیئے۔ اس رات رہ رہ کے کتے بھونکتے رہے۔ اور صبح ہی صبح نصیبن بوا نے تازہ تازہ دودھ ابال لینے کے کئے چولھے پر چڑھایا تو وہ آپ ہی آپ پھٹ گیا۔ نصیبن بوا زمانہ دیکھے ہوئے تھیں۔ منہ سے تو کچھ نہ بولیں مگر مولا کی دہائی مانگنے لگیں۔ چار دن کی بیماری میں ممانی بی چٹ پٹ ہو گئیں اور مینا، مینا سے الو بن گئی۔ اندھیاروں میں چھپتی روتی پھرتی۔ بستر پر اوندھے منہ پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہتی۔ بیسیوں ہی تو پیام اچھے برے آئے ہونگے۔ مگر ماں کو پسند نہ آئے۔ اور جو ماں کو پسند آیا بیٹی کو ناپسند ہوا۔ بٹی کے بیاہ کا ارمان جی کے جی میں ہی لے گئیں۔ اب تو خاندان والوں کو موقع ہی مل گیا۔ جہاں دیکھو وہاں مینا اور شبیر میاں موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اوندھی سیدھی، جھوٹی سچی ہزاروں ہی باتیں اڑائی گئیں اور مینا ہول ہول جاتی باپ کا سایہ تو مدت ہوئی اٹھ چکا تھا ماں چھاؤں بن کر سہارے بیٹھی تھیں وہ بھی چل دیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی مگر روپے پیسے ہی سے تو سب کام نہیں چلتے۔

بولنے والے بھی کہاں تک بولتے تھک ہار کر خود ہی چپ رہ گئے۔ شبیر میاں اب بھی مینا کے ہاں ہی رہتے۔ باہر سے آتے سیدھے اپنے کمرے میں پہونچ جاتے۔ گرمی کے دن ہوتے تو دالان میں نظر آتے مونڈھا بچھا ہوا۔ اخبار منہ سے لگا ہوا۔ سردیوں اور بارشوں میں تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ ان کے آتے ہیں گول پیچیدار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ابھرتی اور پھر نرم نرم سی میٹھی آواز:

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

شبیر میاں اور مینا اسی زندگی کے عادی ہو گئے۔ نہ ان کے دل میں ان کے لئے کوئی جگہ بنی نہ

انہوں نے انکو اپنے دل پر چڑھایا۔

ایک دن ارشد اپنی آنکھیں کھجلاتا ہوا آیا۔ اور منمنا کر بولا۔

’’ہماری آنکھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو امی کاجل لگا دیتی تھیں۔‘‘

’’ارے رے۔ مینا نے اسے پیار سے گود میں اٹھالیا۔‘‘ تو بھی مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں نہ بنا دیتی اپنے راجہ گڈے کے لئے کاجل۔‘‘

مینا نے سکوری بھر کے ارنڈ کا تیل شیشی سے انڈیلا۔ روئی کو بل دیکر بتی بنائی اور کونے میں چراغ سا بنا کر اوپر سے مٹی کا ایک پیالہ اوندھا دیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد یہ اتا بڑا کاجل جم گیا۔ مینا نے ڈبیہ میں کاجل پکڑا اور منے کو گود میں بٹھا کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھیرنی چاہی۔

’’آں ہاں۔ امی کہتی تھیں آنکھوں میں لوہا نہیں پھیرنا چاہیئے۔‘‘

مینا ہنس پڑی ’’اچھا تو انگلی سے لگا دیں؟‘‘

’’ہاں‘‘ ارشد نے سر ہلا دیا۔

مینا نے ارشد کی دونوں آنکھوں میں انگلی پھیری۔ تھوڑا کاجل پھر بھی انگلی پر لگا رہ گیا۔ وہ اس نے اپنی آنکھوں میں بھرلیا۔ اور جان بھی گئی کہ کاجل لگا تھا۔

شام کو شبیر میاں آئے۔ گول پیچدار زینے پر مانوس قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر میٹھے لہجے میں آواز آئی۔

’’خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔‘‘

دسترخوان پر بیٹھے تھے کہ ارشد مینا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے آیا۔

ابا میاں۔ آپا نے ہماری آنکھوں کاجل لگا دیا ہے۔ دیکھا آپ نے۔‘‘

ہاں ہاں بڑی اچھی ہیں تمہاری آپا۔‘‘ اور وہ اسی انہماک سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دالان میں نکل کر مونڈھے پر بیٹھے تھے کہ مینا آئی۔ اخبار دیتے ہوئے بولی۔

’’ذرا پڑھنے کے لئے لے گئی تھی۔ معاف کیجئے بغیر پوچھے ہی اٹھالیا۔‘‘ شبیر میاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی معذرت پر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر اکدم رک کر سادگی سے بولے۔

ارے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا مینا تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔‘‘ اور اخبار لے کر پڑھنے میں یوں منہمک ہوگئے۔ گویا کسی لڑکی کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو۔ موسم کی تعریف کی ہو۔ واہ بھئی کیا اچھا موسم ہے!‘‘

مینا بوکھلا کر الٹے پاؤں بھاگی تو اس کا پیر ساڑی سے الجھ گیا اور وہ گر پڑی۔ شبیر میاں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ نرم نرم گرم گرم پروں والی فاختہ گویا ہاتھوں میں آگئی۔ سادگی سے بولے۔

’’ذرا سنبھل کے نہیں چلتیں ابھی ہڈی چورا ہوگئی ہوتی۔‘‘ اور اٹھاتے میں مینا کا سر ان کی ناک سے اتنی قریب ہوگیا کہ بھینی بھینی سی خوشبو سے ان کا پورا وجود مہک گیا۔

شبیر میاں نے اس دن اخبار پڑھا ضرور لیکن اگر کوئی پوچھتا سناؤ میں آج کی خاص خبر کیا ہے۔ تو ہو وہ سٹ پٹا کر رہ جاتے۔

مینا تین دن سے کھانسی نزلے میں پڑی گھل رہی تھی۔ شبیر میاں کو تین دن سے وہ مانوس کھٹ کھٹ سنائی نہ دی تھی۔ انہوں نے چاہا خبر لینے کو جائیں مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ جانے کا رادہ کرتے تو لگتا کہ نرم گرم پروں کے ڈھیر میں دھنسے جا رہے ہیں گھبرا کر وہ باہر نکل آتے۔

’’اونہہ زکام بھی کوئی بیماری ہوئی بھلا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائیگی۔‘‘

ایک دفعہ وہ بخار میں بھن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے تو مینا نے انہیں مشورہ دیا تھا۔

’’آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے نا؟

اب انہیں خیال آیا۔ یہ مینا شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے نا؟

’’پھر انہیں مینا اور ممانی بی کے احسان یاد آگئے۔ انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا۔ کہ مینا کے لائق کوئی بر ڈھونڈ نکالیں گے۔ مینا جو اتنی پیاری۔ اتنی خوبصورت۔ اتنی سگھڑ اتی تعلیم یافتہ ہے اس لئے جوڑ کو جوڑ تو ملے۔ مینا کا دل کتنا نرم تھا۔ کئی بار وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ چکے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے کرتے وہ رفیعہ بیگم کی یاد میں آنسو بہانا شروع کر دیتی بچوں سے تو اب وہ اتنی ہل مل گئی تھی کہ رفیعہ بیگم کی کمی بھلا دی۔ بچے اب صاف ستھرے رہتے۔ روتے بسورتے نہ تھے اور صورت پر بہار آگئی تھی۔

’’لاحول ولا۔‘‘ شبیر میاں نے سوچا۔ ’’میں بھی کتنا کور اخلاق ہوں وہ تو مجھ سے، میرے بچوں سے اتنی ہمدردی کرے اور میں اس کی خبر تک نہ لوں؟ اخبار مونڈھے پر رکھ کر وہ اٹھے اور مینا کے کمرے کی طرف چلے۔

مینا نے سردی کے مارے سوئیٹر چڑھا لیا تھا۔ اب جو گرمی ہوئی تو اسے اتار پھینکنا چاہا۔ سوئیٹر کھلے گلے کا نہ تھا۔ گردن میں سے اتارنا چڑھانا پڑتا تھا۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے، ساڑی کا آنچل دونوں گھٹنوں میں دبا کر، وہ پیٹھ کے بل جھکے جھکے، زور لگا کر سوئیٹر اتار رہی تھی۔

شبیر میاں ، روایتی کانچ کی جوتی اور بالوں کی سنہری لٹ دیکھ کر اندھا دھند عاشق ہوجا نیوالے شہزادوں میں سے تو تھے نہیں۔ مگر یہاں ایک دم جگمگاتی صبح دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ڈھیر سارے نرم گرم پروں میں ان کو اپنا وجود ڈوبتا محسوس ہوا اور وہ ہڑ بڑا کر لوٹ گئے۔

مینا نے قدموں کی چاپ سن کر بمشکل سوئیٹر کھینچ کر پھینکا اور دیکھا تو شبیر میاں سر نیہوڑائے جلدی جلد چلے جا رہے تھے؟

تین دن سے تو بخار ہی تھا۔ تین دن مینا نے یونہی کمرے میں کاٹ دیئے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ باہر نکلے۔ ساتویں دن اپنے کمرے سے باہر آئی۔ تو سہی مگر شبیر میاں سے یوں لجائی لجائی جیسے نئی نویلی دلہن سسرال دکھاوے کو دولھا سے شرمائے۔ اور موقع ملنے پر رہ رہ کے کن انکھیوں سے دولھا کو دیکھتی جائے۔

شبیر میاں چپ چپ سے تھے۔ آگے بھی انہیں یہ خوشبو اپنے تکئے پہ، بستر پہ مل چکی تھی۔ جو اپنے منہ سے کہتی تھی۔ ”میں مینا کے پاس سے آئی ہوں۔“

اب مینا اتنی گئی گزری بھی نہ تھی کہ کسی کے بستر پر لوٹیں لگاتی پھرے۔ منی اور ارشد سونے کے لئے کمرے میں جاتے تو اسے بھی گھسیٹ لیتے۔ آپا ہمیں ڈر لگتا ہے نا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے۔“

تب تک کہ یہ سوئیں سوئیں۔ یہ بیٹھی کتابیں ٹٹولتی رہتی۔ کبھی کبھا پیٹھ سیدھی کرنے کو شبیر میاں کے بستر پر لڑھک جاتی۔ انہیں کا پلنگ اس وقت خالی ہوتا تھا۔

بدلی چھائی۔ برس گئی۔ آسمان پھر نیلا نیلا دھلا دھلا تھا۔ ان کی واپسی۔ وہی بچوں کی شرارت، وہی مینا کی کھنکتی ہوئی ہنسی اور گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ کے بعد نرم ملائم گھلی گھلی سی آواز..........“

”اے خانساماں کھانا لگادو میاں آگئے!“

جاتے جاتے ایک دن شبیر میاں کہہ گئے ”مینا ان کپڑوں کو ذرا دھوپ دکھا دینا۔ کیڑا نہ لگ جائے۔“

اس دن تو مینا سے نہ ہوسکا۔ دوسرے دن صبح ابھی شبیر میاں گھر پر ہی تھے تو سارا سامان لے کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کے صندوق میں زیورات کی صندوقچی بھی نکلی۔ بچے بھی آدھمکے۔ صندوق کھول کے یوں ہی مینا بیٹھ گئی۔ سامان الٹ پلٹ کرنے لگی۔ صندوقچی بھری پڑی تھی۔ زیور سے لے کر افشاں تک۔ بس جوں کی توں۔ بچے پاس بیٹھے اوندھی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بھی سوال

انہوں نے اپنی ماں سے متعلق نہ کیا۔

مینا خود ہی بول پڑی۔

”امی کی یاد آئی ہے منے؟“ ارشد اور منی ایک زبان ہو کر بولے۔“ اونہوں آپ جو اتنی اچھی ہیں۔“

”مگر میں امی کی برابری کہاں کرسکتی ہوں۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”اوں۔“ ارشد بولا۔ ہم تو آپ کو اپنی امی سمجھتے ہیں!“ مینا کا منہ لال ہوگیا۔ ہونٹ کانپ اٹھے۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے گیلے ہوگئے۔ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولی۔ سچ؟“ ہاں اور کیا۔؟“ ارشد بولا۔

مینا نے صندوقچی کا نچلا خانہ ٹٹولا۔ کالی پوٹ کا لچھا پڑا چمک رہا تھا۔ اس نے لچھا اٹھا کر مٹھی میں دبالیا اور گھڑی کی طرف دیکھا دس بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ روز اسی وقت شبیر میاں گھر سے باہر جاتے تھے۔

وہ تیزی سے لپکی زینے کے پاس تھوڑی دیر رکی۔

اور پھر دوڑتی ہوئی دروازے میں رک گئی۔ ”سنئے“ وہ ٹھٹھک گئی۔

شبیر میاں بھی رک گئے اور ایک دم چونک گئے۔ دھانی ساڑھی میں اس کا ہلکا پھلکا جسم کانپا جارہا تھا۔ ساڑی کے آنچل کا ایک کونہ پتلے پتلے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ پلکیں لرز رہی تھیں۔ اور گوری گوری گردن میں سانسوں کے زیر و بم کیساتھ ساتھ کالی پوت کا لچھا کانپ رہا تھا۔

وہ اٹک اٹک کر بولی۔

سنگھار دان میں اور تو سب چیزیں ہیں مگر مسی نہیں ہے“ اور وہ منہ پلو میں چھپا کر شرما کر بھاگ گئی۔ شبیر میاں کے آس پاس نرم نرم فاختی پروں کا ڈھیر سا لگ گیا اور وہ ڈوبتے ہی چلے گئے۔ شام کو جب وہ ہاتھ میں مسی کی دوہری پوڑی سنبھالے گھر میں داخل ہوئے تو گول پیچدار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ اور ہوئی اور نرم ملائم سی۔ شکر میں گھلی ہوئی میٹھی آواز گونجی۔

”اے خانساماں کھانا لگادے۔ وہ آگئے ہیں۔“

شادی

’’بی بی پانی نہالیو میں حمام تیار کردی۔‘‘

صندل نے دبے پاؤں آ کر جہاں بانو کو اطلاع دی۔ مگر جہاں بانو اس وقت چھپر کھٹ پر اوندھی لیٹی مزے مزے میں ٹانگیں ہلا ہلا کر کوئی چٹ پٹا سا ناول پڑھ رہی تھی صندل کی بات جیسے اس کے کانوں میں پڑی ہی نہیں

جب صندل نے دوبارہ کہا...... ’’بی بی پانی ٹھنڈا ہو جائیں گا......‘‘ تو جہاں بانو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک ہاتھ سے کتاب دور پھینک دی دوسرے ہاتھ سے صندل کو اپنے بستر میں گھسیٹتی ہوئی بولی۔ ’’اللہ صندل تیرے کو نبی کا واسطہ میرے کو روز روز یہ مصیبت میں مت ڈالا کر۔‘‘

صندل دیدے پھاڑ کر بولی ’’بی بی پانی نہانا مصیبت ہے‘‘

صندل ہو کھلکھلائی...... ’’آج میرا نہانے کو بالکل نئیں چاہ را...... میرے بدلے تو ابٹن مل کو موگرے ملے پانی سے نہالیو۔‘‘

’’ہور نہا کو؟‘‘ صندل مسکرائی۔

’’نہا کو آج تو اپنی سیج سجالے۔‘‘

کمرہ جواب ہنسیوں سے بھر بھر گیا۔

’’نکو نکو...... میرے کو معاف کردیو‘‘ صندل ہنستی شرماتی ہوئی بولی...... ’’یہ نہانے دھونے آپ کو اچ مبارک۔‘‘

سارا سلسلہ یہ تھا کہ جہاں بانو جس کی شادی کو...... سال بھر سے بھی زیادہ ہو چکا تھا، جب بھی میکے آتی ’’مما جانی‘‘ اس کے وہی چاؤ چونچلے کرتیں، جو نئی دولہن بننے والی لڑکیوں کے ہوتے ہیں کرواتے ہیں۔ سر دھونے کے لئے مسالہ بھگویا جارہا ہے۔ شیکا کائی املی [illegible] جسم دھونے

کے لئے ابٹن چکے کی تیاری کا حکم صادر کیا جارہا ہے...... دامادوں کو خوش کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی نتو ہے کہ بیٹیوں کو خوشبوؤں میں مہکا کر، عطر پھلیل میں بسا کر پیش کیا جائے...... اس خدمت پر ہمیشہ صندل مامور کی جاتی کہ وہی بچپنے سے جہاں بانو کی دل لگ سہیلی تھی۔ جہان بانو سے اس کی خوب پٹتی تھی...... اور خود اسے بھی ان بی بی کا کام کرنے میں بہت مزہ آتا...... جہاں بانو تو اسے سسرال بھی ساتھ ہی لے جانا چاہتی تھی، مگر مما جانی نے سوچا کہ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے اپنے ہاتھوں بیٹی پر سوکن بٹھا دیوے جب بھی جہاں بانو آتی، وہی اس کی پیشوائی اور پیش خدمتی کو حاضر رہتی۔ دونوں مالکن اور نوکرانی کم، سہیلیاں زیادہ لگتیں...... اسی مارے نوکروں کی پلٹن جلن سے مرجاتی تھی۔

’’آگے صندل...... جانو کو نہلا دی کہ نئیں؟‘‘ پرلے صحن سے بڑی بیگم کی قریب آتی آواز سے ہولا کر صندل نے کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند کرلیا۔

’’ایو بی بی...... خدا کے واسطے جلدی سے گھس کو حمام کا دروازہ بند کرلیو جی نئیں تو بڑی پاشا میرے کو کتا ٹوچیں گے کی بولا ہوا کام بھی نئیں کرتی۔‘‘

’’اللہ یہ بھی کوئی زبردستی ہے جیکیا روز روز نہانا فرض ہے؟ جا بول دے میرے کو بخار ہے۔ میں نئیں نہاتی۔‘‘

’’وہ مار بھی میرے اوپراچ پڑیں گی نا...... بڑی پاشا بولیں گے نئیں کہ جب معلوم تھا کہ بچی کو بخار ہے تو مسالے ابٹنے کائے کو بھگائی۔ ہور میں تو ابٹن میں عطر بھی ملا کر رکھ دی ہوں۔ سب نخصان (نقصان) ہو گیا نا؟‘‘

کتے فضول باتاں کرری صندل تو۔ جب اتا ڈر ہے تو تو خود نہالے۔ میں بول دیوں گی میں نے نہالی، تیری بھی بات رہ جائیں گی...... میری بھی۔‘‘

اور جہاں بانو نے صندل کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور اٹیچڈ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔

تھوڑی دیر تک تو جہاں بانو ناول پڑھتی رہی، پھر چپکے سے اٹھ کر باہر والے میدان کی طرف چلی، جہاں اس کے میاں اور اس کے بھائی دونوں ہی بچوں میں بچہ بنے، گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔

[illegible] نے عطر ملے ابٹن [illegible] اپنے جسم کو [illegible] زعفران اور

ہلدی والے چسکے سے جلد کی رنگت سونا بن کر دمکنے لگی۔ سونا چاندی لنڈھاتے جسم پر آگے پیچھے بالوں کی لٹیں موتی برسانے لگیں...... اپنی خوشبوؤں سے آپ مست ہونے والی ہرنی کی طرح اس نے کھونٹی کی طرف اپنا سونے کا ہاتھ بڑھایا۔ ایک دم اس کو گھن سی آئی...... اتنے عطر مسالے چسکے سے نہا کو پھر وہی کے وہی کپڑے پہن لیوں؟ چھی! ''اصل میں جہاں بانو نے اسے ایسی جلدی میں غسل خانے میں دھکیلا تھا۔ کہ اسے واپس جا کر کپڑے لانے کی سدھ نہیں رہی تھی...... اب نہانے کے بعد خیال آیا تو کیا آیا۔ اس کی کوٹھری کافی دور تھی...... ''چلو یہ دوپٹہ اچ اوڑھ کو چلی چلوں ویسے بھی اس وقت زنان خانے میں آنے والا کون تھا......؟

ہاتھ کا رنگا گلابی ململ کا دوپٹہ تو اس نے ابھی ابھی اتارا تھا، سارے بدن پر لپیٹ لیا۔ گیلے بدن سے لگتے دوپٹہ یوں چپک گیا...... مانو کسی نے گوندھ سے مڑھ دیا ہو۔ گلابی ململ نے بدن سے لپٹ کر جیسے اسے شراب کی چھلچھلاتی بوتل بنا دیا۔ دروازے کے پاس جڑے ہوئے قد آدم آئینے میں اس نے اچٹی نظروں سے اپنے سراپے کا جائزہ لیا تو اسے چکر سا آ گیا۔

چکراتی، ڈولتی، اپنے آپ کو سنبھالتی جب وہ حمام سے نکل کر جہاں بانو کے کمرے میں آئی تو کلیجہ دھڑ سے اڑ کر جیسے حلق میں آ ٹکا......

اندر سے چٹخنی لگائے، دروازے سے پیٹھ ٹکائے یوسف کھڑے تھے۔ ہر چند کہ یوسف پاشا بے حد شریف قسم کے آقا تھے، نور بابو، جہاں بانو کے بڑے بھائی ہونے کے ناطے اس کے ساتھ بھی ہمیشہ بڑا مشفقانہ برتاؤ رکھتے تھے، کبھی کبھی جب نور بانو اور جہاں بانو کے لئے تحفے لاتے یا عیدوں پر چھوٹوں کو عیدی دیتے تو اس کے ہاتھ میں بھی عیدی تھما دیتے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے یہ کب کہا تھا کہ میں مرد نہیں ہوں۔

یوں آگ اگلتی جوانی سامنے دیکھ کر وہ بری طرح سٹپٹا گئے۔ ہڑبڑا کر بولے:

''میں گلی ڈنڈے میں ہار گیا تھا۔ داؤں دینا جان پر آیا تو یہاں آ کے چھپ گیا۔ میرے کو معلوم نہیں تھا'' ...... وہ الفاظ ڈھونڈتے رہ گئے۔

صندل کے دونوں ہاتھ یکبارگی اٹھے کہ کچھ چھپا لیں۔ لیکن چھپانے کی کوشش میں وہ تو مجسم دعوت بن گئی۔ ویسے بھی موئی ململ کی اوقات ہی کیا؟

یوسف میاں نے آج تک شراب نہیں چکھی تھی۔ بس کالج سے حویلی، حویلی سے کالج۔ بہت ہوا تو اپنے یار دوستوں میں بیٹھ کر، کمرے کا دروازہ بند کر کے ''بابا حضور'' کی نگاہوں سے بچ کر

تاش کے پتے کھیل لئے لیکن آج انہیں اچانک احساس ہوا کہ شراب کا ذائقہ زبان اور ہونٹوں سے نہیں آنکھوں سے بھی چکھا جاتا ہے...... آج سے پہلے بھی ایک بار صندل نے ایسے ہی گیلے بدن کی آنچ سے انہیں جلانے کی کوشش کی تھی۔ ...... ہوا یہ تھا کہ وہ بیچارے اپنے دھن میں ناک نیچی کئے سیدھے زنان خانے میں چلے گئے۔ وہاں چھوٹے کمرے میں صندل اپنی شلوار کے پائینچے گھٹنوں تک اوپر چڑھائے شیشے کی بنڈلیوں پر کسی بی بی کے ننھے بچے کو لٹائے پیرس سوپ سے نہلا رہی تھی۔ بچہ تو نہلایا ہی جا رہا تھا۔ خود صندل بھی بھیگ کر چڑیا بن گئی تھی۔ دوپٹہ اتار کر اسنے الگ پلنگڑی پر ڈال رکھا تھا۔ پائینچے تو تھے ہی گھٹنوں سے اوپر، جھک کر نہلانے میں کالے کرتے کی بٹن پٹی سے چاند سورج الگ جھلکے پڑ رہے تھے۔ کیا چھپا تھا اور کیا ڈھکا تھا۔ یہ تو وہی جانے جس نے تانک جھانک کی ہو۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح وہ وہاں ٹھہرے ہی کب تھے...... کئی دن تک پیرس سوپ کی جان لیوا خوشبو ان کے حواس پر چھائی رہی۔ پڑھتے بیٹھتے تو کتابیں پیرس سوپ بن جاتیں۔ لکھنے بیٹھتے تو قلم پیرس سوپ بن جاتا...... ساری دنیا کی خوشبوئیں جیسے ایک پیرس سوپ کی خوشبو پر نثار تھیں۔ بری مشکلوں سے کالج میں پڑھنے لکھنے میں جی لگا۔

لیکن آج؟

پیرس سوپ کی جان لیوا مہک مجسم ان کے سامنے کھڑی تھی۔ بال بال سے قطرہ قطرہ ٹپکتا خوشبودار پانی۔ چمکتے کانچ اور شیشے کو مات دینے والی کھلی پنڈلیاں۔ رگڑ رگڑ کر نہلایا ہوا گلابی دہکتا دمکتا جسم۔ ململ کے ایک حقیر سے گلابی دوپٹے نے کس کر سمیٹ رکھا تھا اور پھر انگاروں کی طرح دہکتے سرخ ہونٹ!

یہ اپنی جگی سہمی ہوئی...... وہ اپنی جگہ ہمت کرتے ہوئے پتہ نہیں کتنی دیر یوں ہی گزر گئے تپتے ہوئے جسم کی حدت سے ململ کا دوپٹہ یہاں وہاں سے سوکھنے لگا...... گلابیاں نکھرنے اور مزید پاگل کرنے پر کمر بستہ ہو گئیں...... سانولے رنگ میں کیا خاص بات ہے، بہتوں کا ہوتا ہے مگر، اس کم بخت سانولے پن میں جو دمک ہے، جیسے جسم میں کسی نے سونا پگھلا کر اندر بھر دیا ہو...... وہ دمک رہ رہ کر بے قابو ہو جانے پر ابھارتی ہے۔

یوسف میاں حواس ہوتے ہوئے بھی پاگلوں کی طرح جھپٹے۔ صندل کو دونوں ہاتھوں پر پھولوں کی طرح سنبھال کر چھپر کھٹ پر لا کر یوں رکھا، جیسے نو بیاہی دولہن ہو۔

''صندل مدھم اندھیرے والے کمرے میں ان کی ڈوبی، ڈوبی آواز۔ میں تمہارے ان بالوں

میں جن سے خطرہ خطرہ پانی ٹپک رہا ہے ایک ایک میں سچا موتی پر دویوں گا۔ میں تم پر سے خربان ہو جاؤں گا۔ صندل آج کے بعد کبھی تم کو الگ نیئں کروں گا۔ میں سچی بولتا ہوں صندل میں تم سے شادی کرلیوں گا......''

صندل کچھ نہ بولی۔ بولتی کیا؟۔ یہ وقت تو حویلی میں پلنے والی ہر۔ ''پالکڑی'' ہر نوکر لڑکی، ہر ملازمہ پر آتا ہی تھا۔ یوسف پاشا نہ ہوتے، کوئی اور ہوتا، بکریوں کے گلے میں سے کوئی نہ کوئی بکری کسی نہ کسی بھیڑیئے کا نوالہ بنتی ہی، لیکن اس کے کانوں میں جیسے رس سا ٹپک رہا تھا ''میں سچی بولتا ہوں صندل، میں تم سے شادی کرلیوں گا......'' (کم سے کم یہ الفاظ تو آج تک کسی اور خادمہ کے کانوں کا مقدر نہیں بنے تھے)

لمبے چوڑے چھپر کھٹ پر حیدر آبادی امنگوں کے جوڑے کا ایک گوٹ ٹوٹ ٹوٹ کر ٹکڑے ہو گیا۔ یوسف میاں نے ٹوٹے ہوئے گوٹ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا، مڑی تڑی صندل کی ٹھوڑی اٹھا کر بڑے پیار سے بولے:

''آج کے پیارے دن کی یادگار...... یہ ٹوٹی ہوئی چوڑی...... اس کو میں سدا اپنے دل کے پاس والے جیب میں رکھوں گا......''

انہوں نے پہلے تو ذرا سا دروازہ کھول کر جھری سی بنا کر دیکھا کہ کوئی ہے تو نہیں، جب میدان صاف پایا تو ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے۔ اور صندل کی زندگی سے نکل گئے۔

تھے تو یوسف میاں بھائی بہنوں میں سب سے بڑے، لیکن شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی بابا حضور نے بیٹیوں کا دونوں کا بیاہ کر دیا تھا...... لڑکیوں کو پڑھ لکھ کر کون سی نوکریاں کرنی تھیں۔ مگر لڑکوں کی تعلیم تو پوری ہونی ہی چاہئے۔ اسی لئے انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ جب تک یوسف پاشا بی اے نہ کرلیں، شادی کی بات سوچیں گے بھی نہیں۔ منگی ونگنی کے وہ قائل نہیں تھے۔ خواہ مخواہ اٹکا کے چھوڑ دینا انہیں سخت ناپسند تھا۔ لڑکے لڑکیوں کا کال نہیں پڑا تھا۔ بس انسان ارادہ کرلے، ایک چھوڑ ہزار موجود ہیں۔ بیٹیوں کے بھی انہوں نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کئے تھے۔ حالانکہ بڑی بیگم ہاں، ہاں کرتی ہی رہ گئی تھیں ختہ۔ ''اتی جلدی پیغام آیا بھی، جبول بھی کر لئے...... نہ دیکھے نہ بھالے...... مولا معلوم کیسے لوگاں ہئیں...... کیا ہئیں......'' مگر بابا حضور سنتے سب کی تھے، کرتے دل کی،

اور اب یوسف میاں کا بی اے کا نتیجہ آتے ہی انہوں نے ان کے لئے بھی رشتہ ڈھونڈنا [illegible] امت یار جنگ کی بیٹی ان کی بچپن کی دیکھی بھالی تھی)...... اللہ جانے اس گھ

کیا اللہ کی ماری تھی کہ ایک بھی شکل ڈھنگ نہ تھی۔ نوابوں کا گھرانہ تھا مگر صورتیں دیکھو تو چمارن کی۔ لیکن ان کی سب سے چھوٹی بہن زلیخا جیسے راستہ بھول کر اس گھر میں آنکلی تھی۔ **چاند سا ماتھا کمر تک لٹکتے ہوئے** چھوٹے ہی سہی، مگر خوب گھنے بال...... کنچوں کی طرح سبز آنکھیں...... **دودھ سے** دھلی رنگت...... اور قد و قامت اس قدر موزوں اور سبک کہ خدا ہی ایسی مورتی گھڑ سکتا تھا...... **الکلاس** اردو بس پڑھی لکھی تھی، اور پھر یہ کہ لاکھ بابا حضور حیدر آباد بھر میں اعتاد الدولہ شمار ہوتے تھے اور اشرفیوں پر چلتے تھے، مگر آتا ہوا پیسہ بھی کسی کو برا لگتا ہے؟ سنا گیا تھا کہ ایک ایک بیٹی کے نام سلامت یار جنگ نے دو دو لاکھ نقد، نقدی جمع کر دی ہے اور اوپر سے دامادوں کے گھوڑے جوڑے الگ۔ دان دہیز، زیور، کپڑا، لتا جدا، مما جانی کا سر نہیں پھرا تھا کہ وہ خواہ مخواہ بڑے نواب کی رائے رد کرتیں۔ جب سبھی کچھ برابر تھا تو بھلا شادی میں دیر کیوں ہوتی؟...... **حویلی میں** وہ آپا اتر رہی ہیں۔ یہ خالہ جا رہی ہیں...... رشتے ناطے کی ممانیاں، تائیاں، چچیاں بس جمع ہونے لگیں۔ بڑے تام جھام سے پیام لے جایا گیا...... سلامت یار جنگ جیسے سوچے ہی بیٹھے تھے کہ کب پیام آیا ہے اور قبول کرتے ہیں۔ ہاں کا جواب ملتے ہی شادی کی تیاریاں شباب پر آگئیں۔

اتنے سارے دنوں میں پھر کبھی یوسف پاشا جا کر زنان خانے میں جھانکے نہ صندل سے ان کی ملاقات ہی ہوئی اور سچ تو یہ ہے کہ کبھی ان کو خیال نہ آیا کہ کوئی ان کے ایک وعدے پر اپنی زندگی تک وار بیٹھا تھا...... وہ تو اس واقعہ کو اس طرح بھول گئے تھے جیسے کوئی بے حد شدید بھوک میں ڈٹ کر کھانا کھالے اور سیر ہو جائے...... اب مہینوں گزر جانے پر یہ کب یاد رہتا ہے کہ بھئی کب بھوک لگی تھی اور کیا کھایا تھا...... مرد تو وہی جو کھائے پیئے اور بھول جائے...... لیکن ادھر صندل...... جیسے ساری دنیا سے ٹکر لینے کو تیار بیٹھی تھی...... پیاموں کی اس کے لئے کمی کب تھی...... تھی تو وہ حویلی کی پالکڑی چھوکری، مگر اچھے اچھوں نے مما جانی کے پاس اس کے لئے پیغام بھجوائے تھے...... جوانی کو پیچھے ڈالو، وہ تو بندریا پر بھی آتی ہے تو اسے سندریا بنا دیتی ہے...... صندل کی تو تھی ہی قاتل جوانی...... مگر نوکرانی ہونے کے باوجود اس کا جور کھ رکھاؤ، جو سلیقہ اور جو دل جیت لینے والے انداز تھے، وہ اسے بیگموں میں بٹھانے کے قابل بناتے تھے...... بابا حضور کی بیٹیوں کے سلیقے، ماسٹروں اور استانیوں سے تھوڑا نہیت لکھنا پڑھنا سیکھا۔ وہ الگ پھر سدا جہاں بانو، نور بانو کی اترن پہنی، جو برائے نام ہی اترن ہوتی۔ ایک سے ایک عمدہ ریشمی جوڑے، غرارے، [illegible] فیشن [illegible] ٹوٹ کر سوار [illegible] تھا...... اور

ان سب کی حصہ دار صندل بھی بنتی۔ ایسے میں اس کا حسن اور بھی گمراہ کر دیتا۔ مما جانی کی ایک رشتے کی بہن نے تو اس کے لئے با قاعدہ پیام بھی بھجوا دیا تھا۔ ان کے بیٹے کسی عید پر سلام کرنے خالہ کے یہاں آئے تو سینی میں سوئیاں اور شیر خورمہ لئے، مغلی لباس پہنے جھوٹے موتیوں کے زیور بجی سجائی صندل ہی سامنے آئی۔ یہ تو ایسے ہوش بھول بیٹھے کہ پوچھئے نہیں۔ ماں کو ٹھیل ٹھیل کر پیام بھجوا کر ہی دم لیا۔ مگر مما جانی نے ایک مونہہ لاکھ بول سنا کر چھوڑے۔ بابا حضور ہنس ہنس کر کہتے رہتے۔

’’اجی بیگم صاحبہ غریبی کوئی عیب تو ہےئیں جو آپ ایک اچھے خاصے ہوتے رشتے کو توڑ دے رہئیں۔‘‘ لیکن ایسے موقعوں تو بابا حضور کی بھی ایک نہ چلتی۔

ان سب سے ہٹ کر بابا حضور کے خاص منشی جی کے بیٹے مراد کا تو یہ حال تھا کہ آتے جاتے صندل کے واری پھیرے جاتا۔ اس نے تو جیسے تہیہ ہی کر رکھا تھا کہ شادی کروں تو صندل سے، نئیں تو جان ہی دے دوں گا...... صندل اس کی محبت کو ہنس بول کر برداشت کرتی رہتی تھی۔ لیکن ادھر جب سے یوسف پاشا اسے کلی سے پھول بنا گئے تھے وہ انہیں گلے کا ہار بن کر جینے پر تل گئی تھی...... بے شمار دنوں میں بس ایک بار دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ صندل عصر کی نماز پڑھ کر جائے نماز تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ ابھی سفید دوپٹہ معصوم چہرے کے گرد بندھا ہی ہوا تھا، جیسے سارے آسمانوں کا نور اسی ایک چہرے پر اتر آیا تھا...... اسی دم باہر سے مار چیخوں پر چیخیں سنائی دینے لگیں، یوسف میاں ہر نوکر اور نوکرانی کا نام لے کر پکار رہے تھے...... بھاگتے دوڑتے بہت سارے لوگ ان کے کمرے میں پہنچے تو پتہ چلا کہ ان کی جھک جھکاتی نئی سلکن کی قمیض پر سیاہی اونڈھ گئی ہے اور وہ ایک ایک سے داغ دور کرنے کی ترکیب پوچھ رہے ہیں۔ مراد نے ان کو چونا ملنے کو کہا اور خود ہنسی روکتا باہر نکل گیا...... اس کے پیچھے باقی لوگ بھی چل دیئے...... بس وہ کھڑی رہ گئی...... جی چاہا، پوچھئے:

ایک نامراد قمیض پر ذرا سا سیاہی کا چھینٹا پڑ گیا تو اس کے داغ دھو رہے ہو نواب...... لیکن جو میری چاندنی جیسی زندگی کو داغ داغ کر دیا تو اسے کون سے چونے سے دھوؤ گے؟‘‘ لیکن وہ بولی کچھ نہیں...... یوں ہی بے چارگی کی تصویر بنی کھڑی رہی۔ اچانک یوسف میاں نے پلٹ کر دیکھا...... اللہ اللہ کس قدر رانجان نگاہیں تھیں۔ کہاں تو صندل سوچ رہی تھی کہ اسے دیکھتے ہی یوسف پاشا کو کچھ نہ کچھ تو یاد آئے گا۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے ہونٹوں کا کوئی بھولا بسرا بوسہ،

گیلے بالوں کی لو...... اور کچھ نہیں تو حیدر آبادی رنگوں والے گوٹ کا ٹوٹا ٹکڑا ہی...... لیکن انہوں نے کہا تو صرف اتنا کہا...... ’’ارے تو اری دبلی کائے وے ہوگئی......؟‘‘

اس طرح بس دو ہی سبق میں پیار ڈرامہ ختم ہو گیا اور اب تو حویلی میں دھومک دھیا تھی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ پہلے تو خود حویلی ہی اتنی بڑی زور لگا کر چیخو تو ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک آواز نہ جائے۔ اور اب تو شادی کی چیخ و پکار مچ رہی تھی۔ تنگ آ کر مما جانی نے دالان میں نوکروں کو بلانے کے لئے ایک گھنٹہ ٹنگوا دیا۔

ایسے شور شرابے میں صندل کی سسکیاں کون سنتا؟

جتنا بڑا گھرانہ تھا۔ اتنا ہی بڑا سمدھیانہ بھی ملا۔ زلیخا بیگم کے دولہا میاں کو ایک نہ دو پورے پانچ لاکھ کلدار روپے جوڑے گھوڑے کے ملنا طے پائے۔ بیٹی کا جہیز الگ رہا۔ داماد بیٹی کے لئے خوبصورت بجی سجائی کوٹی، الگ، ہیرے، زمرد، یاقوت کے کانوں، گلے اور ہاتھوں کے سیٹ الگ، سونے کا پان دان، سونے کا اگال دان، سونے کا چھپر کھٹ، سوا سو جوڑے، ہر جوڑا گوٹے ٹھپے سے لیس، مہندی کے روز ہی جہیز اور لین دین کی پوری فہرست سلامت یار جنگ نے بھجوا دی تھی۔ تا کہ اہل وہ عیال کے سامنے اعلان کر دیا جائے...... شادی کے دعوتی رقعے چھپوانے میں ایک جدت یہ برتی گئی کہ سونے کے پتروں پر حروف کھدوائے گئے تھے۔

جس دن شادی کی بارات چڑھی، حیدر آباد کی سڑکوں کا یہ عالم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ بیٹی والوں کی شان ایک طرف، دولہا والے جب نکلے تو چڑھاوے کا وہ عالم تھا کہ یہاں سے وہاں تک سوا چاندی کے تھالوں، مشتوں کے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں ’’خانگی امین‘‘ (باوردی سپاہی) ان تھالوں کی حفاظت کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ جو لاکھوں روپے کے سامان اور زیور سے بھرے ہوئے تھے۔

بارات چار مینار چوڑی چکلی سڑک سے ہوتی ہوئی جب معظم جاہی روڈ تک پہنچی تو نکاح کا وقت جو رقعوں میں پانچ بجے شام کھدوایا گیا تھا ٹل کر سات کے قریب پہنچ چکا تھا...... اور ابھی ابھی اونچی اونچی شکر میں بگھیاں، ٹانگے، ہاتھ رکشائیں اور موٹریں خراماں خراماں دولہن کو ڈیوڑھی تک پہنچے ہی جا رہی تھیں۔

نکاح میں آدھ پون گھنٹے کی دیر ہو گئی کہ مما جانی نے اس سنہری صندوقچی کا جائزہ لیا۔ جس میں دولہن کو نکاح سے پہلے چڑھایا جانے والا زیور بند تھا، کھول کر دیکھا تو یاد آیا کہ سب سے قیمتی

کوئی سوالاکھ کا جو ہیروں کا سیٹ تھا، وہ حویلی میں ایک الماری میں ہی بھول آئی ہیں۔ وہ چار آدمیوں کو دوڑا کرانہوں نے اعتادالدولہ کو اندر زنان خانے کے دروازے تک بلوایا اور گھبرا کر کہا:

''اجاڑ یا دیومٹی پڑو۔ وہ اصلی زیور تو میں حویلی میں اچ بھول آئی۔ آپ جلدی جا کر لا سو نہیں تو بڑی بھد اڑیں گی۔''

نواب صاحب نے کچھ ناک کان چڑھانے چاہے تو وہ ہولا کر بولیں۔ ''ایو آپ خودچ جا کر لاؤجی۔ اتا بھاری زیور۔ میں کسی کا بھروسہ نئیں کرسکتی۔''

ناچار نواب صاحب خور ہی موٹر پر بیٹھے، ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی چلائی۔ سجی سجائی مگر اس وقت کالی ڈھنڈار حویلی میں گھستے چلے گئے۔

جس کمرے میں دولہن کو لاکر اتارنا تھا وہ مماجانی کے کمرے سے ہی ملا ہوا تھا...... الماری کھول کر انہوں نے ہیروں کا سیٹ نکالا...... الٹے پیروں واپس ہونے ہی کو تھے کہ ہچکیاں سسکیاں سنائی دیں......

''ساری حویلی تو اٹھ کو سمدھیانے گئی ہے...... اب یہاں کون رونے بیٹھا ہے...... انہوں نے منہ ہی منہ میں کہا اور کمرے میں جھانکا۔''

زرتار پھولوں سے لدی مسہری کے ایک کونے پر سرٹکائے صندل بے تابانہ رو رہی تھی۔

''صندل...... تو......؟'' نواب صاحب حیرت سے بولے کیا ہوا تجھے...... شادی میں کیوں نہیں گئی تو......؟''

صندل نے آج تک کبھی نواب صاحب کی طرف سے سر اٹھا کر دیکھنے کی جرات تک نہیں کی تھی...... لیکن آج محبت کی مار نے اسے ہر خوف اور ہر ڈر بھرے جذبے سے آزاد کردیا تھا...... وہ تڑپ کر اٹھی اور بلکتی ہوئی نواب صاحب کے سینے سے جالگی۔

''باباحضور......''

نواب صاحب کا دل دھڑک اٹھا۔

''کیا ہوا صندل...... تو اتا در کیوں رئی ہو......!'' وہ گھبرا گئے۔

''صندل جگر پھاڑ کر بولی......'' آج میرے پیٹ میں بچہ ہوتا تو بھری محفل میں بدنام کردیتی کہ دیکھو لوگوں یہی وہ آدمی ہے جس نے مجھ کنواری کو یہ پھل دیا اور آپ دولہا بن کر بیٹھا ہے...... پر میں تو وہ بدنصیب ہوں باباحضور جو لٹ کر بھی نہ لٹی......''

نواب صاحب نے رک رک کر صدمہ کے ساتھ پوچھا کیا یوسف پاشا تم کو کچھ بولے۔

''بولے......؟'' وہ روتے روتے غصہ اور طنز کے ساتھ بولی ''اس ایک بول نے میری زندگی اجاڑ کردی...... کہ میں تم سے شادی کرلیوں گا...... وہ پھر رونے لگی......'' باباحضور میں اسی ایک بول پر اپنے کو مٹا بیٹھی، لٹا بیٹھی، نئیں تو باباحضور میں عورت نہیں تھی، چٹان تھی...... ایک اچ وعدہ نے میرے کو تباہ کردیا......''

''یوسف پاشا تجھ سے وعدہ کئے تھے کہ شادی کرلیوں گا؟'' نواب صاحب انگلی اٹھا کر بولے...... ''سچ بولتی تو؟'' ......

''جی ہو باباحضور...... سچی میں جھوٹ نہیں بولتی'' وہ سسکتے ہوئے کہنے لگی...... ''اسی واسطے میں جھک بھی گئی تھی باباحضور...... نئیں تو میں اتی کچی نہیں تھی...... دولہن بننے کی چاہت میں تو اجڑ گئی...... باباحضور......''

نواب صاحب نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا......'' ایسے بدشگونی کی باتاں مت کر صندل بیٹی'' ...... بیگم صاحبہ، ...... تیرے کو یوسف پاشا کی شادی کے واسطے بھاری جوڑا نہیں سلائے؟''

''سلائے تو...... مگر میرا دل پہننے کو نئیں چاہا۔''

ایک ہاتھ میں ہیروں کا سیٹ اور دوسرے ہاتھ میں صندل کا ہاتھ تھامے نواب اعتادالدولہ گاڑی سے اترے، زنان خانے میں جا کر بیوی کو بلایا، حکم دیا:...... ''چڑھاوے کا سارا زیور، ہیروں کا سیٹ سمیت صندل کو پہنادیو۔''

یہاں سے وہاں تک ساری حویلی میں کھلبلی مچ گئی...... بیگم صاحبہ ہاں، ہاں، کرنے لگیں تو وہ چلا کر بولے...... ''جو ہم کہتے ہیں وہ کرو...... آپ کو معلوم ہم جو بہتر سمجھتے ہئیں وہ کرتے ہیں...... وہ غصہ میں سدا خود کو ''ہم'' بولنے لگتے ہیں۔

بھری محفل اور سجی مسند سے یوسف میاں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا زنانخانے میں لائے...... صندل کے چہرے سے زرتار گھونگھٹ اٹھا کر بولے:

''اس لڑکی کو پہچانتے ہو میاں؟''

یوسف میاں کچھ نہ بولے...... نواب صاحب نے کہا۔ ''گود گرم کرتے چلے جاتے، ہم کو اعتراض نہ ہوتا، مگر میاں تم شادی کا وعدہ کرے اور توڑ دیئے جو مردوں کی زبان جو ہے......'' انہوں

نے اپن زبان نکال کرانہیں دکھائی...... ''ایک بار جو کہہ دے پورا بھی کرتی ہے...... وہ نرم لہجے میں گرجے...... ''میں آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں یوسف میاں کہ آپ صندل بیگم سے خوشی خوشی شادی کریں گے اور اسے خوش بھی رکھیں گے''

''یوسف میاں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تو وہ اُسی لہجے میں کہے گئے...........''

''زلیخا بڑے باپ کی بیٹی ہے، اس کو تم نئیں بھی بیاہے تو اس کو تم سے اچھے دس بر مل جائیں گے مگر اس دل کو توڑ کر تم سکھ سے رہ سکیں گے میاں؟''

یوسف میاں نے ڈرتے سہمتے پاس کھڑی صندل کی طرف اک نگاہ کی ہی تھی کہ نواب صاحب چہرے پر گلال سا بکھر گیا۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، مردانے کی طرف جاتے ہوئے بولے:

میں دولہن کا باپ ہوں...... سوا لاکھ سے کم مہر پر یہ شادی نئیں ہونے دیوں گا...... سمجھے دولہا میاں؟''

حمیدی